چودہویں صدی ہجری کی عظیم علمی و ادبی اور دینی و روحانی شخصیت
قطب العرفا حضرت مولانا شاہ عبدالعلیم آسی غازی پوری قدس سرہٗ
کے احوال و کمالات پر اصحابِ علم و دانش کے گراں قدر مقالات کا دستاویزی مجموعہ

بوستانِ آسی

جلد اوّل

ترتیب و تدوین
ابرار رضا مصباحی

ناشر
شاہ عبدالعلیم آسی فاؤنڈیشن دہلی

بوستانِ آسی

(جلد اول)

ناشر
شاہ عبدالعلیم آسی فاؤنڈیشن، دہلی

چودہویں صدی ہجری کی عظیم علمی وادبی اوردینی وروحانی شخصیت

حضرت مولانا شاہ محمد عبدالعلیم آسی غازی پوری قدس سرہ

کے احوال وکمالات پر اصحاب علم ودانش کے گراں قدر مقالات کا دستاویزی مجموعہ

بوستانِ آسی

(جلد اول)

ترتیب وتدوین

ابرار رضا مصباحی

ناشر

شاہ عبدالعلیم آسی فاؤنڈیشن، دہلی

©جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	:	بوستانِ آسی جلد اول
ترتیب وتدوین	:	ابرار رضا مصباحی
کمپوزنگ	:	افضل حسین بستوی
صفحات	:	۳۵۲
سنہ اشاعت	:	فروری ۲۰۱۵ء
تعداد	:	۱۱۰۰
قیمت	:	150/=
تقسیم کار	:	مدنی کتاب گھر، ۵۲۳، مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی
سلسلۂ مطبوعات	:	(۵)
ناشر	:	شاہ عبدالعلیم آسی فاؤنڈیشن، دہلی

© All righits reserved to Shah Abdul Aleem Aasi Foundation,New Delhi-

Book Name	:	Bostan-e-Aasi
Edited by	:	Abrar Raza Misbahi
Pages	:	352
Publishing year	:	Feb,2015
Published by	:	Shah Abdul Aleem Aasi Foundation
		Pul Pehladpur,Near Badi Masjid (M.B Road) New Delhi 44
		aasifoundation@gmail.com
Price	:	150/=

ملنے کے پتے:

- خانقاہ رشیدیہ/کتب خانہ رشیدیہ، محلہ میر مست، جون پور، یوپی
- دارالعلوم مصطفائیہ، درگاہ شریف چمنی بازار، پورنیہ سیٹی، بہار
- دارالعلوم طیبیہ معینیہ، درگاہ شریف مخدوم شاہ طیب بنارسی منڈواڈیہ، بنارس، یوپی

انتساب

مجمع البحرین، حضرت علامہ مفتی عبید الرحمٰن رشیدی دامت برکاتہم القدسیہ
(زیب سجادہ: خانقاہِ رشیدیہ، جون پور، یوپی)

کی نذر

جو بندگان خدا کی علمی وروحانی تربیت کے ساتھ
مشائخ رشیدیہ کے علمی اثاثوں کی حفاظت واشاعت میں مصروف ہیں

ابرار رضا مصباحی

تہدیہ

به بارگاه سجادگانِ سلسلۂ رشیدیہ

- قطب الاقطاب، شمس الحق شیخ محمد رشید مصطفیٰ عثمانی شمسی جون پوری (وصال ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء)
- قطب عالم، بدر الحق شیخ محمد ارشد رشیدی عثمانی والہ جون پوری (وصال ۱۱۱۳ھ/۱۷۰۱ء)
- قطب الاولیا، قمر الحق شیخ غلام رشید رشیدی عثمانی جون پوری (وصال ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۳ء)
- نور الحق شیخ حیدر بخش رشیدی جون پوری (وصال ۱۲۱۴ھ/۱۷۹۹ء)
- قطب العالمین، قیام الحق شیخ امیر الدین رشیدی جون پوری (وصال ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ء)
- قطب الہند، ابو الخیر شیخ غلام معین الدین رشیدی جون پوری (وصال ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء)
- امام العارفین شاہ سراج الدین رشیدی جون پوری (وصال ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء)
- قطب العرفا، ظہور الحق شاہ عبد العلیم رشیدی آسی غازی پوری (وصال ۱۳۳۵ھ/۱۸۳۲ء)
- شہود الحق سید شاہ شاہد علی سبز پوش رشیدی فانی گورکھپوری (وصال ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۱ء)
- منظور الحق سید شاہ مصطفیٰ علی سبز پوش رشیدی آسی گورکھپوری (وصال ۱۳۸۷ھ/۱۹۵۸ء)

ع...... شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا

ابرار رضا مصباحی

مشمولات

● عرض ناشر	مولانا سجاد احمد رشیدی	۱۰
● ابتدائیہ	ابرار رضا مصباحی	۱۲
● تقدیم	مفتی عبید الرحمٰن رشیدی	۲۳
● آسی شناسی	مولانا محمد افروز قادری	۳۱
باب اول: تاثرات و پیغامات		۳۳
● حضرتِ آسی کے احوال و آثار پر ایک معتبر دستاویز	علامہ سید محمد مدنی اشرفی	۳۴
● بوستانِ آسی: ایک علمی و تاریخی کارنامہ	علامہ عبد الشکور عزیزی	۳۶
● بوستانِ آسی: اخلاق و معرفت کی اشاعت ہے	سید محمد اشرف قادری برکاتی	۳۷
● حضرت آسی کی شخصیت اور فکر و فن پر پہلا موسوعی کام	ڈاکٹر مفتی مکرم احمد نقش بندی	۳۸
● بوستانِ آسی کی اشاعت: ایک فرض کفایہ کی ادائیگی	مفتی عبد المنان کلیمی	۴۰
باب دوم: اعتراف عظمت		۴۳
● خود اپنے اعتراض کا جواب دو!	علامہ عبد الحلیم فرنگی محلی	۴۴
● جب مجھے ایسے شاگرد کی تلاش تھی تو کوئی ملا نہیں	مفتی محمد یوسف فرنگی محلی	۴۴

● آسی ایسے دماغ کے لوگوں میں ہیں جو طب ایجاد کریں	حکیم محمد اسحاق حاذق موہانی	۴۵
● ایسے لکھنے والے اب بھی ہندوستان میں موجود ہیں!	مرزا غالب	۴۵
● آسی کے کلام میں مجاز کے پردے میں حقیقت کا جلوہ	مولانا عبدالمجید کاتب	۴۵
● آسی غازی پوری کی غزل دیکھنے کی چیز ہے	کلیم الدین احمد	۴۶
● آسی کا دیوان، سدا بہار پھولوں کا عطر بیز گلدستہ	عارف ہسوی	۴۶
● حضرت آسی، سجادۂ شاعری کے شیخ اعظم	علامہ کیفی چریاکوٹی	۴۷
● آسی، دبستانِ ناسخ کے میر	مجنوں گورکھ پوری	۴۷
● آسی کی رباعیوں سے متاثر ہو کر رباعیاں کہی گئیں	فراق گورکھ پوری	۴۷
● آسی کا شعر، سفر میں برابر ورد زبان رہا	مولانا محمد علی جوہر	۴۸
● تصوف و تغزل سے لبریز شاعری	مولانا عبدالسلام ندوی	۴۸
● شریعت وطریقت کے رموز کا شعری ترجمہ	پروفیسر شاہ فرید الحق	۴۸
● آسی کی من موہنی شاعری	پروفیسر عنوان چشتی	۴۹
● مجازی عشق اور جمالیاتی کیفیت میں ڈوبی ہوئی شاعری	ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی	۴۹
● صوفیانہ غزل کی تاریخ میں حضرت آسی کی نمایاں خدمات	ڈاکٹر محمود الٰہی	۴۹
● آسی، ہر علم وفن سے بخوبی واقف وماہر	لالہ سری رام	۵۰
● آسی کی شاعری تعلیمی نصاب میں شامل کی جائے	نازش سکندر پوری	۵۰

باب سوم: سلسلۂ رشیدیہ اور مشائخ رشیدیہ جون پور		۵۳
● بانی سلسلۂ رشیدیہ، شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری	ڈاکٹر ارشاد احمد ساحل سہسرامی	۵۴
● حضرت قطب الاقطاب کے اوصاف وخصائل	مولانا عبدالمبین نعمانی	۸۳
● شیخ محمد رشید جون پوری کے چند تلامذہ	ڈاکٹر ارمان احمد رشیدی	۹۲
● خانقاہ رشیدیہ: تاریخ اور کارنامے	مولانا مجیب الرحمٰن علیمی	۱۰۰

● خانقاہِ رشیدیہ کی مثالی وامتیازی خصوصیات — مولانا عبدالغفار نوری — ۱۲۷
● خانقاہ رشیدیہ کی علمی وروحانی روایات — ابرار رضا مصباحی — ۱۳۶
● سجادگان خانقاہ رشیدیہ: ایک اجمالی تعارف — ابرار رضا مصباحی — ۱۴۶
● حضرت آسی کے مرشد کامل — مولانا صبغۃ اللہ رشیدی — ۱۵۸
● سلسلۂ رشیدیہ جون پور اور حضرت آسی — مفتی شہاب الدین اشرفی — ۱۷۲

باب چہارم: عہد وپس منظر — ۱۸۳
● حضرت آسی کے عہد میں ملکی ومذہبی حالات — ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی — ۱۸۴
● حضرت آسی کا وطن عزیز — مولانا عبدالغفار نوری — ۲۰۷
● حضرت آسی، تصوف اور تصوف مخالف تحریک — ڈاکٹر محمد سجاد عالم رضوی — ۲۱۴

باب پنجم: احوال وکمالات — ۲۶۳
● آئینۂ حیاتِ آسی — ابرار رضا مصباحی — ۲۶۴
● حضرت آسی کی حیات کا ایک تحقیقی مطالعہ — مولانا ذاکر حسین لطیفی — ۲۶۶
● حضرت آسی کی حیات کے چند نمایاں پہلو — ابرار رضا مصباحی — ۲۸۴
● حضرت آسی کا علمی وروحانی مقام — مولانا عارف اللہ فیضی — ۲۹۵
● حضرت آسی کا فقہی مقام — مفتی مبشر رضا مصباحی — ۳۱۰
● حضرت آسی سرچشمۂ رشد وہدایت — مولانا غلام انور قادری — ۳۱۹
● حضرت آسی: جامع اوصاف وکمالات — مولانا الیاس عالم مصباحی — ۳۳۱
● حضرت آسی، فضائل وکمالات کے آئینے میں — مفتی ریاض القادری امجدی — ۳۴۳

عرض ناشر

مجمع البحرین، پیر طریقت حضرت علامہ مفتی عبید الرحمٰن رشیدی دام ظلہ العالی [زیب سجادہ: خانقاہ رشیدیہ، جون پور شریف] کی سرپرستی و قیادت میں عارف باللہ حضرت مولانا شاہ محمد عبد العلیم آسی سکندر پوری ثم غازی پوری قدس سرہ کی صدی تقریب کے موقع پر آپ کے حالات زندگی اور آپ کی خدماتِ علمی و دینی کے ساتھ اکابر و مشائخ سلسلہ رشیدیہ کے احوال و خدمات کے منظر عام پر لانے کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، وہ اب تک جاری ہے۔

زیر نظر کتاب "بوستان آسی" [جلد اول]، حضرت آسی کے جشن صد سالہ [۱۴۳۵ھ] پر ہو چکے کاموں کا ایک علمی و تحقیقی کتابی مجموعہ ہے، جس کو عزیز محترم حضرت مولانا محمد ابرار رضا صاحب مصباحی [رکن: شاہ عبد العلیم آسی فاؤنڈیشن] نے بڑی محنت و کوشش سے عمدہ ترتیب و تزئین کے ساتھ طباعت کے مرحلے سے گزار کر اشاعت کی منزل تک پہنچایا ہے۔ یہ ایک اہم دینی کارنامہ ہے۔ اس کی انجام دہی کے لیے مولانا موصوف فاؤنڈیشن کے جملہ اراکین اور وابستگان سلسلۂ رشیدیہ کی طرف سے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

آج سے چند سال قبل ہی فاؤنڈیشن کا قیام عمل میں آیا اور اس نے اپنی مختصر مدت میں کئی اہم اور تاریخی کام انجام دیے۔ اس کے زیر اہتمام دار العلوم طیبیہ معینیہ/ خانقاہ طیبیہ معینیہ درگاہ شریف منڈواڈیہ، بنارس میں ایک تاریخ ساز سیمینار قائم ہوا جس میں مشائخ رشیدیہ، جون پور کی کئی اہم اور نایاب کتابوں کا اجرا بھی ہوا، جن میں "دینی احکام" معروف بہ "صلوٰۃ طیبی"، از مخدوم شاہ طیب بنارسی

، ''کرامات فیاضی''، از سید شاہ محمد محسن رشیدی پٹنوی، ''معمولات قطب الاقطاب''، از شاہ مفتی عبید الرحمٰن رشیدی، ''مخدوم شاہ طیب بنارسی: شخصیت اور کارے''، از مولانا ابرار رضا مصباحی شامل ہیں۔

زیرِ نظر دستاویزی مجموعہ (بوستان آسی) آسی فاؤنڈیشن کی پانچویں کڑی ہے۔ مختلف اصحاب علم وادب کی علمی وفکری تحقیقات پر مشتمل یہ کتاب حضرت آسی کے احوال وآثار پر ایک قابل قدر اور تاریخی مجموعہ ہے۔ بوستان آسی کی بقیہ جلدیں بھی یکے بعد دیگرے جلد قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی، نیز مشائخ رشیدیہ کے علمی آثار کو جدید اسلوب اور ترجمہ وتحقیق کے ساتھ منصوبے کے مطابق لائے جائیں گے۔

آسی فاؤنڈیشن، دہلی جس تیزی کے ساتھ اپنے سرپرست کی ہدایت میں اسلاف واکابر خصوصاً مشائخ رشیدیہ جون پور اور عارف باللہ حضرت مولانا شاہ محمد عبدالعلیم آسی سکندر پوری ثم غازی پوری قدس سرہ کے احوال اور ان کے علمی ودینی آثار کو منظر عام پر لانے میں کوشاں ہے، وہ اہل فکر ونظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔

شاہ عبدالعلیم آسی فاؤنڈیشن، دہلی، خانقاہ رشیدیہ، جون پور کا ایک اہم علمی وتحقیقی اور قلمی و فکری اشاعتی ادارہ ہے جس کے وسیع مقاصد ومنصوبے ہیں، جن میں بزرگان طریقت اور علمائے امت خصوصاً علما ومشائخ رشیدیہ جون پور کے احوال وآثار، افکار ونظریات اور ان کی خدمات و کارنامے کو عوام وخواص سے متعارف کرانا بھی شامل ہے۔ ساتھ ہی علم وادب، فکر ونظر اور تصوف و سلوک کی خدمت واشاعت کا ہمہ گیر پیمانے پر کام بھی فاؤنڈیشن کے مقاصد میں شامل ہے۔

قابل تعریف وتحسین ہیں آسی فاؤنڈیشن کے اراکین ومعاونین جو عملی اور فکری دونوں اعتبار سے فاؤنڈیشن کا تعاون کرتے ہیں اور اس کے مقاصد ومنصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے حفظ وامان میں رکھے اور سعادت دارین سے مالا مال فرمائے۔ اور فاؤنڈیشن کی خدمات کو قبول کرکے اس کے مقاصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔ آمین۔

محمد سجاد احمد رشیدی غفرلہ

صدر: آسی فاؤنڈیشن، نئی دہلی

۴ر فروری ۲۰۱۵ء بروز بدھ

ابتدائیہ

قطب العرفا، بحر الاسرار، عارف باللہ حضرت سیدنا شاہ عبد العلیم رشیدی آسی سکندر پوری ثم غازی پوری مختلف الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ آپ نے علم وفن، دین ومذہب، اخلاق و روحانیت، سلوک و تصوف، قوم و ملت، سماج و معاشرہ، شعر و ادب، زبان و بیان، فکر و تحقیق، تصنیف وتالیف غرض کہ ہر شعبے میں نمایاں اور قابل فخر خدمات پیش فرمائی ہیں۔

آپ کی علمی وفکری شخصیت اور دینی وروحانی عظمت ورفعت کا قائل ایک زمانہ ہے، بلکہ آپ نے عمدہ درس وتدریس کے ذریعے شاہ سراج الدین رشیدی جون پوری، مولانا عبد الاحد شمشاد لکھنوی وغیرہ جیسے باکمال اور فن شناس تلامذہ اور تربیت وروحانیت کے ذریعے سید شاہ شاہد علی سبز پوش گورکھ پوری، مولانا سید شاہ فاخر بیخود الٰہ آبادی، مولانا ولی الرحمٰن ولی پوکھریروی، مولانا شاہ سکندر علی پورنوی، مولانا شاہ تفضّل حسین پورنوی، مفتی یوسف رشیدی پورنوی، مولانا شاہ عبد اللطیف رشیدی بلیاوی (والد ماجد علامہ ارشد القادری) جیسے صاحبان فضل وکمال خلفا ومریدین پیدا کیے۔ شعر وادب میں اپنی استادانہ صلاحیت واہمیت اور فنکارانہ عظمت و حیثیت کا بھی لوہا منوایا اور علوم وفنون میں اپنے مرتبۂ کمال سے علما ومحققین کو حیرت میں ڈال دیا۔ بطور خاص صوفیانہ شاعری میں امتیازی مقام حاصل کر کے تصوف کے اسرار وغوامض کے اظہار وپیش کش میں اپنی انفرادیت اور امامت وپیشوائی ثابت فرمائی۔ معاصرین نے بھی آپ کی علمی قابلیت ولیاقت اور روحانی عظمت ورفعت کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ جیسا کہ آپ

کی کتاب حیات کے مطالعے سے انکشاف ہوتا ہے۔

حضرت آسی پر ہو چکے کاموں کی نوعیتیں

اہل علم کو اس حقیقت کا خوب احساس ہے کہ حضرت آسی غازی پوری جس عظمت اور خوبی کے مالک تھے، اس حساب سے اب تک ان کے شایان شان کام نہیں ہو سکا۔ اس کے باوجود حضرت آسی پہ اب تک جتنے بھی تحریری اور قلمی کام ہوئے اور سامنے آئے، وہ مختلف نوعیتوں کے حامل اور اپنی اپنی جگہ پہ بہت اہم ہیں۔ کچھ کام انفرادی نوعیت کا ہے تو کچھ تنظیمی اور جماعتی نوعیت کا اور کچھ تحقیقی اور جامعاتی نوعیت کا۔ کسی نے حضرت آسی کی ہمہ جہات اور ہشت پہلو شخصیت سے متاثر ہو کر آپ کی خدمات و شخصیت کے کسی خاص اور اہم پہلو کو عنوان قرار دے کر اپنی تحقیق کا موضوع بنایا یا کسی خاص موقع یا مناسبت کی وجہ سے کہیں سیمینار ہوا یا اخبارات و رسائل میں ارباب علم و قلم کے مقالے ضمیمے اور گوشے کی شکل میں شائع ہوئے۔

حضرت آسی پر ہوئے کاموں کا تفصیلی و تحقیقی جائزہ اور تبصرہ کیے بغیر صرف ان کی طرف اجمالی طور پر نشان دہی کر دیتا ہوں تا کہ قارئین بالخصوص علما و محققین کو حضرت آسی پر ہوئے کاموں کا ایک اندازہ ہو جائے، ان پر کام کرنے والوں کے لیے معاون ثابت ہو اور دوسروں کو ان پر کام کرنے کی تحریک و تشویق کا سبب بھی بنے۔

● **سمات الاخیار**، یہ مولانا حکیم عبد المجید کاتب مصطفیٰ آبادی [جو مولوی ہائی اسکول دیوریا، گورکھپور کے استاذ، قطب الہند شیخ غلام معین الدین رشیدی جون پوری، ساتویں سجادہ نشیں، خانقاہ رشیدیہ جون پور کے مرید مخلص اور حضرت آسی کے برادر طریقت اور تلمیذ رشید تھے] کی تصنیف ہے جو ۱۳۴۴ھ میں مطبع، اکلیل المطابع بہرائچ سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں کل صفحات ۲۰۸ رہیں۔ اس کی اشاعت ثانی سید شاہ محمد اصغر رشیدی سادات پوری کے اضافے اور اہتمام کے ساتھ کل ۴۳۲ رصفحات پر محیط ۱۴۱۹ھ میں کراچی، پاکستان سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں ماضی قریب کے کچھ مشائخ رشیدیہ یعنی حضرت آسی کے خلفا و مریدین وغیرہ کے مختصر احوال و آثار شامل کیے گئے ہیں۔

سمات الاخیار، آسان اور عام فہم اردو زبان میں سلسلۂ رشیدیہ کی تاریخ و خدمات اور

سجادگان و مشائخ رشیدیہ کے احوال و آثار اور عقائد و نظریات پر ایک تفصیلی اور معتبر و مستند تذکرہ ہے۔ اس میں حضرت آسی کی حیات، شخصیت، روحانیت اور شاعری پر بھی خاطر خواہ گفتگو کی گئی ہے جو حضرت آسی پر ایک اول اور مستند ماخذ ہے۔

اس کا اول تاریخی نام حضرت آسی کی حیات طیبہ ہی میں ''شجرۂ اخیار'' [۱۳۲۰ھ] رکھا گیا تھا جن کی اشاعت کسی وجہ سے ممکن نہ ہو سکی تھی۔ ۱۳۳۵ھ میں حضرت آسی کے وصال فرمانے کے بعد اس کی طباعت و اشاعت کی طرف توجہ کی گئی اور اس میں حضرت آسی کے حالات کو بھی شامل کر دیا گیا اور اس کا تاریخی نام ''سمات الاخیار'' [۱۳۴۴ھ] رکھا گیا۔ اس میں ایک مقدمہ اور تین ابواب ہیں۔

● **عظمت آسی**، یہ امیر احمد فاروقی رشیدی کا حضرت آسی پر ایک مختصر اور معلوماتی رسالہ ہے جو مکتبہ آسی، کراچی سے ۱۹۶۷ء میں شائع ہو چکا ہے، جس میں حضرت آسی کی حیات اور ان کے خاندانی حالات کو تفصیل سے قلم بند کیا ہے اور ساتھ ہی آپ کی شاعری پر بڑی جامع گفتگو کی ہے۔

● **انتخاب کلام آسی غازی پوری**، یہ ڈاکٹر شاہ طیب ابدالی [جو مگدھ یونیورسٹی، گیا، بہار کے شعبۂ اردو کے استاذ اور شہود الحق شاہ شاہد علی سبز پوش گورکھ پوری، نویں سجادہ نشیں، خانقاہ رشیدیہ جون پور کے خلیفہ شاہ ایوب ابدالی نیر اسلام پوری کے فرزند ارجمند تھے] کی تالیف و ترتیب ہے جو ۱۹۸۳ء میں اردو اکادمی لکھنؤ کی جانب سے شائع ہو چکی ہے۔ اس میں انہوں نے افادۂ عامہ کی خاطر حضرت آسی کے مجموعۂ کلام ''عین المعارف'' سے کچھ اشعار کو منتخب کیا ہے اور حضرت آسی کے حالات اور شاعرانہ کمالات و خصوصیات پر مشتمل ایک مقدمہ بھی حوالہ قلم کیا ہے۔ کتاب کل ۸۸ رصفحات پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں ایک روایت کے مطابق انہوں نے حضرت آسی پر پی ایچ ڈی اور ڈی لیٹ دونوں کی ڈگری حاصل کی ہے جو اب تک غیر مطبوعہ ہیں۔

● **حضرت آسی غازی پوری: حیات اور شاعری**، یہ ڈاکٹر کاظم ہاشمی [ڈی، اے، وی، کالج، سیوان] کی تحقیق و تصنیف ہے۔ یہ کتاب دراصل پروفیسر جمیل مظہری کی نگرانی میں حضرت آسی کی حیات اور شاعری پر ڈاکٹر کاظم ہاشمی کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر ان کو پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی ہے۔ کتاب کل ۲۰۴ رصفحات پر مشتمل ہے جو مصنف کے زیر اہتمام ۱۹۸۴ء میں ملت آرٹ پریس، سلطان گنج، پٹنہ سے شائع ہو چکی ہے۔ کتاب اپنے موضوع، مواد اور پیش کش کے اعتبار

سے بڑی اہمیت وافادیت کی حامل ہے۔ کتاب کے مطالعے سے حضرت آسی کی حیات اوران کی علمی، ادبی اور دینی کارنامے کے بہت سے اہم گوشے اور مختلف قیمتی ابواب اجاگر ہوتے ہیں۔

● **مجلّہ** [سوونیر] بیادگار حضرت آسی سکندر پوری، سیمینار اور مشاعرہ، یہ ۱۹۸۵ء میں انجمن فروغ ادب بلیا کے زیر اہتمام حضرت آسی پہ منعقدہ سیمینار اور مشاعرے کے مضامین اور اشعار اور مناقب کا ایک مختصر مجموعہ ہے جس کو انجمن نے اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شائع کیا تھا۔

● **تجلیات آسی**، یہ ڈاکٹر ڈی این چترویدی زاہد [شعبۂ ہندی: شری مرلی منوہر ٹاؤن پوسٹ گریجویٹ کالج بلیا] کی تصنیف ہے جس کو انہوں نے ۱۹۹۰ء میں آفسیٹ پریس گورکھپور سے شائع کیا ہے، کتاب کل ۲۴۰ رصفحات پر محیط ہے۔ اس میں حضرت آسی کے احوال و اثار کو اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، ساتھ ہی چترویدی صاحب حضرت آسی کے مطبوعہ اور چند غیر مطبوعہ اشعار کو بھی تلاش وجستجو کر کے ذکر کیا ہے اور بعض اشعار کی موضوعاتی اعتبار سے توضیح و تشریح بھی کی ہے۔

● **تصوف اور مشائخ خانقاہ رشیدیہ**، یہ ڈاکٹر ڈی این چترویدی زاہد بلیاوی کی خانقاہ رشیدیہ اور مشائخ رشیدیہ پر دوسری تحریر ہے جس کو انہوں نے ۱۹۹۴ء میں آفسیٹ پریس گورکھپور سے شائع کیا ہے۔ کتاب مجموعی طور پر ۲۴۰ رصفحات پر مبنی ہے۔ اس میں انہوں نے تاریخ تصوف اور خانقاہ رشیدیہ اور سجادگان و مشائخ رشیدیہ کے احوال و آثار کو مختصراً ذکر کیا ہے۔

مذکورہ دونوں کتابوں میں مصنف نے حضرت آسی کے کچھ نایاب اور غیر مطبوعہ چیزوں کو بھی تلاش وجستجو اور محنت وکاوش سے قلم بند کر دیا ہے جو کافی اہم اور لائق مطالعہ ہیں۔

● **اردو کی صوفیانہ شاعری کی روایت اور آسی غازی پوری**، ڈاکٹر محمد خالد سکندر پوری نے علی گڑھ یونیورسٹی سے ۲۰۱۰ء میں ''اردو صوفیانہ شاعری کی روایت اور آسی غازی پوری'' کے موضوع پر پروفیسر ابوالکلام قاسمی کی نگرانی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شعبۂ اردو سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے؛ لیکن یہ غیر مطبوعہ اور اشاعت کی منتظر ہے۔ اس میں انہوں نے قدیم صوفی شعرا کی شاعری سے حضرت آسی کی شاعری کا موازنہ کر کے ان کی شاعری کی خصوصیات کو بیان کیا ہے جو انتہائی اہم اور دعوت فکر ہے۔

یہ ہے حضرت آسی پر لکھی گئی تحریروں و کتابوں اور تحقیقات کا ایک اجمالی تعارف جو اگرچہ انتہائی قلیل اور معمولی ہے اور حضرت آسی کی خدمات و شخصیت جس طرح کاموں کا تقاضا کرتی ہے۔ اس طرح کا کام اب تک سامنے نہیں آیا ہے، جس کا اعتراف منصف مزاج علما و محققین اور ادبا و ناقدین کو بھی ہے۔

تاہم مذکورہ کام اپنے معیار اور مواد کے اعتبار سے کافی اہم ہے۔ یقیناً اس سے طالبین تحقیق کے لیے اپنے عزائم و مقاصد کی تکمیل کے لیے بڑے بڑی آسانی ملے گی۔ خود راقم نے بھی اپنے اس کام میں ان سے بھرپور استفادہ کیا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ''بوستان آسی'' انہی سب کی تشکیل جدید اور توسیع مزید ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

ہمیں امید ہے کہ مذکورہ کاموں کے بعد ''بوستان آسی'' (مکمل) کی اشاعت حضرت آسی پر مطلوبہ کاموں کی ضرورت کو کچھ حد تک ضرور پوری کرے گی اور ساتھ ہی علما و محققین کو حضرت آسی کی حیات مستعار اور خدمات جلیلہ کے بیش بہا علمی و دینی ابواب کو اجاگر کرنے کے لیے دعوت غور و فکر بھی دے گی۔

آسی شناسی کی تحریک جدید

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ مجمع البحرین، حضرت علامہ مفتی عبید الرحمٰن رشیدی دام ظلہ العالی (سجادہ نشیں خانقاہ رشیدیہ، جون پور)، حضرت آسی کے علوم و معارف کے سچے امین و وارث اور جانشیں ہیں۔ حضرت آسی کے افکار و نظریات اور ان کے صوفیانہ و عارفانہ اشعار کی توضیح و تشریح جس خوش اسلوبی سے پیش کرتے ہیں، وہ خاص آپ ہی کا حصہ ہے، اور اس میں آپ بلا شبہ فرید عصر ہیں۔

حضرت آسی ۱۳۳۵ھ/ ۱۹۱۷ء میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، سال گزشتہ ۱۴۳۵ھ/ ۲۰۱۴ء کو حضرت کے وصال ۱۰۰ ر سال پورے ہو گئے۔ اسے حضرت صاحب سجادہ دام ظلہ کی بصیرت کہیے کہ آپ نے حضرت آسی کی صدی تقریب [۱۴۳۵ھ] کو مختلف مقامات پر تاریخ ساز سیمیناروں، علمی نشستوں اور عظیم الشان کانفرنسوں کی شکل میں منانے کی تجویز رکھی اور اس طرح آسی شناسی کی تحریک جدید کا عالمانہ آغاز فرمایا۔ اس سیاق میں حضرت کی ترجیح یہ رہی کہ حضرت آسی کی حیات و سوانح اور کشف و کرامت سے ہٹ کر خالص ان کی علمی، فکری، دینی،

اخلاقی اور روحانی خدمات کو متعارف کرایا جائے۔

حضرت صاحب سجادہ کی اس تجویز و تحریک سے وابستگان رشیدی اور محبین آسی اس کو عملی شکل دینے کے لیے مستعد و مصروف عمل ہو گئے۔ ان کے خوابیدہ جذبات بیدار ہوئے اور ان کی حمیت و غیرت نے بھی انہیں اس کا احساس دلایا کہ اپنے دینی و روحانی پیشوا کی خدماتِ دینی و علمی کو اجاگر کیا جائے، ان کے افکار و خیالات سے عوام و خواص کو روشناس کیا جائے، ان کی علمی و روحانی برکات سے لوگوں کو فیض حاصل کرنے کا سامان فراہم کیا جائے اور ان کے احسانات و انعامات کا اعتراف کر کے اسلاف شناسی اور آسی شناسی کی تحریک کو تقویت عطا کی جائے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے حضرت آسی کے جشن صد سالہ کے موقع پر شاہ عبد العلیم آسی فاؤنڈیشن، دہلی کے زیر اہتمام خانقاہ طیبیہ معینیہ/ دار العلوم طیبیہ معینیہ منڈواڈیہ بنارس میں ۱۰ / مارچ ۲۰۱۴ء کو دن میں ”حضرت آسی غازی پوری: ایک مختلف الجہات شخصیت“ کے زیر عنوان ایک تاریخ ساز نیشنل سیمینار کا انعقاد کیا گیا اور رات میں ایک عظیم الشان عوامی اجلاس بھی قائم ہوا۔ اس کے بعد ۲۸/ ۲۹ / اپریل ۲۰۱۴ء میں حضرت آسی کے وطن مالوف سرزمین سکندر پور میں ”آل انڈیا سرکار آسی کانفرنس و مشاعرہ“ کا انعقاد کی گیا۔ پھر اس کے بعد بہار ہند کمیٹی، بائسی پورنیہ بہار کے زیر اہتمام و انتظام ایک کامیاب کانفرنس ہوئی۔ اس کے بعد ۱۷/ نومبر ۲۰۱۴ء میں انجمن فیضان رشیدی، کمرہٹی کلکتہ میں نیشنل سرکار آسی سیمینار و کانفرنس منعقد ہوئے۔

اس طرح سے حضرت صاحب سجادہ کی قیادت و سرپرستی میں ملک کے مختلف اور متعدد مقامات میں کئی اہم اور تاریخ ساز سیمینار، جلسے اور مشاعرے منعقد ہوئے جس کی خبریں اخبارات و رسائل میں نشر ہوئیں۔

یہ بات مسرت انگیز ہے کہ حضرت آسی کی علمی و اخلاقی شخصیت اور خدمات کو متعارف کرانے کا جو انتہائی کامیاب سلسلہ قطب العارفین حضرت مخدوم شاہ طیب بنارسی قدس سرہ کے جوار کرم (منڈواڈیہ، بنارس) سے شروع ہوا وہ اب تک جاری ہے۔

فیضان آسی کا نزول

حضرت آسی کا روحانی تصرف اور ان کا خصوصی فیضان ہے کہ جشن صد سالہ کے جملہ امور

بحسن وخوبی انجام پائے اور امید سے زیادہ کامیابی نصیب ہوئی، جس کا واضح ایک ثبوت بنارس کے سیمینار کے موقع پر موصولہ ۶۳ رمقالات ہیں۔ سیمینار کے بعد بھی کچھ مضامین نیز کچھ قدیم اور اہم مقالات بھی مطبوعہ شکل میں دست یاب ہوئے۔ اس طرح سے اچھے خاصے مقالات اکٹھا ہو گئے۔ تمام مقالات کو ایک ضخیم جلد میں لانے کا ارادہ تھا؛ لیکن مقالات کو جب کتابی شکل میں مرتب کیا جانے لگا تو مواد زیادہ ہو گئے اور کتاب کی ضخامت بہت زیادہ بڑھ گئی۔ جب حضرت صاحب سجادہ دام ظلہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ ''مضامین کو متعدد جلدوں میں شائع کر دیا جائے تا کہ قارئین کو مختصر ہونے کی وجہ سے مطالعہ واستفادہ کرنے میں اکتاہٹ نہ ہو ورنہ طوالت و ضخامت کی وجہ سے قارئین کو مطالعہ کرنے میں طویل وقت درکار ہوتا ہے جو آج کے حالات اور مصروفیات میں ممکن نہیں۔ اس لیے انہیں چھوٹی چھوٹی جلدوں ہی میں منظر عام پر لایا جائے۔''

لہٰذا حضرت صاحب سجادہ کے حکم کے مطابق بعض مقالات کی اشاعت ابواب کی مناسبت کے اعتبار سے پہلی جلد میں ہو رہی ہے اور باقی مضامین ومقالات ان شاء اللہ تعالیٰ یکے بعد دیگرے عنقریب اشاعت پذیر ہوں گے۔

بوستان آسی کے نام کا انتخاب

مرشد گرامی سے مجموعۂ مقالات کی ترتیب کے دوران اس کے نام کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ ''حضرت شیخ سعدی شیرازی قدس سرہ اپنی کتاب ''بوستان سعدی'' میں ناصحانہ کلمات وارشادات اور عبرت آموز واقعات و حکایات کو شعری قالب میں ڈھال کر بیان فرماتے ہیں:

تمتع ز ہر گوشۂ یافتم
ز ہر خرمنے خوشۂ یافتم

لہٰذا اس مناسبت سے حضرت آسی پر لکھے گئے ارباب علم وقلم کے مقالات ومضامین کے مجموعے کو ''بوستان آسی'' کے نام سے ہی موسوم کر دیا جائے۔''

چناں چہ فرمان مرشد کے مطابق مجموعۂ مقالات کو ''بوستان آسی'' کے دلکش اور معنی خیز نام سے موسوم کیا گیا جس کو اصحاب علم وادب نے بھی کافی سراہا اور پسند کیا۔

بوستان آسی: جلد اول

بوستان آسی کی تمام جلدوں کو ایک ساتھ منظر عام پر لانے کا ارادہ تھا؛ اس لیے ان کی اشاعت میں تھوڑی تاخیر بھی ہو رہی تھی۔ اس دوران حضرت آسی علیہ الرحمہ کا عرس پاک کا پر بہار موقع بھی قریب آ گیا۔ مرشد گرامی حضرت صاحب سجادہ کا حکم ہوا کہ "۲۲ر فروری ۲۰۱۵ء کو حضرت آسی علیہ الرحمہ کا عرس پاک ہے۔ اس موقع پر اگر بوستان آسی جلد اول کی اشاعت ہو جائے تو بہتر ہے تاکہ آپ ہی کے عرس مقدس میں آپ کی حیات و شخصیت اور فضائل و کمالات پر مشتمل مجموعۂ مقالات کی رسم اجرا عمل میں آ جائے۔ بقیہ جلدوں کی طباعت و اشاعت بھی یکے بعد دیگرے ان شاء اللہ تعالیٰ عمل میں آتی رہیں گی۔

لہٰذا پہلی جلد کی طباعت و اشاعت کے مرحلے کو جلد طے کر کے آقائے نعمت کی خدمت میں پیش کر دیا گیا تاکہ ان کے حکم کی تعمیل ہو جائے اور ساتھ ہی انہی کے توسط سے اس بندۂ سیہ کار اور عصیاں شعار کا حضرت آسی کی بارگاہ میں عقیدت و محبت کا خراج بھی پیش ہو جائے۔

بوستان آسی، جلد اول میں پانچ ابواب کو شامل کیا گیا ہے، باب اول میں دور حاضر کے ممتاز اور مشاہیر ارباب علم و ادب کے گراں قدر تاثرات اور پیغامات ہیں۔ دوسرے باب میں حضرت آسی کے معاصر علما و فضلا اور شعرا و ادبا نیز ماضی قریب کے کچھ نامور علما و ادبا اور نقاد و محققین کی مختلف قدیم و جدید مطبوعہ تحریروں کے اہم اقتباسات کو شامل کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں خانقاہ رشیدیہ جون پور کی تاریخ، خدمات، مشائخ اور اس کے سجادگان کے احوال و کمالات اجمال و تفصیل کے ساتھ شامل ہیں۔ چوتھے باب میں حضرت آسی کے عہد میں ملکی و سیاسی، سماجی و مذہبی اور اخلاقی و روحانی حالات کے بارے میں جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے اور پانچویں باب میں حضرت آسی کے احوال و آثار اور فضائل و کمالات کا خاصہ تذکرہ ہے۔

واضح رہے کہ وستان آسی ، در اصل منڈواڈیہ بنارس کے نیشنل سیمینار کے مقالات کا مجموعہ ہے، ساتھ ہی کمرہٹی کلکتہ کے نیشنل سیمینار کے بھی چند مقالے شامل ہیں اور بقیہ دیگر کتابوں اور رسالوں سے ماخوذ و مستفاد ہیں جن کو ابواب کی مناسبت نیز اہم اور معلوماتی ہونے کی وجہ سے شامل کتاب کر دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں

گرامی منزلت حضرت سید شاہ محمد منظر سادات پوری صاحب مدظلہ کے توسط سے حاصل شدہ کراچی، پاکستان کے اخبارات ورسائل میں مطبوعہ مضامین بھی شامل کتاب ہیں۔ موصوف کی اس علمی معاونت پر راقم بے پناہ شکر گذار ہے۔

بوستان آسی کی خصوصیات

اس امر کے اظہار کرنے میں مطلق تامل نہیں کہ ''بوستان آسی'' کی شکل حضرت آسی پر پہلی بار مستقل، پایہ دار اور باضابطہ طور پر اتنی بڑی نوعیت کا کام ہوا ہے جس میں تقریباً ان کی شخصیت اور خدمات کے تمام گوشوں اور پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

● حضرت آسی کی سیرت و شخصیت اور عظمت و رفعت پہ بکھرے ہوئے کچھ قیمتی اور قابل قدر اوراق منتشرہ کو حتی الامکان یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ یہ اہم سرمایہ ضائع ہونے سے بچ جائیں اور ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو کر ایک اہم دستاویز کی حیثیت اختیار کرلیں اور آنے والی نسلوں کے لیے کچھ حد تک حضرت آسی کے فکروفن اور اخلاق و تصوف اور خدمات و کارنامے تک رسائی کے لیے رہنما و معاون ثابت بھی بنیں۔

● عہد قدیم کے ساتھ ساتھ کچھ عہد حاضر کے بھی مشاہیر کی قیمتی تحریریں اور ان کے گراں قدر تاثرات شامل ہیں۔

● کتاب کو آسان زبان اور سادہ اسلوب میں رکھنے کی بھر پور کوشش کی گئی ہے۔

● خالص علمی اور تحقیقی نوعیت کی حامل بنانے کی طرف توجہ دی گئی ہے اور غیر جانب دارانہ اور انصاف پسندانہ طریقے کو اختیار کیا گیا ہے۔

● تکرار مقالات کی وجہ سے بعض مقالات کو شائع نہیں کیا گیا بلکہ ان مقالوں کو بھی معذرت کے ساتھ اشاعت و طباعت سے روک دیا گیا جو محض کتابوں یا مقالوں سے منقول ہیں یا پھر جن میں انتہائی غیر معیاری زبان و بیان ہیں یا پھر غیر ضروری باتوں کی طومار۔

علمی و تحقیقی مقالہ لکھنے کے بھی کچھ اصول اور تقاضے ہوتے ہیں جن کو بہر حال پورا کرنا چاہیے۔ ورنہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ مقررہ اور متعینہ موضوع پہ لکھنے سے پہلے مقالہ نگار عام طور پر اپنے قلم کی روشنائی اور ذہن وفکر کی توانائی شخصیت نگاری میں سب سے پہلے حیات یعنی پیدائش و

ولادت، تعلیم وتربیت، خاندانی حالات وغیرہ کے ذکر میں صرف کردیتے ہیں اور پھر اپنے موضوع پہ آتے آتے ان کی ذہنی وفکری قوت جواب دے چکی ہوتی ہے، اس طرح سے انہیں اپنے اصل موضوع پر گفتگو کرنے کا موقع ہی میسر نہیں آتا اور موضوع جوں کا توں رہ جاتا ہے۔ اس قسم کے بعض مقالات کو ایڈٹ کر کے شامل کیا گیا ہے۔

واضح رہے کہ بوستان آسی کے بعض مقالے علمی وتحقیقی نوعیت کے ہیں اور بعض محض ادبی اور لسانی نوعیت کے اور بعض عام فہم اور سادہ زبان میں سیرت وشخصیت سے متعلق قلم کاروں میں مختلف دینی اداروں اور عصری دانش گاہوں کے اہل علم وادب شامل ہیں۔

اخیر میں یہ عرض ہے کہ کتاب کو حتی الوسع معیاری اور علمی وتحقیقی منہاج پر قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کی وجہ سے موضوعات وعناوین میں کچھ تبدیلیاں اور ترمیمیں بھی کی گئی ہیں اور مقالے میں مناسب حذف واضافہ بھی کیا گیا ہے، اس لیے ہوسکتا ہے کہ کتاب کی ترتیب اور ایڈیٹنگ کی وجہ سے بعض اہل علم کو ناگواری ہو جس کے لیے راقم ان سے پیشگی طور پر معذرت خواہ ہے، چوں کہ جہاں بھی تصرف کیا گیا ہے وہ ہماری مجبوری تھی، جس کے بغیر ''بوستان آسی'' کا معیار باقی رہنا ممکن نہ تھا۔

سپاس وشکریہ

میں سب سے پہلے آقائے نعمت، مرشد گرامی، مجمع البحرین حضرت علامہ مفتی شاہ عبید الرحمٰن رشیدی دام ظلہ العالی (زیب سجادہ خانقاہ رشیدیہ جون پور، یوپی) کا سراپا سپاس ہوں جن کی غایت شفقت ومحبت اور کمال توجہ وعنایت سے بوستان آسی کی ترتیب وتدوین عمل میں آئی اور پھر یہ اشاعت سے ہم کنار ہوئی بلکہ اس حقیر کاوش کی تمام تر کامیابیوں کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ اگر ان کی عنایت وتوجہ نہ ہوتی تو یہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچتا۔ ساتھ ہی آپ نے حقیر پر تقصیر کی خواہش وطلب پر ایک انتہائی علمی اور تحقیقی اور بصیرت افروز مقدمہ بھی عطا فرمایا اور اپنی بندہ پروری کا ثبوت فراہم کیا۔ اللھم لا تحرمنا عن فیوضہ و برکاتہ.

اس کے بعد میں حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی کچھوچھوی، حضرت علامہ عبدالشکور عزیزی، حضرت سید محمد اشرف قادری برکاتی مارہروی، حضرت ڈاکٹر مفتی مکرم احمد نقش بندی، حضرت مفتی عبد

المنان کلیمی دام ظلہم جیسے اکابر علماو مشائخ اور دانشوران و مفکرین کا حد درجہ ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھ بندۂ عاجز و قاصر کی ہمت و حوصلہ افزائی اور اپنی اصاغر نوازی کا ثبوت دیتے ہوئے بڑے قیمتی اور گراں قدر تاثرات و پیغامات سے نوازا۔

میں اپنے ان تمام کرم فرماؤں، محسنوں، مخلصوں اور معاونوں کا صمیم قلب سے شکر گزار ہوں جنہوں نے بوستان آسی کی ترتیب، تبویب، تزئین اور تصحیح میں میرا تعاون کر کے کتاب کی طباعت واشاعت کے مرحلے کو آسان کر دیا اور اہم مشوروں سے نوازا۔ جن میں برادر مکرم، مخلص گرامی مولانا ذیشان احمد مصباحی (ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)، مولانا ارشاد عالم نعمانی (ریسرچ اسکالر: جامعہ ہمدرد نئی دہلی) و مفتی مبشر رضا مصباحی (صدر و شیخ الحدیث: دار العلوم شیخ احمد کھٹو، احمد آباد، گجرات) خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر نے جس طرح مخلصانہ تعاون کا مظاہرہ کرتے ہوئے کتاب پر اصلاحی نظر ڈالی نیز اہم مشوروں سے نوازا ہے، اس کے لیے راقم ان کا حد درجہ ممنون ہے۔ ساتھ ہی آسی فاؤنڈیشن کے تمام اراکین اور معاونین کا بھی شکر گزار ہوں جن کی مخلصانہ کوششوں اور سرگرمیوں سے کتاب قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کا بہترین صلہ اور جزا عطا فرمائے۔

گزارش

کتاب کی ترتیب و پیش کش یا مضامین میں کہیں کوئی کمی یا خامی نظر آئے تو ضرور مطلع کریں کہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح کی کوشش کی جائے گی۔

ابرار رضا مصباحی
رکن: آسی فاؤنڈیشن، نئی دہلی
۲۵ر جنوری ۲۰۱۵ء بروز سنیچر

تقدیم

مفتی عبید الرحمٰن رشیدی ☆

گلہائے رنگارنگ سے آراستہ یہ "بوستان آسی" قارئین کو دعوت نظر و مطالعہ دینے جارہی ہے، جس کی تزئین و تدوین میں عزیز گرامی قدر مولوی ابرار رضا سلمہ کی محنتوں اور کاوشوں کا کافی دخل ہے، رب کریم موصوف کو اجر عظیم عطا فرمائے، آمین۔ اس کے لیے ان کو جس قدر بھی مبارک باد دی جائے کم ہے، اور ساتھ ہی ساتھ مقالہ نگار حضرات بھی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے حضرت آسی جیسے عظیم بزرگ اور عارف باللہ پر اپنے گراں قدر مقالے پیش کر کے فیضان آسی سے اپنے کو مالا مال کیا اور وہ حضرات بھی قابل قدر ہیں جنھوں نے اپنے تاثرات پیش فرمائے۔ آسی فاؤنڈیشن کی جانب سے "بوستان آسی" کی یہ پہلی جلد ہے جو منظر عام پر لائی جارہی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ بقیہ جلدیں یکے بعد دیگرے منظر عام پر لائی جائیں گی۔

وہ حضرات جو تصوف کی اصطلاحات اور اہل صفا کے نظریات سے بخوبی واقف نہیں ہیں، وہ ان کے کلام کے منشا و مراد کو سمجھ نہیں پاتے اور طرح طرح کے اعتراضات اور نازیبا الفاظ سے انہیں متہم کرتے ہیں۔ حضرت آسی کا یہ شعر

جب بڑھایا دست بیعت شیخ نے
پھر گئی آنکھوں میں شکل اللہ کی

☆ سجادہ نشیں، خانقاہ رشیدیہ، جون پور، یوپی

جس میں اللہ کے لیے ''شکل'' کا لفظ بولا گیا ہے، اس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ شکل کے لیے جسم و جسمانیات کا ہونا لازم ہے اور اللہ جل شانہٗ اس سے پاک ہے، پھر اس کے لیے شکل کا اطلاق کیوں کر درست ہو سکتا ہے، جب کہ اصطلاح صوفیہ میں شکل کے یہ معنی نہیں ہیں جو متعارف ہیں بلکہ ان کی اصطلاح میں شکل کے معنی جلوۂ حق کے ہیں جیسا کہ ''شرح مغلقات دیوان حافظ میں'' ہے۔ اب اس معنی کر یہ شعر بے غبار اور اعتراض مذکورہ سے بالکل پاک ہے۔

اسی طرح ''بت'' کے معنی صوفیہ کے نزدیک وہ نہیں جو متعارف ہیں بلکہ اس کے معنی حق یا مظہر حق کے ہیں اور بت پرستی کے معنی حق پرستی کے۔ حضرت امیر خسرو کا یہ شعر؂

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آرے آرے می کنم باخلق مارا کار نیست

یعنی لوگ کہتے ہیں کہ خسرو بت پرستی کرتا ہے، تو ہاں ہاں! میں بت پرستی کرتا ہوں اور لوگوں کی بات کی مجھے کوئی پروا نہیں، اسی معنی میں ہے کہ وہ بت پرستی سے مراد حق پرستی لیتے ہیں۔

کشف اللغات میں ہے:

''در اصطلاح سالکاں بت عبارت از مظہر ہستی مطلق است کہ آں حق است، پس بت من حیث الحقیقۃ حق باشد باطل و عبث نیست و بت پرست راحق پرست گویند [جلد ۱، ص: ۱۳۳]

شرح مغلقات دیوان حافظ میں کسی بزرگ کا یہ شعر ہے:۔

اگر کافر زبت آگاہ گشتے
چرا در دین خود گمراہ گشتے
مسلماں گر بدانستے کہ بت چیست
بدانستے کہ دیں در بت پرستی است

جس کی تشریح کرتے ہوئے صاحب شرح فرماتے ہیں:

''معنی آن است کہ اگر کافر از بت آگاہ گشتے کہ حقیقت ایں بت چیست و قیام او کیست لا بد دانستے کہ حقیقتش وجود مطلق است و قیاس بدو بلکہ ہموں مطلق است کہ مقید شدہ چہ وجود مقید بے مطلق صورت نہ بند دو نمود مطلق بے مقید نہ شود اگر چنیں دانستے در دین گمراہ نہ گشتے وایں جا

نکتہ ایست باید دانست کہ چناں چہ کافر کہ گمراہ و جانش از یں معنی بے آگاہ است مسلمان مجازی نیز باو دریں صورت ہمراہ است چناں چہ بیت ثانی بداں مقر و گواہ است کہ گفتہ ''مسلمان گر بدانستے کہ بت چیست'' پس تا آں کہ نداند محجوب است وقتے کہ داند کہ آں کیست یقین بداند کہ دین در بت پرستی است کہ بعد شناخت در ہر مقید مطلق رامی پرستد واز مقید بہ مطلق راہ می بردو باسلام حقیقی برسد وہر کہ بمقید از مطلق باز ماند حقیقت کفر برو مستولی شد'' [مرجع سابق، ص:۱۳۰]

اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ بت کا جو وجود ہے وہ وجود مطلق ہے (نظریۂ وحدۃ الوجود کے اعتبار سے) اور اس کی حقیقت بھی وجود مطلق ہی ہے۔ بت کا علیحدہ کوئی وجود و حقیقت نہیں۔ لہٰذا کافر اگر اس راز سے واقف ہوتا تو وہ گمراہ نہ ہوتا اور اس کا دین و مذہب غلط نہ ہوتا مگر اس نے اس راز کو سمجھا ہی نہیں، اس نے تو بت کے وجود کو وجود مطلق سے الگ سمجھا اور اس کی حقیقت کو بھی۔ اس لیے وہ گمراہ اور مشرک ٹھہرا۔ اسی طرح مسلمان بھی اگر اس راز سے واقف ہوتا کہ بت کی حقیقت اور اس کا وجود کیا ہے تو اس کی بھی سمجھ میں یہ بات آجاتی کہ بت کا الگ سے کوئی وجود و حقیقت نہیں۔ اس کا جو وجود و حقیقت ہے وجود مطلق ہے اور اس لحاظ سے وہ اسلام مجازی سے اسلام حقیقی میں آجاتا۔ حضرت آسیؔ بھی تصوف میں نظریۂ وحدت الوجود پر گامزن ہیں اور اسی نظریے کے تحت جا بجا ان کا کلام ہے اور وہ حقیقت کو مجاز کے پردے میں بیان کر کے حسن کلام کو دوبالا کر جاتے ہیں، چناں چہ فرماتے بھی ہیں:

اگر بیان حقیقت نہ ہو مجاز کے ساتھ
تو شعر لغو ہے آسیؔ کلام ناکارہ

اہل تصوف کے نزدیک بت خانہ سے مراد عارف کامل کا باطن ہے جس کا رتبہ کعبہ سے بھی بلند ہے۔ اسی کے پیش نظر حضرت آسیؔ فرماتے ہیں:

بت پندار جو اس میں سے جدا ہوتا ہے
یہی دل رتبے میں کعبہ سے سوا ہوتا ہے

کعبہ اس لیے مسجود خلائق ہے کہ وہ رب تبارک وتعالیٰ کی جلوہ گاہ خاص ہے اور قلوب عرفا چوں کہ ا[illegible] سے بھی بڑھ کر ہیں، اسی لیے صوفیہ کے نزدیک یہ قلوب بڑی اہمیت رکھتے ہیں،

جن کو یہ حضرات اپنی اصطلاح میں ''بت خانہ'' سے تعبیر کرتے ہیں، حضرت آسی ایسے ہی قلب کی آرزو کچھ اس طرح کرتے نظر آتے ہیں:

سوگند بے دلوں کی تجھے اے خدائے دل
دینا ہو کچھ مجھے تو نہ دینا سوائے دل

ایسے ہی قلوب کو سجدہ کرنے کی خواہش کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

جا کے بت خانے میں کس طرح نہ سجدہ کرتے
بت میں جب تو نظر آیا تو بتا کیا کرتے

اور ایک جگہ فرماتے ہیں:

اتنے بت خانوں میں سجدے ایک کعبے کے عوض
کفر تو اسلام سے بڑھ کر تیرا گرویدہ ہے

جس کفر کو وہ اسلام سے زیادہ گرویدہ مانتے ہیں، اس کے معنی ہیں کثرت کو وحدت میں گم کردینے کے۔ کشف اللغات میں ہے:

''کفر در اصطلاح متصوفاں پوشیدن ومستور گردانیدن کثرت در وحدت کہ تعینات وکثرات موجود است در بحر احدیت فانی سازد بلکہ ہستی وتعین خود را ذات الٰہی محو سازد وبہ لقائے حق سبحانہ باقی گشتہ ہمیں وحدت شود'' [ج:۳،ص:۱۶۴]

ظاہر ہے اس کفر میں حق کی گرویدگی بہ نسبت اسلام ظاہری کے زیادہ ہے اور جہاں تک سجدہ کرنے کی بات ہے تو یہ بمعنی متعارف نہیں بلکہ دل کا سجدہ ہے، اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی فرماتے ہیں:

اے شوق دل یہ سجدہ گر ان کو روا نہیں
اچھا وہ سجدہ کیجے کہ سر کو خبر نہ ہو

الغرض یہ حضرات صوفیہ کرام اپنے نظریات وخیالات کو جن الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں، وہ عموماً معنی متعارف میں نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنی خاص اصطلاح میں بولتے ہیں۔ لہٰذا جو حضرات ان کی خاص اصطلاح سے واقف نہیں ہوتے وہ ان کے الفاظ مصطلحہ کو متعارف معنی پر محمول کر کے کچھ کا کچھ سمجھ بیٹھتے ہیں اور معترض ہو جاتے ہیں۔

حضرات صوفیۂ کرام کے نزدیک سالکین راہ معرفت کے مختلف احوال ومراتب ہوا کرتے

ہیں۔ کبھی مقام فرق میں ہوتے ہیں اور کبھی مقام جمع میں اور کبھی جمع الجمع میں۔ لہٰذا ان کے کلام کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان تینوں مراتب کا خیال رکھا جائے۔

حضرت سعدی شیرازی نے ''گلستاں'' میں حکایت ذکر فرمائی ہے کہ:

ایک بزرگ تھے کہ بغیر کشتی کے وہ دریا پار ہو گئے تھے اور ایک دفعہ ایک حوض میں پھسل کر گرے تو ڈوب کر مرنے لگے۔ خیر کسی طرح جب وہ حوض سے باہر ہوئے تو کسی نے پوچھا کہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ آپ بغیر کشتی کے تو دریا پار ہو جاتے ہیں اور ایک چھوٹے سے حوض میں ڈوب کر مرنے بھی لگتے ہیں تو اس بزرگ نے جواب دیا کہ احوال ہمیشہ ایک جیسے نہیں ہوتے، کبھی تو عرش اعظم کو دیکھتا ہوں اور کبھی پشت پا کو بھی نہیں دیکھ پاتا: ؎

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم
گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

لہٰذا ان تینوں مقامات کے احکام ایک جیسے نہیں ہوتے، مقام فرق میں تو حسن و قبح اور ایمان و کفر کے درمیان فرق و امتیاز ضروری ہے، اگر کوئی فرق و امتیاز نہ کرے تو اس پر حکم شرعی جاری ہو جائے گا، لیکن مقام جمع میں یعنی فنافی الصفات میں جہاں حسن و قبح اور ایمان و کفر کا تفرقہ ختم ہو جاتا ہے وہاں مقام فرق کا حکم جاری نہ ہوگا۔ سالک جب اس مقام میں ہوتا ہے تو وہ تمام ذرات عالم کو آئینہ جمال مطلق کا سمجھتا ہے، وہ کسی کو برا نہیں سمجھتا۔ ان کے نزدیک ہر چیز میں حسن ہی حسن اور کمال ہی کمال ہوتا ہے۔ اُن کا کہنا ہے: ؎

ہمہ عالم چوں مظہر عشق اند
ہمہ را بر کمال می بینم

یعنی جب تمام عالم مظہر عشق ہیں تو ہم ہر ایک میں کمال ہی کمال دیکھتے ہیں۔ خالقِ کائنات کی پیدا کردہ جتنی چیزیں ہیں خواہ وہ شر ہی کیوں نہ ہوں، اس اعتبار سے کہ وہ خالق کی پیدا کردہ ہیں اور خالق اپنے تمام افعال میں حمید و محمود ہے۔ اس کے فعل تخلیق میں شر اور قبح کا پہلو ہی نہیں تو اس اعتبار سے وہ ہر چیز میں حسن ہی حسن کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایمان و کفر اور حسن و قبح کا تفرقہ نہیں ہوتا۔ حضرت میر عبدالوحد بلگرامی سبع سنابل میں فرماتے ہیں:

''قاضی عین القضاۃ قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ ارادت کی ابتدا یہ ہے کہ تو ایمان و کفر سے نہ

لڑے اور ایک مذہب کو دوسرے پر ترجیح نہ دے اور بہتر (۷۲) حلقوں (فرقوں) میں کچھ فرق نہ کرے۔ شیخ حسین معز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "من یقترف حسنة نرد لهٗ فیها حسنا" (القرآن) جب تمہیں زیادتی حسن کا کشف ہو جائے گا تو مسلمان اور کافر میں جمال محبوب کا مطالعہ کر سکے گا اور آتش پرست کا زنار خود اپنی گردن میں پڑا پائے گا اور یہ کہتا پھرے گا

اے کفر چہ چیزی کہ مغاں از تو بلافند
اسم تو پرستند و زعین تو معافند

اے کفر تو کیا ہے کہ آتش پرست تجھ پر اتراتے ہیں، تیرے نام کو پوجتے ہیں اور تیری ذات سے معافی خواہ ہیں، جب عشاق کا رنگ صبغۃ اللہ کا رنگ ہو جاتا ہے تو وہ جس رنگ میں ہو "ومن احسن من اللہ صبغة" کا جلوہ دکھاتا ہے:

شرف در عشق او گشت آں قلندر
کہ ہفتاد و دو ملت یار دارد

وہ قلندر عشق میں شرافت پا گیا جو بہتر (۷۲) حلقوں کو دوست رکھتا ہے۔

[سبع سنابل اردو مترجم، ص: ۳۳۰-۳۳۱]

حضرت آسی بھی اس مقام و مرتبہ کے اعتبار سے اپنی مثلث میں یوں مترنم ہیں:

اپنی روش ہے حسن پرستی
مذہب کیسا ملت کیسی
مومن میں ہیں نہ ہم ہندو میں

لیکن جب سالک مقام جمع الجمع میں ہوتا ہے یعنی فنافی الذات میں تو اس وقت اس کی نظر سے صفات الٰہی اوجھل ہو جاتی ہیں، حتیٰ کہ وحدت کا بھی تصور نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ وحدت بھی خدا کی صفت ہے۔ صرف ذات ہی ذات پر اس کی نظر ہوتی ہے جسے فنافی الذات کہا جاتا ہے تو اس وقت وحدت و کثرت کا تصور بھی نہیں ہوتا۔ اس مقام پر حضرت آسی یوں نغمہ سنج ہوتے ہیں:

تمہیں کثرت سے نفرت اور محو ذوق وحدت ہو
کچھ اس سے اور بڑھ جاؤ نہ وحدت ہو نہ کثرت ہو

صوفیہ کے ان مقامات و مراتب کا اگر کوئی فرق نہیں کرتا تو وہ زندیق اور بے دین

ہے۔ حضرت آسیؔ کے مقام عالی کو ہم کیا سمجھ سکتے، راقم السطور نے یہ جو کچھ بھی لکھا اپنی سمجھ سے لکھا، ممکن ہے قلم نے ٹھوکر بھی کھائی ہو جس کی ہم معذرت چاہیں گے، سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے اس جگہ ہم حضرت آسیؔ کے اس شعر: ۔

پوچھتے ہو شہ جیلاں کے فضائل آسیؔ
ہر فضیلت کے وہ جامع ہیں نبوت کے سوا

کی توضیح وتشریح بھی کر دینا مناسب سمجھتے ہیں جس پر کچھ حضرات یہ اعتراض کرتے ہیں کہ حضرت سیدنا غوث پاک تو صحابی نہ تھے تو صحابیت کی فضیلت ان میں کہاں پائی گئی، لہٰذا یہ کہنا کہ "ہر فضیلت کے وہ جامع ہیں نبوت کے سوا" کیوں کر درست ہو سکتا ہے؟

تو عرض یہ ہے کہ حضرت غوث پاک اگر چہ صحابی نہ تھے مگر صحابیت کی فضیلت انہیں حاصل تھی، صحابی ہونا اور ہے اور صحابیت کی فضیلت اور چیز ہے۔

بہجۃ الاسرار شریف میں حضرت غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ارشاد عالی مذکور ہے، وہ فرماتے ہیں:

"وكل ولي على قدم النبي وانا علىٰ قدم جدي صلى الله عليه وسلم ومارفع المصطفىٰ صلى الله عليه وسلم قدما الا وضعت انا قدمي في الموضع الذي رفع منه الا ان يكون قد مامن اقدام النبوة فانه لا سبيل ان يناله غير نبي" [ص:۲۲]

یعنی ہر ولی کسی نہ کسی قدم پر ہے اور میں اپنے جد امجد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم پر ہوں اور مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا قدم نہیں اٹھایا مگر وہاں میں نے اپنا قدم رکھا سوائے قدم نبوت کے کہ اس تک کسی غیر نبی کی پہنچ نہیں ہو سکتی۔

حضرت غوث پاک کا یہ ارشاد کیا اس بات کو نہیں واضح کرتا کہ آپ نبوت کے سوا جملہ فضائل وکمالات کے جامع ہیں۔ کسی صحابی کو غیر صحابی سے خصوصی وامتیازی فضیلت اگر حاصل ہے تو بایں معنی حاصل ہے کہ انہیں بحالت ایمان بیداری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ولقا حاصل رہی ہے اور یہ بات حضرت سیدنا غوث پاک کے لیے بھی ثابت ہے۔

اسی بہجۃ الاسرار شریف میں ہے کہ:

ایک مرتبہ حضور سیدنا غوث پاک وعظ فرما رہے تھے اور اسی مجلس میں حضرت شیخ علی بن ہیتی بھی حاضر تھے۔ اثنائے وعظ میں حضرت شیخ علی بن ہیتی کی آنکھ لگ گئی۔ ان کے خواب میں حضور آقائے دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ افروز ہوئے جس کو حضرت سیدنا غوث پاک نے مشاہدہ فرمایا اور شرف لقاوزیارت سے مشرف ہوئے، اور اپنے وعظ کو موقوف فرمادیا جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے خواب میں جلوہ افروز رہے۔ آپ نے اپنا وعظ موقوف رکھا جب حضور تشریف لے گئے تو بدستور منبر پر پہنچ کر اپنا سلسلۂ وعظ جاری فرمایا اور حاضرین سے فرمایا کہ میں نے اپنا وعظ اس لیے موقوف کیا کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو شیخ علی بن ہیتی کے خواب میں جلوہ افروز دیکھا ۔ چناں چہ جب حضرت شیخ علی بن ہیتی بیدار ہوئے تو ان سے حضرت سیدنا غوث پاک نے پوچھا کہ کیا آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تو کہا ہاں! تو حضور غوث پاک نے فرمایا کہ اسی وجہ سے میں ادباً اپنا وعظ موقوف رکھا پھر حضور غوث پاک نے شیخ علی بن ہیتی سے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو کیا وصیت فرمائی تو انہوں نے کہا کہ آپ کی صحبت بابرکت میں مستقل حاضری کی وصیت فرمائی پھر کسی نے حضرت شیخ علی بن ہیتی سے پوچھا کہ حضور سیدنا غوث پاک کے اس ارشاد مبارک کا کیا مطلب ہے کہ اسی وجہ سے میں نے ادباً اپنا وعظ موقوف رکھا تو انہوں نے یہ بتایا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خواب میں دیکھا اور ان کی زیارت کی تو حضور سیدنا غوث پاک نے بیداری میں ان کی زیارت فرمائی [ص:۲۶]

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی ''مدارج النبوۃ'' میں فرماتے ہیں:

''حضرت غوث پاک اگرچہ دراصطلاح صحابی نگویند مگر در بعضے وجوہ حکماً صحابی داشتند۔'' [ج:۱،ص:۱۳۲]

یعنی حضرت غوث پاک کو اگرچہ اصطلاحاً صحابی نہیں کہا جائے گا مگر بعض وجوہ کے پیش نظر وہ حکماً صحابی ہیں۔ لہٰذا حضرت غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فضیلت صحابیت سے متصف ہونا بھی ثابت ہوا جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، بلاشبہ

ہر فضیلت کے وہ جامع ہیں نبوت کے سوا

☆☆☆

آسی شناسی

بات اِک ہستی پائندہ کی ہے، کیا لکھوں!
اے مرے ماضیِ تابندہ تجھے کیا لکھوں!

اِذنِ حق پاؤں تو آغازِ قصیدہ میں کروں ❁ اپنے ممدوح کے اَوصافِ حمیدہ میں لکھوں
ذکر اُس کا ہے جو اِک قریۂ بلیا سے اُٹھا ❁ اچھی آغوش میں شفقت سے پلا اور بڑھا
بچپنے ہی سے ہویدا تھا ذکاوت کا اَثر ❁ ایسا لگتا تھا کہ یہ ذرّہ بنے گا کوئی مہر
دیکھ کے ورطۂ اَفکار میں ہردَم گم صم ❁ لوگ کہتے تھے کہ یہ قطرہ بنے گا قلزم
بزمِ عرفا میں اگر ہوتا ہے رحمت کا نزول ❁ پھر یہ عرفا ذرا سوچیں کہ ہیں کتنے مقبول!
اِن کے دشمن سے خدا کرتا ہے اِعلانِ جنگ ❁ کتنا بے مثل ہے ولیوں کی فضیلت کا یہ رنگ
بلکہ بن جاتا ہے اِن کے لیے خلاقِ جہاں ❁ ہاتھ بھی، پاؤں بھی، اور آنکھ بھی اور کان وزباں
مختصر یہ کہ یہ مردانِ خدا حق آگاہ ❁ ہر فضیلت کے ہی جامع ہیں نبوت کے سوا
اسی مصحف کا اب اِک زندہ صفحہ کھلتا ہے ❁ جس سے گمنام سے آسی کا پتا چلتا ہے
کون آسی؟ وہی جو طبقۂ عرفا میں ہوا ❁ آفتاب ایسا میرے خطۂ پورب سے اُگا
اس کی تابانی سے اَطراف وجوانب روشن ❁ بلکہ اَفلاک پہ مہتاب وکواکب روشن
حافظہ مبدأ فیاض نے بخشا ایسا ❁ جیسے ہی درس سنا کوئی، معاً یاد ہوا
بڑی محنت سے مکمل کیا علم اور کمال ❁ جامِ حلم اور اَدب پی کے ہوا خوب نہال
فیضِ یوسف[1] سے بہت پائی ہے اس نے تب وتاب ❁ شیخ فاروق بھی اُس در سے ہوئے ہیں سیراب
اُس کے اخلاق کو اخلاقِ پیمبر کہیے ❁ اُس کے کردار کو آئینہ شبر کہیے
ایسی بخشش کہ خزینہ کا خزینہ بٹ جائے ❁ حاتم وقت بھی دیکھے تو پسینہ آجائے
علم وعرفان کی برہان ہے دیوان اُس کا ❁ بہجت ونور کا سامان ہے دیوان اُس کا
درد کے ماروں کا درمان ہے دیوان اُس کا ❁ ہیرا ولولو ومرجان ہے دیوان اُس کا

[1] حضرت آسی غازی پوری اور مولانا فاروق عباسی چریاکوٹی دونوں جون پور میں حضرت مفتی یوسف فرنگی محلی کے خوانِ علم وفقہ کے خوشہ چین رہے ہیں۔ ۱۲ منہ

اس کا دیواں ہے کہ ہے شعر واَدب کی انجیل ۞ کھلا چیلنج زمانے کو ہے لائے تو مثیل !
نام جس طرح سے ہے 'عین معارف' اُس کا ۞ کر دیا ویسے بہت سارے ہی عارف پیدا
اُس کے اَشعارِ حکیمانہ خدا بھاتے تھے ۞ جن سے گم کردۂ رہ' راہِ خدا پاتے تھے
عارفِ حق بھی تھا، شیدائی عُرفا بھی تھا ۞ مرشد کامل و سرکردۂ علما بھی تھا
نادرِ عہد بھی اور نابغۂ دہر بھی تھا ۞ خوگر اَمن واَماں مُفتخرِ عصر بھی تھا
وہ مزکّیٰ و مجلّٰی و مصفّٰی بھی تھا ۞ پیکر خُلقِ حسیں، حامل تقویٰ بھی تھا
وہ مبلغ بھی تھا، داعی بھی، مفسر بھی تھا ۞ وہ مفکر بھی، مدرس بھی، مدبر بھی تھا
نازشِ شعر و اَدب، رونقِ محفل بھی تھا ۞ ناصر دین بھی، اور رہبر منزل بھی تھا
وہ ولی بھی تھا، ولی گر بھی تھا، معمار بھی تھا ۞ اہل سنت کا وہ اِک قافلہ سالار بھی تھا
مجمعِ علم و عمل ، منبع اَنوار تھا وہ ۞ مجلس فقہ و تصوف کا شہریار تھا وہ
فکر سے اس کی دماغوں کو معطر دیکھا ۞ فیض سے اُس کے دل وروح مطہر دیکھا
مایۂ فخر ہوا کرتی ہے ہستی ایسی ۞ زینت دہر ہوا کرتی ہے ہستی ایسی
نام ہے عبدعلیم آسیؔ قنبر اُس کا ۞ کام ہے خطۂ پورب میں منور اُس کا
شخصیات ایسی زمانے کو تو ملنے سے رہیں ۞ مائیں بھی ایسے سپوتوں کو تو جننے سے رہیں
تاہم اللہ کی مشیت سے نہیں کچھ بھی بعید ۞ قدرتیں اسکی جہاں بھر میں ہیں صد قابل دید
پیدا کر اور بھی آسیؔ کی طرح مردِ فرید ۞ تا کہ ہو پرچم دیں اور بلندی پہ مزید
میرے مولا کی جماعت پہ نگہبانی رہے ۞ فضل واِنعام وعنایت کی بھی اَرزانی رہے
تازگی زندگیِ نَو کی جو ہر سو بانٹے ۞ ذکر اُس کا بھی خدا روشن و پائندہ رکھے
پھونک سے اپنی جو روحوں کو منور کر دے ۞ تذکرہ اُس کا خداوندا تو گھر گھر کر دے
صفحۂ ہستی پہ جب تک یہ رہیں صبح وشام ۞ یا خدا 'آسی شناسی' بھی رہے زندہ مدام

جب تلک دہر میں یہ گردشِ اَیام رہے
ہم تو چاہیں گے کہ دنیا میں ترا نام رہے

نتیجہ فکر

مولانا محمد افروز قادری، دلاص یونیورسٹی، کیپ ٹاؤن، افریقہ

باب اول

تاثرات و پیغامات

حضرت آسی کے احوال و آثار پر ایک معتبر دستاویز

علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی☆

اسلاف و اخلاف کے احوال و آثار، ملفوظات و فرمودات، تعلیمات و ہدایات، وظائف و معمولات، تصنیفات و مکتوبات غرض کہ ان کی دینی و مذہبی، اخلاقی و روحانی، علمی و فکری اور ملکی و سماجی ہر زاویے سے ان کی شخصیت اور کارنامے کو محفوظ کرنا نہ صرف تاریخی تقاضا ہے بلکہ ایک دینی فریضہ اور شدید ضرورت کی تکمیل بھی۔ اِدھر کئی سالوں اور مختلف جہتوں سے اسلاف شناسی کا رجحان رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے، یہ امت مسلمہ کے لیے نہایت خوش آئند ہے۔ اگر ایسے ہی تائید غیبی اور صاحب سلسلہ کی توجہ خاص سے ہر خانوادہ سے کوئی انقلابی فرد اٹھے اور خلوص وللہیت اور عزم و حوصلے کے ساتھ سنجیدگی سے کام کرے تو میرا خیال ہے کہ دین کا بہت بڑا کام ہوگا اور ہر خانوادۂ علم و تصوف کی زریں خدمات کھل کر سامنے آجائیں گی۔

خانقاہ رشیدیہ جون پور شریف، ملک کی ایک قدیم علمی و تاریخی خانقاہ ہے، جس کے سجادگان و مشائخ نے ہر دور میں نمایاں دینی و علمی اور اخلاقی و روحانی کارنامے انجام دیے ہیں۔

قطب العرفا حضرت سیدنا شاہ عبد العلیم آسی رشیدی غازی پوری قدس سرہ، اسی باعظمت اور قدیم خانقاہ کے آٹھویں سجادہ نشیں تھے۔ علم و تصوف کی دنیا میں آپ کی شخصیت بڑی قد آور اور محترم تسلیم کی جاتی ہے۔ آپ فرزندان توحید اور عاشقان مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے

☆ جانشین حضرت محدث اعظم ہند کچھوچھہ شریف

عظیم مربی اور طالبین شریعت وطریقت کے لیے مرجع کی حیثیت رکھتے تھے۔آپ چودہویں صدی ہجری کے معروف عالم وفقیہ، عارف باللہ، سچے عاشق رسول اور ممتاز صوفی شاعر تھے۔آپ کی مشہور تصنیف ''عین المعارف'' خود آپ کی عالمانہ شوکت وتمکنت، عارفانہ عظمت و رفعت اور شاعرانہ مہارت وقدرت کا منہ بولتا ثبوت ہے، جو اہل علم وتصوف سے مخفی نہیں۔آپ کی شاعری سے خشیت الٰہی، خدمت خلق، ذوق تصوف، مہارت علم، قادر الکلامی، علمی گہرائی، وسعت مطالعہ، فنی واقفیت اور عشق مصطفیٰ ﷺ کی دولت فراواں اور سوز دروں ہویدا ہے۔

عزیزی القدر مفتی محمد مبشر رضا ازہر مصباحی سلمہ کی زبانی معلوم ہوا کہ حضرت آسی علیہ الرحمہ کے جشن صد سالہ کے موقع پر ''یک روزہ نیشنل سیمینار، منعقدہ ۱۰ ارمارچ ۲۰۱۴ء'' پر لکھے گئے ارباب علم ودانش کے گراں قدر اور بصیرت افروز مقالات ومضامین کا مجموعہ ''بوستان آسی'' کے دلکش اور معنی خیز نام سے مجمع البحرین، شیخ طریقت حضرت مفتی عبید الرحمٰن رشیدی دام ظلہ العالی (سجادہ نشین: خانقاہ عالیہ رشیدیہ، جون پور شریف) کی سرپرستی ونگرانی میں شائع ہونے جارہا ہے، جو انتہائی باعث مسرت ہے۔قابل مبارک باد ہیں عزیز گرامی مولانا ابرار رضا مصباحی زیدہ مجدہ جو خیر سے حضرت مجمع البحرین دام ظلہ العالی کے ایک مخلص مرید اور صحبت یافتہ ہیں اور شاہ عبد العلیم آسی فاؤنڈیشن کے ایک اہم قلمی رکن بھی۔شاہ عبد العلیم آسی فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ابھی حال ہی میں ان کی چند مرتب ومؤلف کردہ کتابیں نظر سے گزریں۔اب ان کی ایک اور اہم علمی وتحقیقی کاوش ''بوستان آسی'' شاہ عبد العلیم آسی فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام طباعت واشاعت کے مراحل سے جلد ہی ہم کنار ہونے جارہی ہے۔ہمیں امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ مستقبل میں بھی خانقاہ رشیدیہ جون پور کی علمی، روحانی اور تاریخی خدمات کے حوالے سے حضرت مفتی صاحب قبلہ مدظلہ العالی کی ہدایت وسرپرستی میں مولانا موصوف کی جدوجہد سے نمایاں کام انجام پائے گا۔ **اللھم زد فزد**

اصحاب علم وادب کے وقیع مقالات کا یہ ضخیم مجموعہ نہ صرف نسل نو کے لیے ایک قیمتی اثاثہ اور عظیم علمی تحفہ ثابت ہوگا بلکہ حضرت آسی کے احوال وآثار اور افکار ونظریات پر ایک معتبر دستاویز اور معلومات کا قیمتی ذخیرہ ثابت ہوگا اور تاریخ کا ایک اہم حصہ بھی۔ رب تبارک وتعالیٰ حضرت صاحب سجادہ دام ظلہ العالی، شاہ عبد العلیم آسی فاؤنڈیشن کے جملہ اراکین ومعاونین، جملہ اصحاب علم وقلم اور مرتب کتاب کو دارین کی سعادتوں سے نوازے اور بوستان آسی کو خاص وعام میں مقبول بنائے۔

بوستان آسی: ایک علمی وتاریخی کارنامہ

علامہ عبدالشکور عزیزی ☆

حضرت شاہ محمد عبدالعلیم آسی غازی پوری علیہ الرحمۃ والرضوان، چودہویں صدی ہجری کے ایک جید عالم دین، دین حق آگاہ اور خدا رسیدہ بزرگ ہونے کے ساتھ قادر الکلام نامور شاعر تھے۔ شریعت وطریقت اور تصوف وروحانیت کے جلووں سے آراستہ، آپ کے بلند پایہ اشعار آپ کی رفعت وعظمت پر بین دلیل ہیں۔ آپ جب تک بقید حیات رہے، بندگان خدا کو توحید ومعرفت کا درس دیتے رہے، عشق ومحبت اور معرفت خداوندی کی چاشنی سے آپ کا مجموعۂ کلام عین المعارف (دیوان آسی) لبریز ہے۔ آپ کی زندگی عبادت و ریاضت، اوراد و وظائف، خدمت خلق اور اصلاح امت میں بسر ہوئی۔ زبان قال اور زبان حال دونوں سے آپ نے دعوت وتبلیغ اور رشد وہدایت کا فریضہ انجام دیا۔

فرنگی محل کے مشہور ومعروف عالم دین حضرت علامہ عبدالحلیم فرنگی محلی قدس سرہ کی تعلیم وتربیت اور فیضان نظر نے سرکار آسی کو بیش قیمت جوہر بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی عالمانہ شان، عارفانہ کلام اور فقیرانہ شخصیت لوگوں کے لیے پرکشش بنی ہوئی ہے۔ غرض کہ آپ بافیض عالم وفاضل، باکمال شاعر اور بزرگ کامل تھے۔ آپ کی تابندہ حیات اور شخصیت کے زریں نقوش مشعل راہ ہیں۔ بوستان آسی کی اشاعت حضرت کی شخصیت، خدمات اور شاعری پر ایک علمی وتاریخی کارنامہ ہے۔

☆ شیخ الحدیث: جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی

بوستان آسی: اخلاق ومعرفت کی اشاعت ہے

سید محمد اشرف قادری برکاتی ☆

سجادگان خانقاہ رشیدیہ جون پور میں شاہ عبد العلیم آسی غازی پوری قدس سرہ العزیز ایک امتیازی شان رکھتے ہیں۔ تصوف کے مضامین پر قادرانہ علمی عبور اور تصوف کے عملی پہلوؤں پر عامل ہونا، دو مختلف خوبیاں ہیں جو حضرت آسی کی سیرت وشخصیت میں یکجا ہو گئی تھیں۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے دقیق مسائل کے کوہ گراں سے لے کر سلوک واحسان کے وسیع سبزہ زاروں تک کون سا ایسا مرحلہ تھا جو حضرت آسی کے قدموں کی برکت سے محروم رہا ہو۔ ان کی شعری اور علمی خدمات جلیلہ اس کے علاوہ ہیں۔ وہ اپنی حیات ہی میں فرد سے بڑھ کر شخص، شخص سے بڑھ کر شخصیت اور شخصیت سے فزوں تر ہو کر ایک ادارے کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ خانقاہ رشیدیہ کا سب سے زیادہ معروف ومقبول تعارف آج بھی ان ہی کا نام نامی اسم گرامی ہے۔ آج اس لمحۂ موجود میں جب مذہب اسلام کے نام پر حصول اقتدار کے لیے وحشیانہ جنگ وجدال کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو چکا ہے، اس بات کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ دہشت ووحشت کا سد باب کیسے ہو۔ اسلام کے واضح اور بنیادی اصول کس شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیے جائیں کہ اس کرۂ ارض پر بسنے والی مخلوق اسلام کا اصل چہرہ۔ صبیح وحسین چہرہ اپنے شعور کی آنکھ سے دیکھ سکے۔ میرا ایمان ہے کہ اسلام کا اصل چہرہ سلوک اور احسان، معرفت ومحبت، تواضع وانکسار کے آئینے ہی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ حضرت آسی قدس سرہ کی پوری زندگی اسی آئینہ برداری میں گزری ہے۔ بوستان آسی کی اشاعت اسی آئینہ بندی کی طرف ایک بڑا قدم ہے۔ خانقاہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ کی نیک خواہشات اس سعیِ مبارک کے ہم قدم ہیں۔

☆ انکم چیف کمشنر، کلکتہ/ خانقاہ برکاتیہ، مارہرہ، ضلع ایٹہ

حضرت آسی کی شخصیت اور فکر و فن پر پہلا موسوعی کام

ڈاکٹر مفتی محمد مکرم احمد نقش بندی ☆

دنیا دار العمل ہے یہاں ہمیں اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کے لیے اور نیک اعمال کو انجام دینے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ لیکن ابلیس کی فوج اور نفس امارہ ہمیں سیدھے راستے سے ہٹا کر گمراہی کی طرف لے جانے کے لیے پوری مستعدی سے ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔ ایسے میں ضرورت ہے کہ ہم سیرت طیبہ کا مطالعہ کریں، قرآن کریم کی تلاوت اور اس کے معانی کو سمجھنے کی طرف توجہ مرکوز کریں۔ عشق رسالت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا زیور بنائیں۔ تب ہی کامیابی مل سکتی ہے۔

آستانۂ رشیدی کے بزرگوں کے حالات زندگی اور کرامات و واقعات تفصیل سے متعدد کتابوں میں مذکور ہیں جنہیں پڑھ کر ایمان تازہ ہو جاتا ہے اور بزرگوں کی عظمتیں دل نشیں ہو جاتی ہیں۔ آج بھی ان کے حالات زندگی پڑھنے سے سالکان راہِ طریقت کی اصلاح کی راہیں کھلیں گی۔

حضرت شاہ محمد عبد العلیم آسی رحمۃ اللہ علیہ برگزیدہ اور مقبول اولیائے کرام میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ ایک متبحر عالم دین، عظیم عارف باللہ اور قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ کا کلام ''عین المعارف'' کے نام سے منظر عام پہ آچکا ہے۔ جس سے علما اور ادبا و شعرا سب فیض پا رہے ہیں۔

☆ سجادہ نشیں خانقاہ نقش بندیہ وشاہی امام وخطیب مسجد جامع فتح پوری دہلی

آپ خانقاہ رشیدیہ جون پور کے مشہور اور نامور بزرگ ہیں۔ آپ کی فطرت میں خدا ترسی، زہد وتقویٰ کے ساتھ ساتھ تواضع وانکساری اور عاجزی وفروتنی بدرجۂ اتم تھی۔ وہ اپنے کمالات پر نہ کبھی فخر فرماتے تھے اور نہ کبھی اپنے عقیدت مندوں میں اس کا اظہار فرماتے تھے۔ سب سے محبت سے ملتے تھے اور ان کے اخلاق وکردار کے سب گرویدہ تھے، ایثار نفس اور بذلہ سنجی وخوش طبعی میں وہ مقبول عوام وخواص تھے۔ اپنی فطری صلاحیتوں اور مطالعہ کی بدولت فن طب میں مہارت حاصل کی، ابتدا میں آپ نے ذریعۂ معاش کے طور پر طبابت کو اختیار بھی فرمایا؛ لیکن آستانۂ رشیدی کی سجادہ نشینی کے بعد قناعت وتوکل کی اعلیٰ منزلوں پر فائز ہوتے ہوئے اس پیشہ کو ترک فرمادیا۔

حضرت آسی کے عقیدت مندوں کی بڑی تعداد ہے جو ہنداور بیرون ہند میں موجود ہیں۔ آج کل اس آستانۂ عالیہ کے سجادہ نشیں، فقیہ عصر، شیخ طریقت حضرت مفتی شاہ محمد عبید الرحمٰن رشیدی صاحب قبلہ مدظلہ العالی ہیں جو جید عالم دین اور صوفی باصفا ہیں۔ آج بھی عقیدت مند کثیر تعداد میں ان سے فیض یاب ہورہے ہیں اور ان کی ذات فیوض وبرکات کا سرچشمہ ہے۔ جون پور اور بنارس شاہ طیب بنارسی کے آستانے سے ان کا فیض جاری ہے۔

اللہ کے ولی دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد اللہ کی رحمتوں کے آغوش میں آجاتے ہیں اور وہیں سے سب کو فیض پہنچاتے ہیں۔ بزرگوں کی وفات کو وصال کس لیے کہا جاتا ہے، اس کے لیے حضرت آسی کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

اب تو پھولے نہ سمائیں گے کفن میں آسی
ہے شب گور بھی اس گل کی ملاقات کی رات

قابل تبریک وتحسین ہیں عزیز محترم مولانا ابرار رضا صاحب مصباحی زید مجدہ جو حضرت صاحب سجادہ مفتی شاہ محمد عبید الرحمٰن رشیدی صاحب قبلہ مدظلہ العالی کی قیادت وسرپرستی میں اصحاب علم ودانش کے مقالات کو ایک ضخیم اور تاریخی مجموعہ ''بوستان آسی'' کی شکل میں مرتب ومدون کرکے منظر عام پر لارہے ہیں۔ مولانا موصوف کی اس علمی وقلمی کاوش کو اللہ تعالیٰ شرف قبولیت سے نوازے اور انہیں جزائے خیر سے بہرہ ور فرمائے۔

بوستان آسی کی اشاعت: ایک فرض کفایہ کی ادائیگی

مفتی عبدالمنان کلیمی ☆

حضرت سرکار آسی علیہ الرحمۃ والرضوان اپنے وقت کے جید عالم ربانی اور فاضل یزدانی ہونے کے ساتھ مرشد برحق، صوفی باصفا اور نعتیہ شاعری کے زبردست شاعر اور اپنے وقت کے جلیل القدر عارف باللہ تھے۔ حضرت سیدنا امام احمد رضا فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان کے نہایت مقتدر و مستند معاصرین میں آپ کا اسم گرامی بھی آتا ہے۔

آپ کی گراں قدر شاعری کا ہر شعر اور ہر شعر کا ہر مصرع عشق رسالت مآب ﷺ اور محبت اولیاے کرام کا جوش مارتا ہوا بحر بیکراں ہے۔ آپ نے اپنے شعر میں خشیت الٰہی، خوف آخرت، حالات قیامت، شفاعت رسول اکرم، وسیلۂ اولیاے امت اور انسانی مقصد زندگی کے بیان میں ایسے لب و لہجے اور سوز و گداز کا مظاہرہ فرمایا ہے کہ ایک مومن بھی اس کو پڑھ کر اور سن کر بے خود ہو جاتا ہے اور دریاے فکر و تصوف میں غوطہ زن ہو کر طمانیت قلبی اور سکون ذہنی محسوس کرتا ہے۔

حضرت سرکار آسی فکر و تصوف، اسلامی شعر و شاعری، بیعت و ارشاد، علم ظاہر و باطن اور تزکیۂ نفس اور صفائی قلب کی دنیا میں قد آور شخصیت کا نام ہے۔ ان کی ظاہری و باطنی خدمات

☆ مفتی شہر مرادآباد و صدر مجلس علماے ہند

عظیمہ و جلیلہ صرف سلسلۂ رشیدیہ ہی کے لیے نہیں بلکہ پوری جماعت اہل سنت کے لیے نمونۂ عمل اور مشعل راہ ہیں۔

فقیر راقم السطور نے پاکستان سے شائع شدہ دیوان آسی کا بغور مطالعہ کیا ہے اور فکر و تصوف اور عشق و محبت کے تعلق سے بہت حد تک اکتساب فیض بھی کیا ہے۔ جماعت اہل سنت کے اکابر نے آپ کی شخصیت اور خدمات خاص طور پر درون قلب سے نکلے ہوئے اشعار کو اپنی تحریر و تقریر میں موضوع سخن بنایا ہے اور جی بھر کے اس پر اظہار خیال بھی کیا ہے۔

عرصۂ دراز سے اس امر کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ کے وقت کے اس عبقری شخصیت اور ان کی فکری و عملی اور شعری کارناموں پر منظم طریقے پر کام کیا جائے۔ چناں چہ دیر آید درست آید کے تحت شیخ طریقت حضرت علامہ مفتی عبید الرحمٰن رشیدی مد ظلہ العالی جو ہماری جماعت میں بڑی جلیل القدر شخصیت کے حامل ہیں، کی ہدایت و سرپرستی میں اب فاضل گرامی، عزیز محترم حضرت مولانا ابرار رضا صاحب مصباحی زیدحبہ اور ان کے احباب و اعوان نے حضرت آسی پر باضابطہ طریقے پر ان کے شایان شان کام کرنے کا عزم مصمم کرلیا ہے بلکہ اس کو عملی جامہ پہنانے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا ہے اور عنقریب حضرت آسی کی ہمہ گیر شخصیت و خدمات پر ایک معیاری اور ضخیم کتاب شاہ عبد العلیم آسی فاؤنڈیشن، دہلی کے زیر اہتمام شائع ہونے جارہی ہے۔ میں اس معیاری کتاب کی ترتیب و پیش کش پر مولانا موصوف کو صمیم قلب سے مبارک باد پیش کرتا ہوں اور برملا محسوس کرتا ہوں کہ بلا شبہ مولانا موصوف کا یہ عظیم تحریری کارنامہ سلسلۂ عالیہ رشیدیہ جون پور پر پوری جماعت اہل سنت کے سر سے قرض کی ادائیگی کا کفارہ ثابت ہوگا۔ میری تمام تر نیک دعائیں اور تمنائیں مولانا موصوف کے ساتھ ہیں۔

☆☆☆

شاہ عبدالعلیم آسی فاؤنڈیشن: ایک تعارف

خانقاہ وسلسلۂ رشیدیہ جون پور تقریباً چار سو سالہ ایک قدیم علمی و تاریخی خانقاہ ہے، جو ہمیشہ سے علم و تصوف کی مرکز رہی ہے۔ اس سلسلے کے بانی و تاجدار، سجادگان و مرشدگان، علما و مشائخ اور خلفا نے ہر دور میں دین و مذہب کی دعوت و تبلیغ، علوم و فنون کی تصنیف و اشاعت اور طالبین شریعت و معرفت کی تعلیم و ہدایت میں زریں کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس وقت عہد حاضر کے ممتاز عالم و محقق اور نامور فقیہ و صوفی شیخ طریقت حضرت علامہ مفتی شاہ محمد عبید الرحمن رشیدی صاحب قبلہ دام ظلہ العالی سجادہ نشیں: خانقاہ عالیہ رشیدیہ جون پور شریف کی زیر تربیت و ہدایت اس سلسلے کی پانچ خانقاہیں اور درجنوں علمی و دینی ادارے مختلف مقامات پر اسلام وسنیت کی دعوت و خدمت اور علوم و فنون کی اشاعت میں مصروف ہیں۔

چناں چہ سلسلۂ رشیدیہ جون پور کی چار سو سالہ علمی و دینی خدمات کو اجاگر کرنے اور بزرگان طریقت کے فیوض و برکات کو عام کرنے کے لیے حضور صاحب سجادہ کی اجازت سے دہلی کی سرزمین پر عارف باللہ حضرت سیدنا شاہ محمد عبدالعلیم آسی رشیدی غازی پوری قدس سرہ کی ذات گرامی سے منسوب ''شاہ عبدالعلیم آسی فاؤنڈیشن'' کے نام سے ۲۰۱۲ء میں ایک اہم علمی و تحریری اور نشریاتی و اشاعتی ادارے کا قیام عمل میں آیا اور پھر ۲۱ر فروری ۲۰۱۳ میں اس کا رجسٹریشن بھی کیا۔ جس کے اغراض و مقاصد کافی اہم اور وسیع ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) خانقاہ رشیدیہ جون پور کے کتب خانہ میں موجود مختلف علوم و فنون پر مشتمل علمی و قلمی نوادرات و مخطوطات کو ترجمہ و تحقیق اور جدید ترتیب کے ساتھ شائع کرنا۔

(۲) سلسلۂ رشیدیہ سے وابستہ تمام مدارس و جامعات کی علمی و ثقافتی سرگرمیوں کا جائزہ لے کر ان کے تعلیمی منہاج کو بلند کرنا اور گاہے بگاہے ان کی تعمیر و ترقی کے لیے سہولیات فراہم کرنا

(۳) ملک و بیرون ملک کی تمام سنی خانقاہوں سے تعلقات و روابط پیدا کر کے مذہب و ملت کے درپیش مسائل و معاملات کو حل کرنے کی کوشش کرنا۔

(۴) پریشان حال مریدین کی بیماریوں اور ان کی بیٹیوں کی شادی و بیاہ میں خانقاہ کے سجادہ نشیں کی اجازت سے مالی امداد مہیا کرانا۔

(۵) مختلف مقامات میں علمی و ادبی محافل و مجالس اور بزرگان دین کے حالات و خدمات کو اجاگر کرنے کے لیے سیمینار و کانفرنس منعقد کرانا۔

باب دوم

اعتراف عظمت

حضرت آسی غازی پوری کی علمی و دینی، اخلاقی و روحانی اور شعری و ادبی شخصیت کا اعتراف صرف کسی خاص طبقے نے نہیں کیا بلکہ ہر فن اور ہر میدان کے شہسواروں نے بڑے واضح لفظوں میں آپ کو سراہا اور آپ کے حوالے سے تعریف و توصیف اور توثیق و تائید پر مشتمل باتیں کہیں۔ ذیل میں اس تعلق سے ہم چند ممتاز اور نامور علما، فضلا، ادبا، شعرا، محققین، ناقدین اور مفکرین کے اقتباسات نقل کرتے ہیں، اس سے حضرت آسی کی مقبولیت اور عظمت دونوں کا اندازہ ہوگا۔ مصباحی

خود اپنے اعتراض کا جواب دو!

علامہ عبدالحلیم فرنگی محلی

مولوی وکیل احمد صاحب سکندر پوری بھی جو حضرت (آسی) کے چچازاد بھائی تھے اور حیدر آباد دکن میں جج تھے، مولوی عبدالحلیم صاحب سے پڑھتے تھے۔ وہ جب کوئی اعتراض کیا کرتے تھے تو مولوی عبدالحلیم صاحب غور و فکر کے بعد اس کا شافی جواب دے دیتے تھے؛ مگر جب حضرت ڈوب کر کوئی اعتراض کرتے تھے تو مولوی عبدالحلیم صاحب دو دو ہفتہ غور و فکر کے بعد کوئی کمزور سا جواب دیتے تو حضرت فرماتے کہ "حضرت! آپ استاد ہیں کہیے تو مان لوں مگر میرے اعتراض کا جواب نہ ہوا، مولوی عبدالحلیم صاحب فرماتے کہ" کہتے تو صحیح ہو جواب نہیں ہوا، اب تم خود اپنے اعتراض کا جواب دو!" اس کے بعد حضرت خود اپنے اعتراض کا جواب دیتے تو مولوی عبدالحلیم صاحب خوشی سے پھولے نہ سماتے۔ (۱)

جب مجھے ایسے شاگرد کی تلاش تھی تو کوئی ملا نہیں

مفتی محمد یوسف فرنگی محلی

جب مدرسہ حنفیہ، جون پور سے مولوی عبدالحلیم صاحب لکھنؤ چلے گئے اور ان کی جگہ پر حضرت مولانا مفتی محمد یوسف صاحب تشریف لائے تو حضرت (آسی) "ہدایہ" پڑھنے کے لیے مفتی صاحب کے پاس تشریف لے گئے، مفتی صاحب نے فرمایا کہ: "فقیر کا معمول "شمس بازغہ" کے بعد "ہدایہ" پڑھانے کا ہے"، حضرت (آسی) نے فرمایا کہ میں "شمس بازغہ" پڑھ چکا ہوں"

مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مثل عامی شاگردوں کے پڑھانا چاہا، حضرت نے فرمایا کہ:

''میں تین سطروں کا مطالعہ کر کے آیا ہوں، میں نے جو باتیں ان تین سطروں میں پیدا کی ہیں، ان کو سن لیجیے'' حضرت نے تین گھنٹے تک ان تین سطروں پر تقریر کی، مفتی صاحب دم بخود سنتے رہے، جب حضرت تقریر ختم کر چکے تو مفتی صاحب نے فرمایا کہ:

''صاحبزادے! میں آپ کی ذہانت کی تعریف مولوی عبدالحلیم صاحب سے سن چکا ہوں۔ جب مجھے ایسے شاگرد کی تلاش تھی تو کوئی ملا نہیں، اب ضعیف ہو چکا ہوں، آپ کے پڑھانے کے لائق نہیں رہا اور آپ کو اس کی حاجت بھی نہیں ہے، خود کتاب دیکھ جایئے اور دوسروں کو پڑھایئے، اگر کوئی شبہ واقع ہو تو پوچھ لیجیے گا۔ (۲)

آسی ایسے دماغ کے لوگوں میں ہیں جو طب ایجاد کریں

حکیم محمد اسحاق حاذق موہانی

حکیم (محمد اسحاق حاذق موہانی) صاحب سے جب کوئی کہتا تھا کہ حضرت آسی نے نہ تو کسی سے طب پڑھی نہ کسی کے مطب میں بیٹھے اور شفا کا یہ حال ہے کہ جو مریض ان کے ہاتھ میں آیا، وہ آناً فاناً صحت یاب ہوا، تو وہ فرماتے کہ ارسطو اور بو علی سینا کو کس نے طب پڑھائی تھی؟ یہ ان دماغ کے لوگوں میں ہیں جو طب ایجاد کریں، ان کو استاد کی کیا ضرورت ہے؟ (۳)

ایسے لکھنے والے اب بھی ہندوستان میں موجود ہیں!

مرزا غالب

حضرت نے اپنی چند نکالی ہوئی غزلیں مولوی عبدالصمد صاحب کو دے دی تھیں، مولوی صاحب خود دہلی گئے تھے تو غالب سے ملے اور وہ غزلیں سنائیں۔ غالب دم بخود سنتے رہے، اس کے بعد فرمایا کہ ''اللہ اللہ! ایسے لکھنے والے اب بھی ہندوستان میں موجود ہیں! (۴)

آسی کے کلام میں مجاز کے پردے میں حقیقت کا جلوہ

مولانا عبدالمجید کاتب

حضرت مولانا کی قدر شمشاد (لکھنوی) کے دل سے پوچھنی چاہیے، یہ حضرت ہی کے فیض کا

جلوہ ہے کہ نامی اساتذہ میر، داغ، جلال کے طبقے میں آپ کا شمار کیا جاتا ہے اور قواعد کی پابندی، فن کی واقفیت اور شاگردوں کی کثرت کے لحاظ سے آپ کو ناسخ وقت کہنا بے جا نہ ہوگا، حضرت آسی کا کلام مجاز کے پردے میں حقیقت کا جلوہ دکھاتا ہے۔ تصوف میں سر سے پاؤں تک ڈوبا ہوا نظر آتا ہے، وحدت الوجود کا اہم مسئلہ ایسی صفائی اور خوبی سے اکثر جگہ حل کر دیا ہے کہ باید و شاید۔ طبیعت کی شوخی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ایک رند کا کلام ہے، لیکن تعمق نظر سے اگر دیکھیے تو ہر شعر میں ایک تہہ نکلتی ہے اور ہر مجاز میں ایک حقیقت، جیسا کہ آپ نے ایک شعر میں اشارہ بھی فرمایا ہے

اگر بیان حقیقت نہ ہو مجاز کے ساتھ
تو شعر لغو ہے آسی کلام نا کارہ (۵)

آسی غازی پوری کی غزل دیکھنے کی چیز ہے

کلیم الدین احمد

کاٹے کٹتی نہیں مجھ رند سے برسات کی رات
مئے کدہ والی جو مل جائے تو کچھ کام چلے

غالب کی غزل اس زمین میں ہے، مومن، شیفتہ اور دیگر مشاہیر کی بھی، ذوق نے بھی اپنی قائم رکھی ہے۔ آسی غازی پوری کی غزل اس زمین میں دیکھنے کی چیز ہے۔ (۶)

آسی کا دیوان، سدا بہار پھولوں کا عطر بیز گلدستہ

عارف ہسوی

حضرت آسی کے کلام میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو مذاق سلیم کسی غزل میں تلاش کرتا ہے۔ انداز بیان کی متانت و سنجیدگی، مضامین کا علو، خیالات کی بلندی، جذبات کی پاکیزگی و لطافت ان کے کلام کے مخصوص عناصر ہیں اور یہی وہ خوبیاں ہیں جو ان کے کلام کو نیرنگی و اعتبار کے بلند درجے پر پہنچا دیتی ہے۔ آسی ایک صاحب حال، صاحب دل اور صاحب نسبت بزرگ تھے۔ اس لیے فطرتاً ان کا کلام تصوف کی چاشنی سے معمور ہے، وہ کبھی تو ایسے صوفیانہ اشارات کر جاتے ہیں

جس سے کلام کی رنگینی و رعنائی حد درجہ دل پذیری کی شان اختیار کر لیتی ہے اور کبھی کسی مسئلہ تصوف پر شاعرانہ رنگ میں روشنی ڈال جاتے ہیں اور مجاز کے پردے میں رمز و حقائق کی طلسم کشائی کر جاتے ہیں، چوں کہ تصوف میں بھی حضرت آسی کا مذاق وحدت الوجود کا ہے، اس لیے خصوصیت کے ساتھ اس مسئلہ پر وہ مختلف والہانہ اور مستانہ انداز میں اپنے واردات قلب قالب شعر میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں جن کے سننے کے ساتھ ہی مذاق سلیم پہروں سر دھنتا رہتا ہے۔ (۷)

حضرت آسی، سجادۂ شاعری کے شیخ اعظم

علامہ کیفی چریاکوٹی

حضرت آسی اپنے وقت کے سجادۂ شاعری کے شیخ اعظم تھے، تصوف کی شاعری میں ان کا جو رنگ ہے، ان سے پہلے اور ان کے بعد کوئی ان کا مثل نظر نہیں آتا۔ (۸)

آسی دبستان ناسخ کے میر

مجنوں گورکھ پوری

آسی نے زبان، تشبیہات و استعارات اور دیگر رعایات وہی استعمال کیے ہیں جو روز ازل سے ہمارے اردو شعرا استعمال کرتے چلے آئے ہیں؛ لیکن انھوں نے ان روایات قدیمہ میں جو نئی جان ڈالی ہے، اس کی دوسری مثال مشکل سے ملے گی۔ جو تاثیر آسی نے اپنے کلام میں ان رسوم و تکلفات سے پیدا کی ہے وہ انتہائے خلوص و سادگی کے باوجود بھی کسی دوسرے کو مشکل ہی سے میسر ہو سکتی تھی، مجھے یہ کہنے میں مطلق تامل نہیں ہے کہ آسی دبستان ناسخ کے میر ہیں۔ (۹)

آسی کی رباعیوں سے متاثر ہو کر رباعیاں کہی گئیں

فراق گورکھ پوری

آسی غازی پوری کے کلام کے بھی ہم دونوں (فراق و مجنوں) عاشق تھے جسے لذت لے لے کر ایک دوسرے کو سناتے تھے اور جس پر دونوں مل کر تبصرے کیا کرتے تھے۔ کئی برس بعد ایسا ہوا کہ میں کان پور سناتن دھرم کالج میں پروفیسر ہو گیا اور مجنوں جواب بی اے پاس کر چکے تھے،

گورکھ پور ہی میں تھے۔ ہم دونوں کے شعور اور وجدان کے باہمی ربط کا یہ کرشمہ تھا کہ بغیر ایک دوسرے کی خبر رکھے ہوئے ہم دونوں نے پچاس رباعیاں کہہ ڈالیں اور دونوں نے ایک دوسرے کو خط لکھا کہ آسی کی رباعیوں سے متاثر ہو کر یہ رباعیاں کہی گئی ہیں، ہم دونوں اب تک اس حسن اتفاق پر حیرت کرتے ہیں۔ (۱۰)

آسی کا شعر، سفر میں برابر ورد زبان رہا

مولانا محمد علی جوہر

اس سفر (بسلسلۂ مقدمۂ کراچی) میں رات کے طول طویل گھنٹے درود و سلام کی تسبیحیں پڑھتے پڑھتے گزار دیے اور آسی غازی پوری کا یہ شعر سارے سفر میں برابر ورد زبان رہا۔

وہاں پہنچ کے یہ کہنا صبا سلام کے بعد
تمہارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد (۱۱)

تصوف و تغزل سے لبریز شاعری

مولانا عبدالسلام ندوی

اردو شاعری میں اخلاق و تصوف کا جو ذخیرہ ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں: ایک تو وہ جس میں صرف اخلاق و تصوف ہی ہے، شاعری نہیں۔ شاہ نیاز بریلوی وغیرہ کا کلام اسی قسم کا ہے۔ دوسرے یہ کہ عاشقانہ غزلوں میں جا بجا صوفیانہ اشعار بھی آجاتے ہیں۔ شعرائے دہلی کی یہی طرز ہے اور یہ طرز انہوں نے متاخرین شعرائے فارسی سے سیکھی ہے؛ لیکن آسی کے کلام کو ان سب پر فوقیت یہ ہے کہ اس میں زیادہ تر اخلاق و تصوف کا حصہ پایا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ شاعرانہ حسن ادا کا سر رشتہ بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ (۱۲)

شریعت و طریقت کے رموز کا شعری ترجمہ

پروفیسر شاہ فریدالحق

حضرت آسی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایک متبحر عالم دین، جامع شریعت و طریقت اور سلسلۂ قادریہ کے ایک بے مثل رہنما اور ہادی نیز ایک باکمال صاحب دیوان شاعر تھے، حضرت آسی

کی شاعری دراصل عقیدہ کی پختگی اور شریعت اور طریقت کے رموز اور نکات کا شعری ترجمہ ہے، حضرت فنافی الرسول اور فنافی اللہ کے درجے پہ فائز تھے۔ (۱۳)

آسی کی من موہتی شاعری

پروفیسر عنوان چشتی

آسی (غازی پوری) نے غزل کے بنیادی اسلوب اور فطری زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ اس لیے کلاسیکل ڈکشن، مانوس ماحول اور دلکش انداز بیان کی وجہ سے باطنی تجربات کی آنچ مدھم ہوگئی مگر محسوس ضرور ہوتی ہے۔ عشق کی آشفتگی اور حسن کی نغمگی ان کی غزلوں کی جان ہے اور جمالیاتی رچاؤ کی ضامن بھی۔ اس لیے آسی کی شاعری من موہتی ہے۔ (۱۴)

مجازی عشق اور جمالیاتی کیفیت میں ڈوبی ہوئی شاعری

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی

آسی غازی پوری کے یہاں تغزل کی ایسی چاشنی ہے کہ ان کا صوفیانہ کلام بھی مجازی عشق اور جمالیاتی کیفیت میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ (۱۵)

صوفیانہ غزل کی تاریخ میں حضرت آسی کی نمایاں خدمات

ڈاکٹر محمود الٰہی

حضرت آسی کا شمار ان صوفیوں اور سجادہ نشینوں میں ہوتا ہے، جنہوں نے اردو شعروادب کی گراں قدر خدمات انجام دیں، ہر چند شاعری میں ان کا سلسلہ ناسخ سے ملتا ہے؛ لیکن انہوں نے ہمیشہ شاعری کے منصب ومقصد کو پیش نظر رکھا اور شعر کو لفظی بازی گری کا نمونہ نہیں بننے دیا، تصوف نے ان کے رنگ تغزل کو پاکیزگی اور ہر دل عزیزی عطا کی، صوفیانہ غزل کی تاریخ میں حضرت آسی کی خدمات کو ہمیشہ نمایاں جگہ ملے گی۔ (۱۶)

آسی، ہر علم وفن سے بخوبی واقف و ماہر

لالہ سری رام

آپ کے کلام سے آپ کی شوخی طبع، بلند پروازی، بندش مضمون، تلاش الفاظ مانوس وموزو ں، برجستگی کلام، شستگی زبان کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے، غرض اصناف علوم پر پورے پورے قادر اور ہر علم وفن سے بخوبی واقف و ماہر ہیں۔ (۱۷)

آسی کی شاعری تعلیمی نصاب میں شامل کی جائے

نازش سکندر پوری

حضرت آسی کے کلام میں وہ تمام فنی محاسن موجود ہیں جو ایک قادر الکلام اور فصیح البیان شاعر کی تخلیقات میں ہوتے ہیں۔ زبان میں سادگی وصفائی، بیان میں سلاست وپختگی، خیالات میں بلندی وپاکیزگی اور بندشوں میں شوخی کی حد تک شگفتگی۔ ان خوبیوں کے علاوہ آپ کے کلام کی ایک اور اہم خوبی یہ ہے کہ غزلوں میں عامیانہ مذاق یکسر معدوم ہے جو اس دور کے بیشتر شعرا کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ نیز غزلوں میں بھرتی کے اشعار بالکل نہیں ہیں۔

حضرت آسی ایک زندہ دل، شگفتہ طبیعت، صوفی منش اور صاحب نسبت بزرگ تھے۔ ان کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک وجدانی کیفیت میں ڈوبنے کے بعد ہی اشعار کہتے تھے۔ اس لیے ان کا ہر شعر اپنے اندر ایک تہ دار معنی، حقائق ومعارف کی ترجمانی اور ایک دل پذیر کیفیت رکھتا ہے جس کی طرف انہوں نے یوں اشارہ کیا ہے؎

شعر گوئی نہ سمجھنا کہ میرا کام ہے یہ
قالب شعر میں آسی فقط الہام ہے یہ

حضرت آسی حقائق ومعارف کو مجاز کے پردے میں بیان کرنے کے قائل تھے۔ لہٰذا ان کے عشقیہ اشعار کو اسی نظریے سے دیکھنا اور پرکھنا چاہیے۔ چناں چہ وہ خود فرماتے ہیں؎

اگر بیان حقیقت نہ ہو مجاز کے ساتھ
تو شعر لغو ہے آسی کلام ناکارہ

کلام آسی کی خصوصیات بیان کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ لہٰذا اختصار کے پیش نظر چند مشاہیر شعرا اور ناقدین کی رائے درج کی جارہی ہیں۔ ان میں سے حضرت آسی کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مولوی عبدالصمد صاحب جب دہلی گئے تو مرزا غالب کو آسی کی چند غزلیں سنائیں، غالب سنتے رہے، اس کے بعد فرمایا: ''اللہ اللہ! ایسے لکھنے والے اب بھی ہندوستان میں موجود ہیں''

یہ حضرت آسی کے جوانی کا واقعہ ہے جب کہ غالب ضعیف ہو چکے تھے۔ عارف ہسوی جیسے عظیم مجاہد آزادی اور جلیل القدر ادیب وصحافی کا کہنا ہے:

''تصوف میں بھی حضرت آسی کا مذاق وحدت الوجود کا ہے..... مختلف والہانہ اور مستانہ انداز سے اپنے واردات قلب کو شعر میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں جس کو سنتے ہی سامع پر ایک بے خودی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور مذاق سلیم پہروں سر دھنتا ہے''

حفیظ جون پوری کی شاعرانہ عظمت کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ایسے شاعر نے مشہور ہفتہ وار اخبار ''جادو'' کے ایک ادبی ضمیمہ میں حضرت آسی کو ان الفاظ سے نوازا۔

کلام اس میں آسی کا ہوگا اگر
لگائیں گے آنکھوں سے اہل نظر

مشہور و معروف نقاد جناب مجنوں گورکھ پوری نے جو تنقید کے میدان میں پھونک پھونک کر چلنے کے عادی ہیں۔ اپنی کتاب ''غزل سرا'' میں کلام آسی پر تبصرہ کرتے ہوئے انہیں خواجہ میر درد کے بعد تصوف کا دوسرا بڑا شاعر تسلیم کیا ہے۔

اردو کا بالغ نظر اور سخن شناس طبقے نے تصوف اور تغزل کے منفرد اور صاحب طرز شاعر آسی سکندر پوری کی تہ دار شخصیت اور فن پر برائے نام روشنی ڈالی ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ اردو کا بالغ نظر اور سخن شناس طبقہ، آسی کی شاعرانہ عظمت کا معترف ہے، فراق گورکھ پوری جیسا خود پسند شاعر شعر و سخن کی ہر محفل اور اپنی ادبی تحریروں میں آسی سکندر پوری کو خراج عقیدت پیش کرتا نظر آتا ہے، ایسے باکمال شاعر کے فنی پہلوؤں پر کام ہونا چاہیے تاکہ اردو ادب کے شیدائی اردو کے ایک محسن کی قدر و قیمت جان سکیں، وزارت تعلیم سے بھی گزارش کی جاتی ہے کہ آسی جیسے قادر الکلام شاعر کی تخلیقات

جو اتقا، پاکیزگی اور پند و نصائح پر مبنی ہیں، تعلیمی نصاب میں داخل کی جائیں۔" (۱۸)

مصادر و مراجع

(۱) عین المعارف، ص:۴۱، مؤلف، سید شاہد علی سبز پوش فانی گورکھپوری،

(۲) عین المعارف ص:۶۰، مؤلف، سید شاہد علی سبز پوش فانی گورکھپوری،

(۳) عین المعارف ص:۴۷

(۴) عین المعارف ص:۵۷

(۵) سمات الاخیار ص:۱۸۸

(۶) اردو تنقید پر ایک نظر، ص:۳۶۲، کلیم الدین احمد

(۷) نگار، ۱۹۲۲ء، لکھنؤ بحوالہ سمات الاخیار، ص:۲۷۰، مولانا عبدالمجید کاتب مصطفیٰ آبادی

(۸) مقالہ شاہ عبدالعلیم آسی، ص:۳۳، نیا دور اگست ۱۹۸۴ء

(۹) نکات مجنوں، ص:۵۲

(۱۰) نقوش لاہور شخصیات نمبر ص:۲۹۶

(۱۱) قومی ڈائجسٹ لاہور (۱۹۸۸ء) ص:۱۶۱

(۱۲) آسی (تبصرہ) بحوالہ مجلہ سوویز بیادگار حضرت آسی سکندر پوری، ص:۱۸-۱۹

(۱۳) روزنامہ جنگ کراچی ۱۹۷۸ء

(۱۴) اردو صوفیانہ شاعری بحوالہ بحوالہ مجلہ سوویز بیادگار حضرت آسی سکندر پوری، ص:۱۹

(۱۵) مقدمۂ کلام آتش ص:۱۴۳

(۱۶) انتخاب کلام آسی غازی پوری، ص:۱۹۸۴ء

(۱۷) خم خانۂ جاوید ص:۶۴، ۶۵

(۱۸) سکندر پور کی ادبی تاریخ ص:۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۳، مرتب: نازش سکندر پوری

☆☆☆

باب سوم

سلسلۂ رشیدیہ اور مشائخ رشیدیہ

بانی سلسلہ رشیدیہ شیخ محمد رشید جون پوری: حیات وافکار

ڈاکٹر ارشاد احمد ساحلؔ سہسرامی

سلطان فخر الدین محمد تغلق معروف بہ جونا شاہ کی آرزو اور سلطان فیروز شاہ کی یادگار (۷۷۲ھ) جون پور کی تاریخی سرزمین ابتدا ہی سے علما اور صوفیہ کا مرکز رہی۔ فضل وکمال کے نہ جانے کتنے لعل وگوہر اس خاک سے نمودار ہوئے اور ذرے ذرے کو رشک آفتاب ومہتاب بناڈالا۔ ملک العلما قاضی شہاب الدین، قطب وقت شیخ محمد افضل، ملا محمود صاحب شمس بازغہ، مولانا الہداد شارح ہدایہ جیسے نامورانِ فضل وکمال اور حضرت خواجہ محمد عیسیٰ تاج، پیر نصیر الدین معروف بہ سون برسا شاہ، شیخ عبد القدوس قلندر، شیخ من اللہ عرف اڈھن، قطب بینائے دل قلندر، حضرت بارہ ہزاری شاہ، حضرت حمزہ چشتی قدست اسرارہم جیسے روشن ضمیر صوفیہ اسی خاک مسعود کی یادگار ہیں۔ لیکن حضرت قطب الاقطاب شیخ محمد رشید مصطفیٰ عثمانی (عرف حضرت دیوان جی) جون پوری قدس سرہ علم وفضل، فقر وتصوف کے سنگم اور سراپا محاسن وکمالات تھے۔

خاندانی حالات

حضرت قطب الاقطاب، سیدنا امیر المومنین عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسل پاک سے ہیں، اسی لیے عثمانی کہلائے جاتے ہیں، حضرت کے اجداد کی بارہویں پشت میں حضرت مخدوم شیخ بخشی رومی نے عرب کی سرزمین سے آکر روم کے ایک قصبہ ''کلد'' میں سکونت اختیار کی۔

تین پشتیں وہیں رہیں پھر حضرت مخدوم دہلی آ کر سلطان المشائخ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیا کی بیعت سے مشرف ہوئے اور حضرت کے وصال کے بعد مخدوم شیخ نصیر الدین چراغ دہلی سے باطنی نعمتوں کی تکمیل فرمائی۔ حضرت مخدوم کو سیدنا چراغ دہلی سے حد درجہ قرب حاصل تھا یہاں تک کہ حضرت چراغ دہلی نے وصال کے وقت فرمایا کہ ''جنازۂ من تا برادرم شیخ بخشی رومی برندارد از زمین برنخیزد۔''

حضرت مخدوم رومی ہی سے اس خاندان عالی میں ولایت کا سلسلہ دراز ہوتا ہے، آپ کی دسویں پشت کے بزرگ حضرت شیخ عبدالحمید عثمانی گزرے ہیں جو حضرت قطب الاقطاب کے حقیقی دادا تھے۔ حضرت شیخ عبدالحمید کے دو بیٹے تھے۔ شیخ مصطفیٰ اور شیخ عثمان۔ ان دونوں بیٹوں کے حق میں دعائے مادری زبان قدسی سے نکلی اور مقبول ہوگئی:

''مولیٰ تعالیٰ! مصطفےٰ کے گھرانے میں علم وفقر اور عثمان کے گھرانے میں تلوار جاری رہے۔''

حضرت شیخ عثمان کی نسل امیٹھی میں ہے اور حضرت شیخ مصطفیٰ جمال الحق جون پور برونہ منتقل ہوگئے اور یہیں حضرت شیخ محمد نور صدیقی کی صاحبزادی سے نسبت مسنونہ ہوئی جن سے تین صاحبزادے ہوئے: (۱) شیخ محمد سعید (۲) شیخ محمد رشید اور (۳) شیخ محمد ولید

حضرت شیخ مصطفیٰ جمال الحق نہایت بلند پایہ عارف کامل اور مرتاض بزرگ تھے۔ آپ کے تینوں صاحبزادے علم وفضل، جرأت وشجاعت، زہد وتقویٰ اور عشق وعرفان کی عظیم نعمتوں سے بہرہ ور تھے؛ لیکن منجھلے صاحبزادے حضرت قطب الاقطاب شیخ محمد رشید عرف حضرت دیوان جی عشق و عرفان کے آفتاب تھے جن کی پرنور ضیاؤں سے ایک عالم جگمگا اٹھا۔

ولادت باسعادت

ہندوستان کی سرزمین پہ اکبری سلطنت کی سطوت وشوکت حکمرانی کر رہی تھی۔ مغلیہ دور عروج وارتقا کی منزلوں سے گذر رہا تھا، اسی شاہانہ ماحول میں حضرت شیخ جمال الحق کے آنگن میں ایک ملکوتی آواز سنی گئی جس میں فقر وسلطنت کے جمالیاتی تقدس اور پرجلال وقار کا آہنگ اپنی پوری شان کے ساتھ موجود تھا۔ جون پور کے مضافاتی مقام برونہ میں ۱۰ رذی قعدہ ۱۰۰۰ھ مطابق ۱۵۹۱ء کو حضرت دیوان جی نے آنکھ کھولی اور دیکھتے دیکھتے آپ کی پاکیزہ سانسوں کی

خوشبو ایک عالم میں پھیل گئی۔ آپ کی مسعود تشریف آوری کی یہ نوید حضرت شیخ عبد العزیز جونپوری نے پہلے ہی دے دی تھی کہ:

''میرے بعد ایک فقیر پیدا ہوگا جس کا نام محمد رشید ہوگا۔'' [سمات الاخیار، ص:۳۲]

اور جب یہ سراپا بشارت آ گیا تو بصیرت افروز نگاہیں پکار اٹھیں کہ:

''یہ لڑکا اپنے وقت کا کامل فقیر اور عالم عامل ہوگا''

حضرت قطب الاقطاب کا اسم گرامی محمد رشید ہے۔ بعض تحریروں میں عبد الرشید بھی ہے، لیکن رائج وہی اول ہے۔ حضرت کی کنیت ابوالبرکات اور لقب شمس الحق ہے۔ قطب الاقطاب اور دیوان جی سے شہرت پائی۔ آپ حنفی مذہب چشتی مشرب اور عثمانی نسب رکھتے تھے۔

حضرت نے اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور عالمگیر اورنگ زیب چاروں سلاطین کے زمانے پائے۔ جب ولادت مسعود ہوئی تو اکبر تخت نشین تھا، جب چودہ سال کے ہوئے تو جہانگیر نے کاروبار سلطنت سنبھالا، جب عمر مبارک ۳۷ رسال ہوئی تو شاہ جہاں تخت شاہی پر متمکن ہوا اور جب ۶۸ رسال کو عمر اقدس پہنچی تو حضرت غازی سلطان عالمگیر اورنگ زیب کی اسلامی سلطنت کی دینی رونق دیکھ کر آپ کی نگاہیں ٹھنڈی ہوئیں اور انہیں کے سولہ سن جلوس میں ۸۳ رسال کی عمر پاکر ۱۰۸۳ھ میں آپ وصال حق سے شادکام ہوئے۔ حضرت قطب الاقطاب اکثر بڑے سرور میں فرمایا کرتے کہ ''اورنگ زیب بڑا متشرع اور اچھا بادشاہ ہے'' [مرجع سابق، ص:۱۷]

تعلیم اور فضل کمال

صاحب سمات الاخیار حضرت مولانا عبد الجید بلیاوی آپ کے تعلیمی مراحل کا تعارف پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کلام اللہ سے لے کر صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں مختلف اساتذہ سے پڑھیں جن کا ذکر خالی از طوالت نہیں مگر اور ساری کتابیں اپنے حقیقی ماموں مولانا شمس الدین اور استاذ العلما حضرت شیخ محمد افضل جون پوری قطب وقت سے تمام کیں۔ گنج ارشدی میں اس کی تفصیل یوں لکھی ہے کہ:

حضرت قطب الاقطاب جون پور میں مولانا کے مکان پر رہ کر پڑھتے تھے اور مولانا اس زمانے میں شاہزادہ پرویز کی تعلیم کے لیے الہ آباد میں رہتے تھے۔ وہاں سے جب مکان پر تشریف

لائے تو آپ سے پوچھا کہ کیا پڑھتے ہو؟ آپ نے جواب دیا کافیہ۔ مولانا نے سبق سن کر کچھ اعتراض کیے۔ آپ نے جواب دے کر خود اعتراض کیا۔ الغرض اس سوال و جواب سے آپ کی ذہانت و فطانت کے جوہر ظاہر ہو گئے اور مولانا کے دل میں جگہ پیدا ہو گئی۔ جب تک مکان پر رہے خود پڑھایا کیے اور جب الٰہ آباد جانے لگے تو فرمایا کہ ''استاذ العلما شیخ محمد افضل سے جا کر پڑھا کرو۔''

چناں چہ آپ نے استاذ العلما سے پڑھنا شروع کیا اور اس درمیان میں جب جب مولانا الٰہ آباد سے تشریف لاتے تھے، ان سے بھی پڑھا کرتے تھے۔ آخر ساری کتابیں انہیں دو بزرگوں سے ختم کیں۔ پھر دلی جا کر حضرت شیخ نورالحق ولد امام المحدثین حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے حدیث پڑھ کر اجازت حاصل کی۔

جب حضرت قطب الاقطاب، حضرت شیخ محدث دہلوی سے حدیث پڑھنے کے لیے دہلی گئے تو شیخ پیرانہ سالی کی وجہ سے درس دینا بند کر چکے تھے۔ اس وقت آپ کے صاحبزادے حضرت شیخ نورالحق درس دیتے تھے۔ حضرت قطب الاقطاب کی خاطر سے حضرت شیخ نے یہ منظور فرمایا کہ میری موجودگی میں تم نورالحق سے پڑھا کرو۔'' [ملخص از سمات الاخیار، ص:۳۳-۳۴]

ڈاکٹر ڈی این چترویدی نے اپنی تالیف ''تصوف اور مشائخ خانقاہ رشیدیہ'' میں حضرت قطب الاقطاب کے اساتذہ کی صف میں آپ کے والد ماجد حضرت شیخ مصطفیٰ جمال الحق عثمانی، شمس نور برونوی، آپ کے ماموں مولانا شمس الدین، قطب وقت استاذ العلما مولانا شیخ محمد افضل جونپوری، شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور شیخ محدث کے مایۂ افتخار بڑے صاحبزادے شیخ نورالحق محدث دہلوی کو شمار کیا ہے۔ [تصوف اور مشائخ خانقاہ رشیدیہ، ص:۸۹-۹۰]

لیکن ان گرامی اساتذہ کی صف میں آپ کو حضرت قطب الوقت سے خصوصی شرف تلمذ رہا۔ اسی لیے آپ نے ان کے ارشد تلامذہ کے وصف سے شہرت پائی۔ صاحب تذکرۂ علمائے ہند مولانا رحمان علی صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا عبدالرشید جونپوری ابن شیخ مصطفیٰ بن عبدالحمید، لقب او شمس الحق بود شمسی تخلص می کرد۔ شاگرد شیخ افضل جونپوری و مرید پدر خود شیخ مصطفیٰ مرید شیخ محمد، مرید شیخ نظام الدین امیٹھوی قدس اللہ اسرارہم از اولیائے کبار و علمائے کرام بود۔ در اوائل حال بتدریس و افادہ علوم شغلے داشتے

ازاں بعد ترک کردہ بمطالعۂ کتب حقائق اکتفا کرد۔“ [تذکرۂ علمائے ہند، ص:۱۱۹، مطبوعہ نول کشور]

سیدنا قطب الاقطاب اپنے اساتذہ اور طلبہ کی بڑی قدر کرتے تھے۔

چناں چہ جب حضرت استاذ العلما شیخ محمد افضل جون پوری کی بارگاہ میں پڑھنے کے لیے حاضر ہوتے تو پہلے چوکھٹ کو بوسہ دیتے پھر استاد کے قدموں کو چوم کر پڑھنے بیٹھتے تھے۔

اسی حسن ادب کا اثر تھا کہ آپ کا رعب علم بڑے بڑوں پر چھایا رہتا۔ اساتذہ بھی آپ کی خداداد صلاحیتوں کی بڑی قدر فرماتے۔ حضرت استاذ العلما کی خدمت میں ”مختصر المعانی“ کا سبق پڑھ رہے تھے۔ ایک صاحب نے ازراہ تمسخر حضرت استاذ العلما سے پوچھا کہ یہ ”کان یکون“ کے معنی بھی جانتے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا یہ ”سیکون“ کے معنی بھی بتاتے ہیں۔ یعنی ماضی اور حال کے ساتھ مستقبل کی بھی خبر رکھتے ہیں۔ سبحان اللہ!

دوران درس ایک دن استاذ العلما کے ایک زبردست فاضل دوست ملا موہن بہاری ملاقات کی غرض سے تشریف لائے۔ استاذ العلما نے سبق موقوف رکھنا چاہا۔ فاضل دوست نے کہا کہ سبق پورا ہونے دیجیے تا کہ ان کی استعداد معلوم ہو۔ چناں چہ دوران سبق حضرت قطب الاقطاب اور فاضل مذکور کے درمیان بحث شروع ہو گئی۔ دیر تک مباحثہ رہا، قریب تھا کہ فاضل صاحب مغلوب ہوں کہ استاذ العلما نے ان کے علم و فضل کی رعایت کرتے ہوئے حضرت قطب الاقطاب کی طرف کن انکھیوں سے تاکا۔ آپ اشارہ سمجھ کر خاموش ہو گئے۔

صاحب شمس بازغہ جو ایک زبردست متبحر عالم اور بہترین فاضل اور فلسفی تھے، اکثر حضرت قطب الاقطاب کے ہم درس رہا کرتے؛ لیکن زمانۂ طالب علمی میں یا بعد میں کبھی بھی کسی مسئلہ میں حضرت قطب الاقطاب سے مباحثہ ہوتا تو وہ دب جاتے۔

کرامات کا تذکرہ ہو رہا تھا حضرت قطب الاقطاب نے تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا:

”میری کرامت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ جن بھی مجھ سے پڑھتے ہیں اور مسخر ہیں۔“

لیکن اس شان علم و فضل کے باوجود علوم و سلوک کے آداب کا کافی لحاظ رہتا۔

چناں چہ الہ آباد کے ایک سفر میں حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی جیسے مرتاض فاضل بزرگ ملاقات کے لیے تشریف لائے اور تصوف کے تعلق سے چند استفسارات بغرض امتحان

کیے۔ حضرت قطب الاقطاب نے کوئی جواب نہ دیا۔ شیخ کے رخصت ہونے کے بعد حاضرین نے عرض کی کہ شیخ محب اللہ جیسا فاضل شخص سائل ہو اور حضرت کچھ جواب نہ دیں یہ چیز باعث تعجب ہے۔ آپ نے فرمایا کہ:

''میں ہر چند چاہتا تھا کہ جواب دوں مگر جب گدڑی پر نظر پڑتی تھی، چپ ہو جاتا تھا کہ گدڑی کا تقاضا مباحثہ نہیں۔''

تدریس

سیدی الکریم حضرت شیخ محمد رشید تحصیل علوم کے بعد درس وافادہ اور تربیت وتعلیم کی جانب متوجہ ہوئے۔ حضرت تعلیم اور تربیت کے سارے لوازمات کا پورا اہتمام فرماتے۔ مشقت خیزیاں، تکریم، اخلاص، ایثار، شفقت، سوز دل سبھی کچھ اس راہ کے لیے وقف تھے۔ طالبان علوم نبویہ کی تدریس آپ کے نزدیک عبادت تھی محض ایک معمول نہیں۔ آپ کے مرشد حضرت مخدوم طیب بنارسی کی تلقین بھی یہی تھی۔ چناں چہ اتصال شیخ کے بعد جب آپ نے مجاہدے کے لیے وہاں ٹھہرنا چاہا تو حضرت مخدوم نے فرمایا کہ ''صبح کے وظیفے کے بدلے میں طلبہ کو درس دے دینا کہ یہ بھی بہترین عبادت ہے۔'' [تصوف اور مشائخ خانقاہ رشیدیہ، ص:۹۱]

آپ کے انداز درس کے سلسلے میں تو کوئی سراغ نہیں ملا البتہ اتنا ضرور معلوم ہے کہ ظاہری اور باطنی علوم میں گہرا درک اور استحضار رکھنے کی وجہ سے سوالات کے جوابات اور مزید روشن نکات فوراً پیش فرماتے۔ صاحب سمات الاخیار لکھتے ہیں:

''شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی تصانیف فصوص الحکم وغیرہ برابر آپ کے مطالعے میں رہا کرتی تھیں اور اس کا درس دیا کرتے تھے۔ اس کے مسائل اور حقائق پر آپ کو اس قدر عبور تھا کہ جس مسئلہ میں جو شخص شبہ وارد کرتا تھا، آپ بدلائل ثابت کر دیتے تھے اور تصوف کے مسائل کا استدلال اسی کتاب سے فرماتے تھے۔'' [سمات الاخیار، ص:۴۴]

حضرت اپنے طلبہ کا بہت ہی زیادہ اکرام فرماتے تھے۔ چاہت اور شفقت تو گویا انہیں کے لیے خاص تھی۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ وصال شریف سے کچھ دنوں پہلے ہی آپ نے یہ وصیت کی تھی کہ جس پتھر پر میرے طلبہ کی جوتیاں اترتی ہیں میری قبر پر اسی کا تختہ دیا جائے۔ [ایضاً، ص:۳۵]

اس بے پناہ شفقت کا اثر یہ تھا کہ طلبہ بھی آپ کے تعلق سے وارفتہ ہوش اور سراپا نثار تھے۔

تصنیف

حضرت دیوان جی تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف سے بھی طبعی مناسبت رکھتے تھے۔ سرعت تحریر، وفور علم، تیزئ فکر، ذہنی خلا، ذکاوت وقوت اخذ، وسعت مطالعہ اور علمی استحضار یعنی تصنیف وتالیف کے سارے سامان آپ کے پاس موجود تھے۔

صاحب سمات الاخیار آپ کی مبارک اور مقبول تصنیف ''مناظرۂ رشیدیہ'' کی تقریب تصنیف کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''ایک دن آپ اپنے استاد حضرت علامہ شیخ محمد افضل قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت حضرت علامہ مناظرہ کی کتاب ''شریفیہ'' کسی کو پڑھا رہے تھے۔ آپ کی طرف دیکھ کر فرمایا ''متن خوب ہے اگر کوئی اس کی شرح لکھ دے تو بہت ہی اچھا ہوتا''۔ دوسرے ہفتہ جب آپ اپنے استاذ گرامی حضرت قطب وقت سے ملنے گئے تو ''شریفیہ'' کی شرح ''رشیدیہ'' ساتھ تھی۔ استاذ گرامی بہت خوش ہوئے، کافی سراہا اور دعائیں دیں۔

[سمات الاخیار،ص:۳۵]

اس واقعہ سے آپ کی سرعت تحریر اور قوت تصنیف کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جامعیت، سلاست، واضح اسلوب، حل مطالب، بحث کا محاکماتی انداز، غوامض کی عقدہ کشائی، اختلافات کی تطبیق غرض ساری خوبیاں اس مختصر سے رسالہ میں موجود ہیں۔ یہی سبب ہے کہ زمانۂ تصنیف سے لے کر اب تک یہ کتاب مقبول ومتداول ہے اور اسی کی جامعیت نے اس فن کی دوسری کتابوں سے بے نیاز کر رکھا ہے۔

حضرت قطب الاقطاب نے اس رسالے میں مستقل اور مفید اضافے بھی فرمائے جو متقدمین کے افادات پر مستزاد ہیں۔ اس سے بلاشبہ آپ کی قوت اجتہادیہ اور جودت طبع کا پتہ چلتا ہے۔

مناظرہ کے وقت مناظر کے لیے کیا ضروری اوصاف اور حالات ہونے چاہئیں؟ آپ نے حضرت فخر الدین رازی کے حوالے سے آٹھ باتیں نقل کیں، جس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) مناظر اپنی بات اتنی مختصر نہ پیش کرے کہ سمجھ ہی میں نہ آسکے
(۲) بہت زیادہ لمبی چوڑی گفتگو بھی نہ ہو کہ لوگ اوب جائیں
(۳) نادر اور اجنبی الفاظ نہ استعمال کرے
(۴) ذو وجہین گفتگو نہ کرے خصوصاً جب کہ قرینہ واضح نہ ہو
(۵) بے مقصد اور موضوع سے ہٹ کر گفتگو نہ ہو کہ مقصد سے دور جا پڑے
(۶) نہ استہزا ہنسے، نہ چلائے اور نہ کمینوں کا انداز اختیار کرے کیوں کہ یہ جاہلوں کی عادتیں ہوتی ہیں، اس سے وہ اپنی جہالت پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔
(۷) کسی ایسے شخص سے مناظرہ کرنے سے گریز کرے جو اس کی نگاہ میں محترم اور بارعب ہو کیوں کہ بسا اوقات مخالف کی ہیبت اور احترام مناظر کی فکری قوت اور ذہنی توانائی سلب کر لیتی ہے۔
(۸) مخالف کو کمزور اور حقیر نہ سمجھے کہ اس کی وجہ سے کہیں کوئی ایسی لچر بات نہ صادر ہو جائے جو مخالف کے غلبہ کا سبب بن جائے۔

اب افادات رازی کے ذکر کرنے کے بعد حضرت دیوان جی تحریر فرماتے ہیں:

"واقول مستعيناً به تعالىٰ أنه ينبغي:

(۱) للمناظر أن لا يقصد اِسكات الخصم في زمان قليل لأنه قد يصدر بالسرعة مقدمات واهية توجب غلبة الخصم.

(۲) وأن لا يجلس حين المناظرة متكئا جلسة الأمراء بل جلسة الفقراء لأن هٰذه مما يوجب اجتماع الذهن وخلوصه عن الانتشار.

(۳) وأن لا يكون جائعا بكثرة الجوع ولا عطشا بمثرة العطش لأنهما، يوجبان سرعة الغضب المنافية للمناظرة ولا ممتليا كل الامتلاء ايضا لانه يوجب جمود الطبيعة وخمود شعلة القريحة." [مناظرۂ رشیدیہ، ص:۸۰]

ترجمہ: میں رب تعالیٰ کی تائید کا طالب ہو کر مزید کہتا ہوں کہ:

(۱) مناظر کو اس بات کا ارادہ نہیں کرنا چاہیے کہ وہ تھوڑے ہی عرصہ میں مخالف کو خاموش کر دے کیوں کہ بسا اوقات عجلت میں ایسی کمزور اور پوچ باتیں زبان سے بے ساختہ نکل جاتی

ہیں جو مخالف کی فتح کا سامان بن جاتی ہیں۔

(۲) مناظرہ کے وقت مناظر امیروں کی طرح ٹیک لگا کر نہ بیٹھے بلکہ فقیروں کے انداز میں مجلس نشیں ہو کہ اس سے لازمی طور پر ذہنی توانائیاں مجتمع رہتی ہیں اور ذہن و دماغ انتشار سے محفوظ رہتا ہے۔

(۳) مناظرہ کے وقت مناظر کو بہت زیادہ بھوکا پیاسا نہیں ہونا چاہیے کہ شدت بھوک پیاس سے بہت جلد غصہ آ جاتا ہے جو مناظرہ کے آداب کے منافی ہے۔ یوں ہی مکمل آسودہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ اس سے طبعی قوتیں منجمد ہو جاتی ہیں اور ذہنی جولانیت جاتی رہتی ہے۔

صاحب تذکرۂ علمائے ہند نے حضرت قطب الاقطاب کی تصانیف کی اجمالی فہرت پیش کی ہے۔ چناں چہ آپ لکھتے ہیں:

''تصانیف مفیدہ دارد من جملہ آں (۱) رشیدیہ در مناظرہ (۲) زاد السالکین (۳) شرح اسرار الخلوۃ (للشیخ ابن العربی) (۴) رسالہ محکوم مربوط (۵) حاشیۂ شرح مختصر عضدی (۶) حاشیہ فارسی بر کافیہ ابن حاجب (۷) مقصود الطالبین در اوراد (۸) دیوان شعر فارسی مشہور اند۔''

[تذکرہ علمائے ہند، ص:۱۱۹]

ڈاکٹر ڈی این چترویدی بلیاوی نے حضرت کی تصانیف کے ذیل میں ''ترجمۂ معینیہ'' اور ''تذکرۃ النحو'' کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

سمات الاخیار میں آپ کی تصانیف کا اجمالی تعارف بھی موجود ہے جو اس کے الفاظ میں پیش ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

آپ کی تصانیف بہت ہیں، چند کتابیں جو خانقاہ میں موجود ہیں ان کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) رشیدیہ: یہ شریفیہ کی شرح ہے اور فن مناظرہ کی مشہور کتاب ہے، یہ کتاب چھپ گئی ہے اور درس میں داخل ہے۔

(۲) تذکرۃ النحو: نحو کے مسائل میں چند ورقوں کا رسالہ ہے جس کو آپ نے اپنے صاحبزادے حضرت شیخ محمد ارشد کے پڑھنے کے واسطے لکھا تھا۔ اس کی ابتدا میں ''اعلم ارشدک اللہ تعالیٰ'' لکھا ہے۔ اب ''خلاصۃ النحو'' کے نام سے مشہور اور ''نحو میر'' کے آخیر میں طبع ہے۔

(۳) **زادالسالکین**: یہ رسالہ تصوف کے متعلق ہے جس کو اپنے پہلے مرید حضرت شیخ عبدالمجید کے لیے تحریر فرمایا ہے۔

(۴) **مقصودالطالبین**: یہ کتاب بھی تصوف میں ہے۔ اس میں معارف اور حقائق کی باتیں مرقوم ہیں۔ حضرت نصرت ملتانی کے لیے لکھی گئی تھی۔

(۵) **ترجمۂ معینیہ**: یہ رسالہ ''تذکرۃ النحو'' کی شرح ہے۔ حضرت شیخ غلام معین الدین کے پڑھنے کے لیے تحریر فرمایا تھا۔ یہ دونوں رسالے متن اور شرح کے شیخ محمد وارث فیاضی رشیدی چندا پوری کے ہاتھ کے لکھے ہوئے میرے خالاتی بھائی شیخ جمیل احمد شاداں شیخ پوری مرحوم کے یہاں موجود ہیں۔

(۶) **بدلیۃ النحو**: یہ بھی نحو کا رسالہ ہے جو اپنے بڑے بیٹے حضرت شیخ محمد حمید کے لیے لکھا تھا۔

(۷) **مکتوبات**: یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو اکثر خلفا کے نام بطور جواب لکھے گئے تھے۔

(۸) **دیوان شمسی**: آپ کے فارسی و ہندی اشعار کا مجموعہ ہے۔ شمسی تخلص فرماتے تھے۔ کلام معرفت خیز ہے۔

ان کے علاوہ اور تصانیف کا پتہ بھی دوسرے مورخوں کی تحریر سے لگتا ہے؛ لیکن یہاں ان کا وجود نہیں ممکن ہے کہ اور مقاموں میں ہوں۔

صاحب خزینۃ الاصفیا کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے شیخ اکبر کی تصنیف ''اسرار المخلوقات'' پر ایک بسیط شرح لکھی ہے۔ ''رشیدیہ'' اور ''تذکرۃ النحو'' کے سوا سب رسالے قلمی ہیں۔ [سمات الاخیار، ص: ۵۳-۵۴]

دیوان شمسی حضرت کے بڑے صاحبزادے حضرت شیخ محمد حمید نے ترتیب دیا ہے۔ گنج رشیدی حضرت قطب الاقطاب کا بسیط ملفوظ ہے جسے آپ کے چہیتے مرید حضرت نصرت جمال خاں ملتانی نے ۱۰۷۲ھ سے ۱۰۸۳ھ تک جمع کیا ہے۔ اس کے علاوہ ملفوظات کے دو اور مختصر مجموعے ہیں جن میں سے ایک حضرت کے مرید قاضی محمد مودود جونپوری نے ماہ صفر ۱۰۷۴ھ سے ربیع الثانی ۱۰۷۵ھ تک جمع کیا ہے۔ اور دوسرا حضرت کے مرید شیخ غلام محی الدین بھنڈاری کا ترتیب دادہ ہے جسے انہوں نے رمضان المبارک ۱۰۷۳ھ تک اکٹھا کیا ہے۔

مکتوبات رشیدیہ سیدی الکریم حضرت علامہ محمد عبدالعلیم رشیدی قادری آسی غازی پوری نے مرتب فرمایا ہے۔ ۲۵؍رجب جمعہ کے دن ۱۲۷۵ھ میں آپ نے مکتوبات کی ترتیب کا آغاز کیا جس میں سیدنا سرکار غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سیدی الکریم حضرت قطب الاقطاب، حضرت بدرالحق محمد ارشد اور حضرت قمرالحق غلام رشید کے مکاتیب جمع فرمائے۔ چناں چہ آپ مکتوبات کے آغاز میں لکھتے ہیں:

''بتاریخ بست وپنجم ماہ رجب بروز جمعہ سنہ یک ہزار ودوصد وہفتاد وپنج از ہجرت سیدالانبیا علیہ من الصلوٰۃ اکملھا، خاطر فاطر محمد عبدالعلیم قادری رشیدی سکندر پوری ابن شیخ قنبر حسین قادری رشیدی امیری کمین سگان بارگاہ شیخ الاسلام، قطب الانام، حجۃ العاشقین، امام السالکین، مرشد الطالبین حضرت شیخ غلام معین الدین امیر الدین متع اللہ المسلمین بطول بقاءہ ونور قلوبنا بنور ھدایتہ آمادۂ آں شد کہ مکتوبات شیخ الثقلین، امام ربانی، مجدد ملت، ناسخ الملل در الف ثانی، قطب الاقطاب، فرد الاحباب، ابوالبرکات، شمس الحق محمد رشید مصطفیٰ عثمانی جون پوری قدس اللہ روحہ وأوصل الینا فیوضہ وہر چہ از مرقومات امام الاصفیا، قدوۃ الاولیا، قطب العالم، غوث بنی آدم، ابی الکشف، بدرالحق محمد ارشد محمد رشید قدس سرہٗ بہم رسد وبرخے از مکتوبات سراج السالکین، تاج العارفین، برہان الاتقیا، قطب الاولیا، ابی الفیاض، قمرالحق غلام رشید ارشد قدس سرہ راحتی الوسع بتصحیح کوشیدہ یکجا مجتمع کردہ مجلدے سازد وسیلۂ نجات خود درآخرت پرداز دومکاتیب قطب ربانی، محبوب سبحانی، غوث صمدانی، امام الملۃ والدین، نور دیدۂ سید المرسلین، سیدمحی الدین شیخ عبدالقادر الحسنی الحسینی الجیلانی رضی اللہ عنہ را کہ بخط خاص حضرت قطب الاقطاب علیہ رحمۃ رب الارباب در بیاضے مرقوم یافتہ امام ہمہ کند ومتوقع امداد واعانت از روحانیت ایں بزرگان است کہ ایں مطلب بپایاں انجامد۔'' [مکاتبات عارفین، ص:۱-۲]

ترجمہ: ۲۵؍رجب روز جمعہ ۱۲۷۵ھ کو شیخ الاسلام، قطب الانام، حجۃ العاشقین، امام السالکین، مرشد الطالبین حضرت شیخ غلام معین الدین امیر الدین (رب کریم ان کی درازی عمر سے اہل اسلام کو نفع یاب فرمائے اور ان کے نور ہدایت سے ہمارے دل روشن رکھے) کی بارگاہ کا ناکارہ غلام محمد عبدالعلیم قادری رشیدی سکندر پوری ابن شیخ قنبر حسین قادری رشیدی امیری کا

تھکا ماندہ دل اس بات پر آمادہ ہوا کہ شیخ الثقلین، امام ربانی، مجدد ملت در الف ثانی، قطب الاقطاب، فرد الاحباب، ابوالبرکات، شمس الحق محمد رشید مصطفیٰ عثمانی جون پوری (رب کریم ان کی روح مبارک کو پاکیزہ رکھے اور ان کے فیوض و برکات ہمیں عطا فرمائے) کے مکاتب گرامی، امام الاصفیا، قدوۃ الاولیا، قطب العالم، غوث بنی آدم، ابوالکشف، بدرالحق محمد ارشد محمد رشید قدس سرہ کے دستیاب شدہ والا نامے، اور سراج السالکین، تاج العارفین، برہان الاتقیا، قطب الاولیا، ابوالفیاض قمرالحق غلام رشید ارشد قدس سرہ کے چند مکتوبات عالیہ، حتی الوسع صحت کے ساتھ ایک جلد میں جمع کر کے آخرت میں اپنی نجات کا سامان کر لے۔ اور ان سب مکتوبات کے پیش رو، سیدنا قطب ربانی، محبوب سبحانی، غوث صمدانی، امام الملۃ والدین، نور دیدۂ سید المرسلین سید محی الدین شیخ عبدالقادر حسنی حسینی جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وہ مکاتیب کریمہ ہوں گے جو حضرت قطب الاقطاب علیہ الرحمہ کے قلم خاص سے ایک بیاض میں تحریر شدہ ہیں۔ ان بزرگان دین کی روحانی امداد اور اعانت سے امید ہے کہ یہ مقصود پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔

یہ مجموعہ چار فصل پر مشتمل تھا؛ لیکن حضرت سید شاہد علی رشیدی سبز پوش فانی گورکھپوری کے زیر اہتمام قمر پریس، بلیا کا چھپا جو نسخہ فقیر کے پیش نظر ہے۔ اس میں صرف تین فصلیں موجود ہیں:

پہلی فصل میں سرکار غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اٹھارہ مکاتیب کریمہ ہیں۔ دوسری میں سیدنا حضرت قطب الاقطاب کے ننانوے مکاتیب قدسیہ ہیں اور تیسری فصل میں سیدی الکریم حضرت بدرالحق شیخ ارشد محمد رشید کے گیارہ مکاتیب عالیہ ہیں۔ حضرت قمرالحق غلام رشید ارشد کے مکاتیب گرامی پر مشتمل چوتھی فصل اس مطبوعہ نسخہ میں موجود نہیں، البتہ اخیر میں مکتوبات جمالی بطور ضمیمہ شامل ہے، جس میں حضرت قطب الاقطاب کے والد گرامی حضرت جمال الحق شیخ محمد مصطفیٰ عثمانی کے اکیس مکاتیب عالیہ موجود ہیں۔

شعر و سخن

حضرت قطب الاقطاب سراپا عشق تھے۔ عشق حقیقی میں دلوں کے اندر تکیفات اور احساسات کا ایک جہان آباد رہتا ہے۔ ان واردات قلب کے اظہار کا بہترین ذریعہ شعر گوئی کا میدان ہے۔ حساس دل جذبوں کی کشش سے جب متاثر ہوتے ہیں تو اچانک بدو دل لفظوں

کے پیکر محسوس میں تبدیل ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے حضرت کی بھی شعر وسخن سے مناسبت طبعی تھی۔ آپ کی فکر بڑی عالی تھی۔ شمس تخلص فرماتے۔ چند اشعار کتب سوانح میں ملتے ہیں۔ ویسے حضرت کے دیوان کا نصف سے زائد حصہ خانقاہ رشیدیہ کے ذخیرۂ کتب میں محفوظ ہے۔ سمات الاخیار کے مطابق آپ کے دیوان میں فارسی اور ہندی دونوں زبانوں کے اشعار موجود ہیں جو بلاغت کے اعلیٰ معیار کو پورا کرتے ہیں۔ بزرگوں کے یہاں قافیہ پیمائی اور ردیف سازی تو ہوتی نہیں، وہاں تو بس ''ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد'' کا معاملہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس فطری اور آمد آمد کی شاعری میں بھی شعری صنعتوں کی ساری بہاریں قابل لحاظ انداز میں موجود ہوتی ہیں۔ اس کی مثال دیکھنی ہو تو کلام رضا اٹھا کر دیکھ لیجیے۔

جو کہے شعر و پاس شرع دونوں کا حسن کیوں کر آئے

لا اسے پیش جلوۂ زمزمۂ رضا کہ یوں

سیدنا حضرت قطب الاقطاب شمسی جون پوری کی شاعری بھی سلاست اور جذبوں کے تراوش سے بھرپور ہے اور ساتھ ہی صنعت شعری کا حسن بھی سمیٹے ہوئے ہے۔ آپ کے فارسی اور ہندی کلام کے دو نمونے حاضر ہیں۔ کس قدر سرمستی، کیف اور نغمگی کھنکتی ہے ان شعروں میں۔

۱ نہاں و آشکارا در نظر باشد جمال تو — دلم یک دم نباشد فارغ از فکر و خیال تو

۲ چوں یک تخم محبت کاشی اندر دل آدم — شدہ صد شاخ و برگ اندر جہاں از یک نہال تو

۳ شدی ہر صورت آدم ہویدا بر ہمہ عالم — کجا مثلت بود پیدا اگر باشد مثال تو

ذیل کے اشعار میں تغزل کی شان پوری آن بان کے ساتھ موجود ہے۔

۴ ہر نگاہ او دعائے دیگر است — پیچش زلفش بلائے دیگر است

۵ من بیک دم سیر عالم می کنم — روح را دستے و پائے دیگر است

۶ بر بدن صد زخم خنجر گرزنی — نے بمیرم جاں بجائے دیگر است

۷ از دل شمسی دم تمکیں مجوئے — ہر دمش چو ہو وہائے دیگر است

۸ دارم دل تاریک و رخ نامہ سیاہ — ابلیس بجوید زمن خستہ پناہ

۹ ہر کس کہ بگویم نہ کندمی گوید — لاحول ولا قوۃ الا باللہ

ترجمہ:

(۱) تیرا جمال نگاہ میں عیاں بھی رہتا ہے اور نہاں بھی میرا دل تیرے فکر وخیال سے ایک لمحہ بھی خالی نہیں رہتا

(۲) جب سے تو نے محبت کا ایک بیج آدم کے دل میں بودیا ہے تو کائنات کے اندر سینکڑوں شاخیں اور پتیاں تیرے صرف ایک شاداب پودے سے پیدا ہوگئیں

(۳) تو حضرت آدم علیہ السلام کی صورت میں سارے عالم میں نمایاں ہے۔ اگر ہم تیری مثال مان بھی لیں تو تیرا مثل کہاں پیدا ہوسکتا ہے

(۴) اس کی ہر نگاہ ایک الگ دعا ہے۔ اس کے زلف کی ہر پیچ ایک الگ مصیبت ہے

(۵) میں ایک ہی لمحہ میں سارے عالم کی سیر کرلیتا ہوں، روح کے ہاتھ پاؤں دوسرے ہوتے ہیں

(٦) جسم پر تو اگر خنجر کے سینکڑوں زخم لگائے تو بھی میں نہیں مروں گا کہ روح کسی دوسرے مقام پر ہے

(۷) شمسی کے دل سے ایک لمحہ بھی سکون مت تلاش کر اس کے لیے تو ہر لمحہ ایک الگ ہی شور ہے

(۸) میں تاریک دل اور سیاہ نامۂ اعمال رکھتا ہوں۔ ابلیس بھی مجھ بے چارے سے پناہ ڈھونڈھتا ہے

(۹) میں جس سے بھی کچھ کہتا ہوں وہ نہیں کرتا؛ (بلکہ) کہتا ہے لاحول ولاقوۃ الا باللہ

حضرت کا ہندی کلام دستیاب نہیں۔ دیوان شمسی کے قلمی نسخے میں صرف یہ دوہے ملتے ہیں:

بورا جگ بوجھے ناہیں کانہا کے من بور
اور نہیں سوں اور ہی بھیو تسلسل دور
کھولوں نین تو اور کچھ موندوں تو اور
کھولے موندے اور ہی کیوں راکھوں من تھور

[تصوف اور مشائخ خانقاہ رشیدیہ، ص: ۲۲۷]

سیدنا حضرت دیوان جی کے مکاتیب طیبہ اور ملفوظات کریمہ بھی کچھ محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دونوں خانقاہ رشیدیہ میں موجود ہیں۔ خانقاہ رشیدیہ کی حاضری کے وقت فقیر کو

حضرت کے مکاتیب کا مجموعہ دستیاب ہوا جس کا مختصر جائزہ اخیر میں حضرت کی تعلیمات اور صوفیانہ افکار کے ذیل میں آئے گا۔

روحانی نسبتیں

سیدنا قطب الاقطاب حضرت محمد رشید مصطفیٰ جون پوری میں ایام طفولیت ہی سے کرامت کے آثار تھے، اس لیے طلب مولیٰ میں ہمت عالی رکھتے تھے۔ روحانی کشش وانجذاب جہاں لیے جاتی وہاں آپ کشاں کشاں چلے جاتے۔ یہ آپ کی حد درجہ تواضع اور روحانی نسبتوں کے فیوض و برکات کے حصول کا والہانہ پن تھا۔ یہی سبب تھا کہ حضرت نے کثیر بزرگوں سے نسبتیں، اجازتیں اور خلافتیں پائیں۔ بزرگوں کی نگاہ کیمیا اثر نے اس خاکی پیکر کے کندن وجود کو خوب پہچانا پھر اس پر اپنی نگاہ اثر کے فیض رسانے ایسا طلا کیا کہ پورا وجود جگمگانے لگا جس کی دمک سے ایک عالم مسکرا اٹھا۔ آج بھی تاثیر اور فیض رسانی کا یہ سرچشمہ اسی آب وتاب کے ساتھ رواں دواں ہے۔

چہ از صفائے ارادت زنم بمہر تو دم
ضمیر پاک، دل روشنت گواہ من است

حضرت قطب الاقطاب نے راہ سلوک میں سب سے پہلے اپنے والد ماجد سے رہنمائی حاصل کی اور آپ کی تربیت میں رہ کر عظیم ریاضتیں فرمائیں۔ اس کے بعد جن مشائخ سے آپ نے اکتساب فیض کیا، ان میں سب سے زیادہ حصہ سیدنا مخدوم شاہ طیب بنارسی کا ہے۔ آپ کے مشائخ روحانیت آٹھ ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

(۱) والد ماجد سیدنا شیخ مصطفیٰ جمال الحق عثمانی قدس سرہٗ

۹ رسال کی عمر شریف میں والد ماجد سے سلسلۂ عالیہ چشتیہ میں بیعت ہوئے اور کلاہ ارادت اور خرقۂ خلافت آپ کے مقدس ہاتھوں سے زیب تن فرمایا۔

(۲) مخدوم شاہ طیب بنارسی قدس سرہٗ

والد گرامی سے اکتساب فیوض کے مواقع ان کے جلد وصال فرما جانے کی وجہ سے طویل عرصہ تک دستیاب نہ ہو سکے۔ اس لیے والد ماجد کے بعد دل مشتاق ایک کامل رہنما کا تمنائی بنا۔ حضرت مخدوم طیب بنارسی کا شہرہ سن کر حاضر بارگاہ ہوئے اور پھر ان کے اسیر ہو کر رہ گئے۔

بالآخر خدمت اقدس کی برکات نے آپ کو مالا مال کر ڈالا۔

ایک مرتبہ مخدوم مکرمی کی بارگاہ میں حاضری ہوئی تو حکم ہوا کہ رمضان شریف کے اخیر عشرہ میں اعتکاف کرو۔ آپ نے حسب حکم وہیں رہ کر شیخ مکرم کے فیضان کرم تلے اعتکاف فرمایا۔ ان دس دنوں میں بہت سے مکاشفات اور عجائب وغرائب کے مشاہدات ہوئے۔ عید سعید آ گئی، دینی سرور وابتہاج کے ان حسین اور پر کیف لمحات میں بارگاہ مخدومی میں مخلوق خدا سمٹ آئی۔ آپ نے مقربین اور خاصان خدا کے حلقۂ خاص میں اپنے اس لاڈلے مرید کو منزل تکمیل تک رسائی کے اعزاز میں خرقۂ نعمت چشت اور تاج خلافت اہل بہشت سے سرفراز فرما دیا۔ پھر رفتہ رفتہ سلوک کے ارتقائی منازل، جذبۂ شوق کی توانائیاں اس منزل پر لے آئیں کہ قادریت کا آب زلال بھی لبوں سے لگالیا۔ سہروردیت کا جمال بھی روئے اقدس پہ جگمگانے لگا۔ یوں شیخ کامل کی رہنمائی میں سلوک کی تین راہیں دریافت ہوئیں: (۱) چشتیت (۲) قادریت اور (۳) سہروردیت۔

(۳) شیخ عبدالقدوس قلندر جون پوری قدس سرہ

حضرت شیخ عبدالقدوس قلندر، جون پور کے مشہور بزرگ سیدنا قطب بینائے دل قلندر سرانداز غوثی کے پرپوتے ہیں۔ حضرت دیوان جی آپ سے سلسلۂ قلندریہ میں مستفیض ہوئے۔

(۴) حضرت راجے سید احمد مجتبیٰ مانک پوری قدس سرہ

حضرت راجے سے حضرت دیوان جی کے کسب فیض کی کیا صورت ہوئی؟ اس کی تفصیل صاحب سمات الاخیار سے سنیے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ایک مدت کے بعد حضرت قطب الاقطاب کو اس بات کا شوق پیدا ہوا کہ سلسلۂ چشتیہ و قادریہ حضرت شاہ حسام الحق مانک پوری کے خاندان سے بھی اخذ کرنا چاہیے۔ آپ مانک پور پہنچے اور حضرت راجے سید احمد مجتبیٰ قدس سرہ سے طالب ہوئے۔''

گنج ارشدی میں ہے کہ'' حضرت دیوان جی تین بزرگوں کے ساتھ مانک پور گئے تھے۔ حضرت راجے نے اندر سے کھانا بھجوایا جس میں شیر برنج بھی تھا۔ حضرت دیوان جی نے تو ہر قسم کے کھانے کھائے اور ایک نے فقط شیر برنج کھایا اور ایک نے کچھ نہیں کھایا۔ حضرت راجے نے

جب یہ سنا تو فرمایا کہ جس نے سب کچھ کھایا اس نے دین و دنیا سب کچھ پایا۔ جس نے شیر برنج کھایا وہ فقط عقبیٰ لے گیا۔ جس نے کچھ نہیں کھایا کچھ نہیں پایا۔ [سمات الاخیار، ص:۴۲]

حضرت دیوان جی وہاں چند روز مقیم رہے اور جو ہر قابل اجازت و خلافت ہمایوں سے سرفراز کیا گیا۔

(۵) حضرت شیخ تاج الدین جھونسی قدس سرہ

حضرت قطب الاقطاب کے معاصر اور ہم شیخ بزرگ شیخ محمد یٰسین جھونسوی (مرید و خلیفہ مخدوم شاہ طیب بنارسی) اپنی تصنیف ''مناقب العارفین'' میں لکھتے ہیں:

''قطب الاقطاب در سلسلۂ سہروردیہ بلا واسطہ از قطب التورعین حضرت شیخ تاج الحق والشرع والدین مجاز است'' [تاریخ سلاطین شرقی و صوفیائے جونپور، ص:۱۲۲۱، ج:۱]

(۶) حضرت میر سید شمس الدین کالپوی بخاری قدس سرہٗ

حضرت میر سے اکتساب فیض اور حصول نعمت کے سلسلے میں دو روایت ہے:

صاحب سمات الاخیار، گنج ارشدی اور بحر زخار کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''گنج ارشدی میں ہے کہ حضرت میر سید شمس الدین کالپی بخاری جون پور میں تشریف لائے تھے۔ ایک روز قطب الاقطاب کے پاس آپ خود آئے۔ یہاں درس جاری تھا۔ فراغت کے بعد حضرت میر نے قریب بلا کر فرمایا کہ مجھے خدائے تعالیٰ نے نعمت حوالہ کرنے کو تمہارے پاس بھیجا ہے۔ لو خدا نے مفت دیا ہے۔

اور صاحب بحر زخار کا بیان ہے کہ آپ جب پورنیہ کو جا رہے تھے تو بہار میں حضرت مخدوم شیخ شرف الدین احمد منیری کی زیارت کے لیے گئے۔ حضرت میر جو بیابان راج گیر میں رہا کرتے تھے بحکم حضرت غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہار میں تشریف لائے اور نعمتیں حوالہ فرمائیں۔'' [سمات الاخیار، ص:۳۸-۳۹]

مذکورہ مشائخ عظام کے علاوہ (۷) حضرت شیخ عبداللہ شطاری سے شطاریہ اور (۸) حضرت شیخ شہباز محمد بھاگل پوری سے چشتیہ اور احمدیہ سلسلے کی اجازتیں بھی مرحمت ہوئیں)

یوں حضرت قطب الاقطاب کی ذات گرامی ایک ایسا سنگم تھی جہاں روحانی سلاسل کے

مختلف سمندر آ کر ضم ہوگئے تھے۔ یہ مجمع البحار ذات کریم اپنے اعلیٰ ظرف اور وسعت استعداد سے دنیا والوں کے لیے سراپا خیر و برکت ثابت ہوئی اور ایک عالم آپ کے دم قدم سے فیض یاب ہوا۔

روحانی نعمتیں اور مراتب

سلاسل روحانی کی تفصیل گذر چکی۔ ان کے ساتھ اذکار، اوراد اور عالی توجہات کی جو عظیم الشان نعمتیں حضرت قطب الاقطاب کو حاصل ہوئیں، اس کی قدرے تفصیل یہ ہے۔ ورنہ

اک سمندر تھا پتہ کیا چلے گہرائی کا

(۱) حضرت مخدوم شیخ طیب بنارسی قدس سرہ نے خرقہ و مثال چشتیہ و قادریہ، مثال سہروردیہ و مداریہ، اوراد حضرت شیخ ناصر الدین، تاج الاوراد، اوراد شہریہ، ذکر اسمائے حسینی، ذکر جہات ستہ، ذکر نفی و اثبات طریقۂ چشتیہ اور شغل سہ پایہ کی اجازتیں مرحمت فرمائیں۔

(۲) سید السادات حضرت میر سید شمس الدین کالپوی قدس سرہٗ نے خرقہ و مثال حضرت قادریہ و مداریہ، طریقۂ توجہ بجانب مزار سرکار غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ، پنج گنج قادری، طریقۂ تہجد، اوراد اوقات خمسہ، اذکار قادریہ، ذکر نفی اثبات، ذکر اثبات، ذکر اسم ذات چہار ضربی اور صلوٰۃ معکوسہ وغیرہ کی نعمتیں عطا فرمائیں۔

(۳) سید السادات حضرت راجے سید احمد مجتبیٰ مانک پوری قدس سرہٗ کی بارگاہ سے خرقہٗ و مثال سلسلۂ چشتیہ و قادریہ، اوراد بندگی شیخ کالو، ذکر صبح و شام، ذکر نفی اثبات، ذکر اثبات ذکر اسم ذات، ذکر سہ پایہ، ذکر عروج و نزول وغیرہ کی دولتیں ملیں۔

(۴) حضرت شیخ عبد القدوس قلندر جونپوری قدس سرہٗ نے مثال سلسلۂ مداریہ و فردوسیہ، اذکار و علم قلندریہ، ضرب راست، ضرب کوب، ذکر اسم ذات، ذکر دل جسے ندا و منادی کہتے ہیں، گردش ذکر ثلاثی گنبدی وغیرہ کی نعمتوں سے سرفراز فرمایا۔ [سمات الاخیار، ص: ۴۳-۴۴]

اتنی کثیر اور اعلیٰ نعمتیں جس ذات کریم کو عطا کی گئی ہوں اس کا رتبہ کیا ہوگا؟ اس کا اندازہ ہر باخبر شخص ہی لگا سکتا ہے۔ مزید آپ کے مراتب بلند کا اندازہ اس سے بھی کیجئے کہ آپ اپنے مشائخ طریقت کے لیے صرف مرید نہیں بلکہ مراد بن چکے تھے اور یہ رتبۂ قرب اسی کو ملا کرتا ہے جو اپنی بلندیٔ درجات کے سبب شیخ کے لیے سرمایۂ رشک و افتخار بن چکا ہو۔

''سیدنا حضرت مخدوم محمد طیب بنارسی قدس سرہٗ جب حضرت قطب الاقطاب قدس سرہٗ کو چشتیہ قادریہ فیض کے ساتھ ساتھ) مداریہ اور فردوسیہ سلسلے کی برکات سے بھی سرفراز کر چکے تو اب حضرت مخدوم کے پاس جب کوئی طالب آتا تو یہی فرماتے کہ ''اب میں ضعیف ہوا، میاں محمد رشید ذکر خوب کرتے ہیں، ان کے پاس جاؤ۔'' [سمات الاخیار، ص:۴۰]

''یوں ہی آپ کے قلندریہ سلسلہ کے شیخ طریقت حضرت شیخ عبدالقدوس قلندر قدس سرہٗ کے پاس جب حضرت سید السادات حضرت راجے سید احمد مجتبیٰ حلیم اللہ مانک پوری قدس سرہٗ جیسے مادرزاد ولی ملاقات کے لیے تشریف لائے تو حضرت قلندر سے ذکر ثلاثی گنبدی کے طالب ہوئے)۔ حضرت شیخ عبدالقدوس قلندر قدس سرہٗ نے فرمایا کہ میاں محمد رشید نے خوب سیکھا ہے۔ مجھے ضعف ہے۔ حضرت راجے نے کہا کہ وہ طالب علم ہیں۔ مجھے کیا بتائیں گے؟۔ اتفاق سے حضرت راجے پالکی پر سوار کہیں جارہے تھے اور قطب الاقطاب، ملاشمس کے مکان سے آرہے تھے۔ ملا محمود کے مکان کے پاس ملاقات ہوگئی۔ حضرت راجے نے پالکی رکوا کر فرمایا کہ بابا! ذکر ثلاثی گنبدی مجھے بتادوگے؟ آپ نے عرض کی کہ میں طالب علم ہوں مجھے اذکار سے کیا سروکار؟ پھر لوگوں نے اپنی اپنی راہ لی۔ [ایضا، ص:۴۱]

لیکن پھر کچھ دنوں کے بعد حضرت قطب الاقطاب سلسلۂ چشتیہ قادریہ حضرت شیخ حسام الحق مانک پوری کی بارگاہ سے حاصل کرنے کے شوق میں حضرت راجے سید احمد مجتبیٰ قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت راجے بہت شفقت سے پیش آئے اور چند دن اپنے پاس رکھ کر اپنے سلسلے کی اجازت وخلافت مرحمت فرمائی۔ جب سب مراتب طے ہوگئے تو رخصت کرتے وقت حضرت سید راجے، قطب الاقطاب کے پاس جہاں وہ ٹھہرے تھے۔ تشریف لائے اور فرمایا کہ بابا مجھے ذکر ثلاثی گنبدی بتاؤ۔ آپ نے عرض کیا کہ جب میں صبح وشام حاضر تھا کیوں نہیں ارشاد فرمایا۔ حضرت راجے نے فرمایا یہ طلب کے خلاف ہے۔ الغرض حضرت قطب الاقطاب نے ذکر ثلاثی گنبدی اپنے مرشد (اجازت) کو بتایا۔ حضرت راجے نے پہلی بار قطب الاقطاب سے کم، دوسری بار برابر اور تیسری بار بہتر کیا۔ آپ نے عرض کی کہ اگر حکم ہو تو مانک پور ہی میں رہوں۔ فرمایا یہ چھوٹی جگہ راجے غلام محی الدین کے لیے رہنے دو، تمہیں بڑی جگہ جون پور دیتا ہوں وہیں رہو اور خلق خدا کی ہدایت کرو۔ [ایضا، ص:۴۲]

خانقاہ رشیدیہ

جب حضرت قطب الاقطاب، حضرت راجے سید مجتبیٰ کی بارگاہ سے خرقۂ خلافت کی نعمت عظمیٰ لے کر لوٹے تو آپ نے رشد و ہدایت کی باضابطہ محفل آراستہ کرنے کے لیے خانقاہ رشیدیہ کی بنیاد ڈالی۔ سال کون تھا معلوم نہیں۔ یہ خانقاہ عالیہ پورب رخ دروازہ لیے ہوئے پھوس کی بنی تھی۔ بارش میں چھت ٹپکنے لگی تو لوگوں نے عرض کیا، لگتا ہے چھت اچھی نہیں بنی۔ حضرت نے فرمایا چھت برسات کے لیے نہیں دھوپ روکنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ برسات تو محض چار مہینے رہتی ہے اور دھوپ آٹھ مہینے اس لیے دھوپ ہی سے بچنے کے لیے گھر بنانا چاہیے۔

۱۲۹۰ھ/۱۸۷۱ء کے بے پناہ تباہ کر دینے والے سیلاب میں سارے مکانات کے ساتھ یہ پر تقدس خانقاہ بھی زمین بوس ہوگئی تو خانقاہ رشیدیہ کے چھٹے سجادہ نشین حضرت قطب الہند شیخ غلام معین الدین جون پوری نے اسے پختہ تعمیر کی شکل میں تبدیل کیا جو سفالہ پوش ہی تھی اور رخ بدل کر دروازہ اتر سمت کر دیا۔

تعمیرات اور یادگاریں

خانقاہ معظم میں مغرب کی رخ پر ایک حجرۂ مبارکہ ہے جس میں حضرت قطب الاقطاب کے منجھلے صاحبزادے شیخ بدر الحق محمد ارشد دیوان صاحب نے ریاضات شاقہ کیں۔ حضرت بدر الحق کی ذات گرامی روحانیت کا وہ مرتبۂ عالی رکھتی تھی کہ حضرت قطب الاقطاب دیوان جی سے جب پوچھا گیا کہ آپ اپنے رب کی بارگاہ میں کون سا تحفہ لے جائیں گے، اس پر آپ نے آب دیدہ ہو کر فرمایا: ”دست محمد ارشد گرفتہ پیش خواہم کرد کہ ہمیں راہدیہ آوردہ ام“

[تاریخ سلاطین شرقی وصوفیائے جونپور، ص: ۱۲۲۷، ج ۱]

اس لیے آپ کی نسبت عالی سے یہ حجرہ بہت ہی بابرکت اور اسی طرح محفوظ ہے، اسی میں بزرگوں کے تبرکات، ملبوسات اور دیگر آثار محفوظ رہتے ہیں جن میں حضرت قطب الاقطاب کا خرقہ، کشکول، تلوار، چوبی نعلین، آفتابہ، لوٹہ، حضرت قیام الحق کی صدری، تہہ بند، حضرت قطب الہند کا عمامہ، خرقہ، تیمم کی مٹی اور دیگر بزرگوں کی دولائی اور بستر وغیرہ موجود ہیں۔

خانقاہ عالی سے متصل ذرا ہٹ کر جانب شمال ایک مسجد، ایک پختہ کنواں اور ایک حجرۂ

مبارکہ ہے جس میں حضرت قطب الاقطاب مولیٰ کی یاد میں سرمست رہتے۔ یہ تینوں یادگاریں حضرت قطب الاقطاب ہی کے زمانے کی ہیں۔ اب مسجد کی توسیع کے بعد حجرۂ مبارکہ اسی کے ایک گوشہ میں آ گیا۔ مسجد کے دائیں ہاتھ بالکل متصل ایک چھوٹا سا مدرسہ بھی ہے اور خانقاہ کی مشرقی سمت میں سلیقہ سے جدید دکانوں کا سلسلہ بھی جس کی آمدنی سے خانقاہ کی ضروریات کی کفالت ہوتی ہے۔

خانقاہ کی خصوصیات

دیگر اہم خانقاہوں کی مانند خانقاہ رشیدہ کے سجادہ نشین حضرات بھی فقر وقناعت کے پیکر تھے۔ حرص و آرزو، خود پسندی، خودنمائی، کشف و کرامت کی نمود اور حب جاہ جیسے رذائل نفس سے کوسوں دور رہے۔ بس درس و تربیت، مخلوق خدا کی حاجت روائی، توکل وانابت، صبر وشکر، ایثار واخلاص ہی معرکۂ حیات کے ساز وسامان رہے اور فکر مولیٰ اور ذکر مولیٰ ہی توشۂ زندگی۔

لیکن اس خانقاہ عالیہ کی دو خصوصیتیں بہت اہم ہیں:

پہلی یہ کہ سجادہ نشینی حق وراثت نہیں بلکہ اہل منصب کے انتخاب کے بعد اسے سجادۂ مشیخت پہ بٹھایا جاتا ہے، اگرچہ وہ خاندان سے باہر ہی کا کوئی فرد ہو۔

دوسری یہ کہ معزز خانقاہوں کی طرح یہاں بھی زائرین و واردین کی ضروریات اور ان کے قیام وطعام کا اہتمام مکمل اعزاز اور دلجوئی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ مولیٰ تعالیٰ اس گلشن معرفت کو سدا بہار رکھے۔

خلفائے قطب الاقطاب

سیدنا قطب الاقطاب کی نگاہ کیمیا اثر نے بہت سے دلوں کو ایسا کندن بنا ڈالا تھا کہ جو اس پہ نگاہ اعتبار ڈالتا تو اس کا دل بھی جگمگاہٹ سے معمور ہو جاتا۔ صاحب سمات الاخیار نے چونتیس ایسے جید اور باکمال خلفا کے اسمائے گرامی شمار کرائے ہیں جو جہان محاسن وکمالات تھے اور ایک عالم ان سے فیض یاب ہوا۔ ان میں تین حضرات ایسے ممتاز تھے جنہیں حضرت قطب الاقطاب کی نگاہ ولایت کا انتخاب کہیے:

اول، حضرت میر سید قیام الدین گورکھپوری، دوم، حضرت میر سید محمد جعفر پٹنوی۔ ان

دونوں حضرات کے بارے میں حضرت قطب الاقطاب نے فرمایا تھا کہ: ''قیامت کے دن مریدوں کو پیروں سے شفاعت کی امید ہوگی اور مجھ کو اپنے مرید میر سید جعفر پٹنوی اور میر سید قیام الدین گورکھپوری سے'' سوم، حضرت شیخ یٰسین جھونسوی قدست اسرارہم۔

شیخ یٰسین جھونسوی، حضرت قطب الاقطاب کے ہم درس اور پیر بھائی بھی تھے؛ لیکن تکمیل حضرت قطب الاقطاب کے ذریعے ہوئی۔ حضرت دیوان جی اپنے مرشد کے سجادہ نشین ہونے کی وجہ سے آپ کی بہت تعظیم کرتے تھے۔ بوقت ملاقات جب حضرت شیخ، قطب الاقطاب کی قدم بوسی کے لیے جھکتے تو حضرت بھی آپ کی قدم بوسی کے لیے جھک پڑتے۔ مکاتیب رشیدیہ میں کئی مکاتیب آپ کے نام ہیں۔ حضرت قطب الاقطاب کے ہم درس اور ہم مشرب پیر بھائی ہونے کے باوجود آپ کی نگاہ میں حضرت دیوان جی کی قدر و منزلت کیا تھی؟ وہ اسی سے ظاہر ہے کہ آپ نے حضرت دیوان جی سے خلافت پائی اور مزید آپ کے ان کلمات سے بھی خوب نمایاں جو آپ نے اپنی تصنیف ''مناقب العارفین'' میں حضرت دیوان جی کے تعلق سے تحریر فرمائے ہیں۔ آپ ارقام فرماتے ہیں:

''فرید عصر است، وحید دہر است، در شریعت اسناد است، و در طریقت صاحب ارشاد، مخزن حقائق است، منبع دقائق، طالب مجاہدہ، صاحب مشاہدہ، قطب ولایت است و یگانۂ زماں، غوث وقت است و قبلۂ جہاں، زبدۃ الاخیار، عمدۃ الابرار میاں شیخ عبدالرشید نور اللہ مرقدہ۔'' [سلاطین مشرقی وصوفیائے جونپور، ص:۲۱۹، ج۱]

اب باقی اکتیس خلفائے کرام کے اسمائے گرامی ''سمات الاخیار'' کے حوالے سے پیش ہیں:

(۱) شیخ عبدالمجید (متوفی ۱۰۷۹ھ)، یہ حضرت قطب الاقطاب کے پہلے مرید ہیں جو سرکار غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حکم سے آئے تھے۔ (۲) ملا عبدالشکور منیری متوفی ۱۰۹۰ھ) (۳) شیخ مبارک محی الدین (۴) مولانا نورالدین جون پوری (متوفی ۱۰۹۳ھ) (۵) شیخ آیت اللہ (متوفی ۱۰۷۷ھ) (۶) شیخ نصرت جمال ملتانی (متوفی ۱۰۹۰ھ) آپ ہی نے حضرت قطب الاقطاب کے ملفوظات کا مجموعہ گنج رشیدی کے نام سے ترتیب دیا تھا۔ (۷) شیخ محب اللہ (۸) شیخ عبداللطیف مٹھن پوری (۹) شیخ ہارون رشید، فتح پور، دیوہ (۱۰) میر محمد

صادق جون پوری (۱۱) سید شاہ محی الدین محمد آبادی (۱۲) حاجی شیخ جلال جون پوری (۱۳) ملا محمد نعیم جون پوری (۱۴) شیخ عبدالحیٔ فتح پور، ہسوہ (۱۵) شیخ مرتضیٰ، یہ شیخ عبدالمجید کے صاحبزادے ہیں (۱۶) میر سید شاہ نور پٹنوی (۱۷) شیخ عبداللہ بنگالی (۱۸) شیخ عبدالواحد مشتاق فتح پوری (۱۹) شیخ حبیب اللہ بہاری (۲۰) میر سید سیف الدین مدن پوری (۲۱) شیخ ضیاء الدین پھول پور، الہ آباد (۲۲) شیخ عبدالشکور جون پوری (۲۳) شیخ عبداللہ خویشگی قصوری (۲۴) حضرت میر سید نور پورنوی (۲۵) میر محمد غوث، مندول (۲۶) قاضی محمد مودود جون پوری (۲۷) شیخ راجے صدرالدین، یہ حضرت راجے خضر مانک پوری کے خویش تھے۔ (۲۸) شیخ غلام محی الدین متوکل جون پوری (۲۹) شیخ محمد نصیب منیری (۳۰) میر سید محمد اسمٰعیل سیوانی (۳۱) شیخ محمد ارشد رشید جون پوری (خلف و جانشین)

اولاد امجاد

صاحب بحر زخار کے بیان کے مطابق حضور اقدس سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اشارے پر والدین کریمین نے ۳۲/ سال کی عمر میں حضرت حاجی ارزانی قدس سرہٗ کی صاحبزادی سے آپ کا عقد مسنون کردیا جن سے چار صاحبزادے ہوئے:

(۱) شیخ محمد حمید (۲) شیخ محمد ارشد (۳) شیخ غلام معین الدین (۴) شیخ غلام قطب الدین۔

چاروں شاہ زادے علوم ظاہری اور باطنی سے مالا مال تھے۔ شجاعت و ہمت کے پیکر، اخلاق نبوت کے پرتو اور والد گرامی کے عکس جمیل، لیکن دوسرے صاحبزادے حضرت شیخ محمد ارشد معروف بہ بدرالحق و دیوان صاحب، اپنی نمایاں کسبی اور وہبی خصوصیات کے پیش نظر حضرت قطب الاقطاب کے محبوب نظر اور مرکز توجہ تھے اور آپ ہی حضرت قطب الاقطاب کے جانشین اور سجادہ نشین ہوئے۔

خصائل کریمہ

سیدی الکریم حضرت قطب الاقطاب کی ذات کریم اسوۂ حسنہ کا عکس جمیل تھی۔ ذکر الٰہی سے معمور زبان، فکر الٰہی سے سرشار دل، توکل و انابت، استغنا و قناعت سے لبریز مزاج پایا تھا۔ امرا سے استغنا، فقرا سے اُنس، دنیا سے دوری، دین سے شیفتگی، منکرات سے دور رہے، شبہات

سے بھی احتراز اور مستحبات کا بھی التزام آپ کا شیوہ تھا۔ شریعت پہ استقامت اس درجہ تھی کہ سنت نبوی ہر ہر قدم پر ملحوظ ہوتی۔ ہر کام کا آغاز بسملہ سے فرماتے، ہر چیز کا استعمال دائیں سے، ہر چیز کا رخ قبلہ کی سمت، احتیاط کا یہ عالم کہ ہمیشہ دریا کے پانی سے وضو وغسل فرماتے ورنہ کنویں سے لیتے۔ مٹی کے مکانات بہت پسند، غریب مریدین سے خوشگوار انس، طلبہ کا مشفقانہ احترام، ہر ہر قدم پر تہذیب وشائستگی ساتھ رہتی، لوگوں کے سامنے کبھی پاؤں نہ پھیلا اور ہاتھ بھی دراز نہ ہوسکا، تسلیم ورضا کے پیکر کہ ''ہر چہ از جیب رسد خوب است''۔ امراض وابتلا میں دوا اور تدبیر کا خاصہ اہتمام نہ ہوتا۔ کسی نے دوا لادی استعمال کر لی، ورنہ نبوی علاج شہد اور کلونجی آپ کے لیے ہر مرض کی دوا تھی۔ دواؤں کے خواص کا لحاظ نہ ہوتا، فرماتے کہ ''مؤثر حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہے اگر وہ چاہے تو گرم کو سرد اور سرد کو گرم کر دے۔''

چناں چہ ایک مرتبہ بخار اور دردسر کے عارضہ میں ملا محمود نے علاج کیا، دفع نہ ہوا۔ آپ نے نبوی نسخہ کلونجی اور شہد کا آمیزہ استعمال فرمایا، اچھے ہو گئے۔ ملا محمود کو حیرت ہوئی کہ صفراوی بخار اور یہ گرم دوائیں؟ افاقہ ہوا تو کیوں کر؟

آپ نے فرمایا کہ ''تمہیں اپنی حکمت پر اعتماد اور مجھے اللہ ورسول کے فرمان پر، دوا میں توکل اچھی چیز ہے۔ گو دوا کرنے کا بھی حکم ہے، حدیث شریف میں ہے کہ سرکار اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت کا وہ طبقہ بلا حساب جنت میں جائے گا جو مرض اور بلا میں توکل اختیار کرے گا۔''

غیبت سے حد درجہ احتراز تھا۔ کسی کی خرابی دیکھتے بھی تو اسے اچھے محمل پر محمول فرماتے جیسے رمضان میں کسی کو بے محابہ کھاتے پیتے دیکھ لیا تو سمجھا کوئی مسافر یا بیمار ہے جو بھوک کے غلبہ سے برسر راہ کھانے پر مجبور ہوا۔ خدمت خلق اور ان کی حاجت روائی کی خاطر ہر زحمت گوارہ تھی۔

ایک عامل (گورنر) کو نواب غضنفر خاں نے پانچ ہزار روپیوں کے مطالبے میں قید کر دیا تھا، حضرت قطب الاقطاب قلعہ میں تشریف لے گئے اور فرمایا کہ پانچ ہزار روپیوں کے واسطے آیا ہوں۔ نواب نے روپے منگوا کر پیش کیے۔ آپ نے فرمایا میں اس شخص کی رہائی چاہتا ہوں جس پر پانچ ہزار روپے واجب الادا ہیں۔ نواب نے عرض کیا کہ یہ اور وہ دونوں حاضر ہیں۔ آپ نے روپے واپس کیے اور عامل کو رہا کرا کے ساتھ لیتے آئے۔

یوں ہی ایک مرتبہ آپ سیر کو تشریف لے جا رہے تھے۔ ایک انجان قیدی نے کوتوالی چبوترہ سے آواز دی ''اے فقیر مجھے رہا کراتے جاؤ'' آپ واپس لوٹے اور نواب غضنفر خاں سے کہہ کے رہا کرا دیا۔ جب کہ امرا سے طلب تو دور کی بات ہے، ان کے پاس آمد و رفت سے حضرت کو کس قدر وحشت تھی اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ شاہجہاں جیسے باسطوت بادشاہ کے اصرار پر بھی آپ نے خلوت خانۂ قناعت سے قدم باہر نکالنا گوارہ نہ فرمایا؛ لیکن یہ ساری مشقت خیزی محض اس لیے گوارہ تھی کہ اس میں ایک غریب کا بھلا تھا۔ شجاعت اور غیریت آپ کی علامت تھی۔ تیر اندازی اور تلوار زنی میں طاق تھے۔ تیز اور پیدل چلنے کی عادت، گھوڑے کی سواری محبوب تھی۔ غرض کہ اسوۂ نبی کا حسن جہاں افروز آپ کے پورے وجود پر چھایا ہوا تھا۔

تصرفات

ایسے باطنی اور ظاہری کمالات جس دل میں موجود ہوں گے، وہ کس قدر روشن ہوگا یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ سیدنا قطب الاقطاب ایسے صاحب کشف تھے کہ مدعائے دلی کے اظہار کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ روشن ضمیری ایسی تھی کہ دلوں کے خطرات، نیتوں کے حالات، باطنی امور، در پوشیدہ معاملات رب منعام نے آپ پر روشن فرما دیے تھے۔

چہ از صفائے ارادت زنم بمہر تودم
ضمیر پاک دل روشنت گوارہ من است

حضرت کے تذکرہ نگاروں نے کشف اور تصرفات کے کثیر وقائع ذکر کیے۔ فقیر بھی چند ذکر کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہے۔

حضرت (قطب الاقطاب) کے چھوٹے صاحبزادے حضرت شیخ غلام قطب الدین ج قدس سرہٗ (۱۰۶۷ھ-۱۱۵۷ھ) فضائل و کمالات کے جامع تھے۔ جس دن حضرت قطب الاقطاب قدس سرہٗ نے اپنے تیسرے صاحبزادے شیخ غلام معین الدین کو خرقہ عنایت فرمایا تو حضرت شیخ غلام قطب الدین کے دل میں بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ اے کاش! یہ سعادت مجھے بھی ملتی، حضرت دیوان جی نے فوراً آپ کی طرف دیکھ کر ایک شخص سے فرمایا کہ شیخ یٰسین کی بھیجی ہوئی دونوں کالی لنگیاں اٹھا لاؤ۔ جب دونوں لنگیاں آگئیں تو فرمایا کہ ''تھوڑے دنوں سے ایک

میرے کاندھے پر رہا کرتی تھی اور دوسری غسل اور تہبند کے مصرف میں تھی تو اسی کو خرقہ سمجھو اور خرقہ کی طرح پہنو۔" یہ فرما کر اپنے دست مبارک سے اوڑھایا۔ حضرت شیخ غلام قطب الدین قدس سرہٗ قدم بوس ہوئے۔ پھر حضرت نے اس کے بعد استعمالی دستار بھی مرحمت فرمائی تھی۔

[سمات الاخیار، ص:۵۸]

کشف کا دوسرا منظر یہ واقعہ پیش کرتا ہے:

قاضی شہر شیخ محمد حسین نے حضرت سے عرض کی کہ گذری کی سیر چھوڑ دیجیے۔ آپ نے فرمایا کہ آپ تمباکو پینا چھوڑ دیجیے تو میں گذری کی سیر چھوڑ دوں۔ دونوں حضرات نے حامی بھر لی اور کچھ دن اس معاہدے پر قائم رہے۔ ایک رات بارش ہو رہی تھی قاضی صاحب کو حقہ کی خواہش ایسی ہوئی کہ ضبط نہ کر سکے اور حقہ منگوا کے پی ہی لی۔ صبح کو حضرت بھی گذری کی سیر کر آئے۔ قاضی صاحب کو جب اس سیر کی اطلاع ہوئی تو حاضر ہو کر عرض کی حضرت! مجھے سیر کی خبر مل گئی۔ حضرت نے فرمایا آپ نے جب معاہدہ توڑ کے رات کو حقہ پی لیا تو پھر دن کو اگر سیر کر آیا تو کیا بے جا کیا۔ [ایضا، ص:۴۹]

سچا مرشد ہر آرے وقت میں مریدین کے کام آتا ہے۔ مولیٰ تعالیٰ اپنے بندوں کو ایسے تصرفات کی قوت دیتا ہے۔ جس پر کتاب وسنت اور آثار کے سینکڑوں شواہد موجود ہیں۔

حضرت قطب الاقطاب مرشد ہی نہیں شیخ ایصال تھے۔ اس لیے آپ کا فیضان کرم آپ کے جانشینوں میں بھی منتقل ہوتا رہا۔

صاحب سمات الاخیار لکھتے ہیں کہ:

"مشائخ سلسلہ عالیہ رشیدیہ اپنے سچے مریدوں کی مشکلوں کے وقت بہت امداد فرمایا کرتے ہیں بالخصوص مرتے دم تو سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ میں نے اس کے اکثر مریدوں کو دیکھا ہے کہ ان کی حالت زندگی میں اگر چہ خراب تھی مگر ان کا خاتمہ قابل رشک ہوتا دیکھا گیا۔"

[سمات الاخیار، ص:۲۲]

اور ایسا کیوں نہ ہو کہ قادری اور چشتی فیضان کا دو آتشہ مشکلات کو کب ٹکنے دیتا ہے۔ حضرت قطب الاقطاب کی دستگیری کے واقعات سے آپ کی حیات طیبہ کے لمحات بھرے پڑے

ہیں۔ چند مشاہدات شاہداں اس کی شہادت کے لیے کافی ہیں۔

(۱) حضرت قطب الاقطاب کے ایک عقیدت مند کو جنگل میں شیر نے آ گھیرا، اس ناگہانی مصیبت سے نجات کے لیے اس نے حضرت کو دل میں یاد کیا۔ آپ اس وقت اپنی خانقاہ میں تھے اور بیت الخلا کے لیے جا رہے تھے کہ یکا یک آپ نے ہاتھ کا لوٹا کھینچ کر دیوار پر زور سے مارا۔ حاضرین کو حیرت ہوئی۔ استفسار پر صورت حال بیان فرمائی۔ پھر اس شخص نے حاضر ہو کر اس دستگیری کا واقعہ بیان کیا تو اس دن اور وقت کے مطابق نکلا۔

(۲) حضرت کے ایک مرید کا جہاز ڈوب رہا تھا۔ اس نے تباہی سامنے دیکھ کر حضرت سے استمداد کی۔ اور یہاں خانقاہ عالیہ میں یہ منظر دیکھنے میں آیا کہ بیٹھے بیٹھے حضرت کا پیرہن تر ہو گیا۔ حاضرین کو حیرت ہوئی؛ لیکن استفسار کی ہمت نہ ہوئی پھر جب اس شخص نے آ کر صورت حال بیان کی اور شکر گزار ہوا کہ حضرت کی بروقت دستگیری سے ہمارا سفینہ ساحل نجات سے ہم کنار ہوا، تب جا کر لوگوں کو پیراہن کے تر ہونے کا سبب معلوم ہوا۔

اب تصرف کا ایک دوسرا انداز دیکھیے، بزرگان دین کس طور سے ذہنی رجحانات کو مولیٰ کی جانب پھیرتے ہیں۔

محمد آباد میں جس کا عرفی نام بنارس ہے، ایک برہمن یہ چمتکار لوگوں کو دکھلاتا تھا کہ خالی ہاتھ لوگوں کے سامنے پھیلاتا اور غائبانہ سے کوئی چیز اس کے ہاتھ میں آ جاتی۔ اس سے وہ عوام پر اپنا رعب تصرف جما کر اعتقاد میں فساد پیدا کرنا چاہتا تھا۔ حضرت دیوان جی بھی ایک روز اس کے امتحان کے لیے تشریف لے گئے۔ تین مرتبہ اس نے ہاتھ بڑھایا؛ لیکن کچھ ہاتھ نہ آیا۔ حضرت شاہ یٰسین نے اس کی وجہ پوچھی، آپ نے مسکرا کے فرمایا:

''قرآن صحیح پڑھنے والوں سے شیاطین بھاگتے ہیں۔'' [ایضاً، ص: ۵۰]

یوں ہی سورجمن ایک برہمن حضرت کا ہمسایہ تھا۔ اکثر آپ کی خدمت میں آیا کرتا تھا۔ آپ اس سے ادھر ادھر کی باتیں نجوم کے متعلق کیا کرتے تھے۔ بارش کے دنوں میں اس سے پوچھتے کہ آج رات کو پانی برسے گا کہ نہیں؟ اگر اس نے بتایا کہ پانی برسے گا تو آپ مؤذن سے فرماتے کہ مسجد کی صف نہ اٹھانا۔ اس روز پانی نہیں برستا تھا اور جس روز وہ کہتا تھا کہ آج نہیں

برسے گا، حضرت حکم دیتے۔ تھے کہ نماز کے بعد جانماز اٹھا دینا اور واقعی اس رات میں بارش ہوتی تھی۔ اس طرح آپ اکثر اس کے بتائے ہوئے کی مخالفت فرماتے تھے۔ اس سے غرض یہ تھی کہ علم نجوم پر کوئی اعتبار نہ کرے۔ آپ فرماتے تھے کہ منجموں کے کہنے پر نہ اعتقاد رکھنا چاہیے نہ عمل کرنا چاہیے بلکہ شریعت پر ثابت قدم رہنا چاہیے۔ [سمات الاخیار، ص: ۵۰-۵۱]

سبحان اللہ! انہیں صلحائے امت اور بزرگان دین کا فیض قدم ہے کہ آج ہمارے اعتقادات سلامت ہیں۔ انہیں کے دم سے اسلام پھیلا، ہدایت ملی اور مشکوٰۃ نبوت کی کرنوں سے ہمارے دل کے نہاں خانوں میں چراغاں ہوا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

وصال

سیدنا قطب الاقطاب محمد رشید مصطفیٰ اخیر وقت تک فرائض و واجبات اور دیگر معمولات کے پابند رہے۔ جب کہ نقاہت کافی بڑھ چکی تھی۔ شعبان کے اخیر میں بخار آنا شروع ہوا اور پھر اتر نہ سکا، حالاں کہ معالجہ کی ساری تدبیریں اختیار کی گئیں، آٹھویں رمضان کو ظہر کے وقت آپ نے وضو فرما کر تخت پر جماعت کے ساتھ نماز پڑھی۔ مغرب اور عشا کی نماز بھی اسی حالت میں ادا ہوئی۔ عشا کی نماز کے بعد کرب اور بڑھا اور بالکل سکت باقی نہ رہی مگر آدھی رات کے بعد تیمم کا ظرف منگوا کر تیمّم فرمایا اور نماز تہجد، صلوٰۃ العشق اور نوافل وغیرہ ادا کر کے ذکر جہر میں مصروف ہوئے۔ آواز اتنی بلند تھی کہ اچھی طرح سنی جاتی تھی۔ اس کے بعد آپ نے نماز فجر کی نیت کی، لوگوں نے عرض کی کہ ابھی وقت نہیں ہوا ہے۔ فرمایا میاں ہو گیا ہے۔ جب تین گھڑی رات باقی تھی تو اپنے عزیز ترین صاحبزادے حضرت بدر الحق شیخ محمد ارشد دیوان صاحب کا ہاتھ تھام کے ٹیک کر بیٹھے۔ حضرت بدر الحق ظرف تیمّم سامنے لے کر کھڑے ہوئے، آپ نے بڑی مشکل سے دو ضربیں لگائیں۔ حضرت بدر الحق، حضرت کی یہ حالت دیکھ نہ سکے اور تیمّم کا ظرف ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ حضرت نے جب تیسری ضرب لگائی تو پلنگ کی چادر پر پڑی، آپ فوراً لیٹ گئے۔ صبح صادق ہو چکی تھی۔ حضرت شیخ محمد حمید اور حضرت شیخ محمد ارشد نے ادھر اٹھ کر فجر کی سنتیں اور فرض ادا کیے اور ادھر عالم جاوید کے مسافر کا سفینۂ حیات ساحل فانی سے لنگر اٹھا چکا تھا۔

صاحبزادوں نے واپس آ کر روئے اقدس سے چادر ہٹائی تو ایک پرسکون نورانی طمانیت کی چاندنی چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔ شاہ زادوں نے ہر چند آوازیں دیں ''ارے میرے دیوان جیو ارے میرے دیوان جیو کچھ تو کہو'' لیکن نعمت وصال سے سرشار نفس مطمئنہ کب پلٹ کر دیکھنے والی؟ اناللہ وانا الیہ راجعون.

بعض روایات میں ہے کہ نماز فجر کا سلام پھیرنے کے بعد وصال فرمایا اور شہرت اس روایت کو ہے کہ پہلی رکعت کے دوسرے سجدے میں یا دوسری رکعت کے پہلے سجدہ میں لذت وصال سے شاد کام ہوئے۔ یوں ۹ر رمضان مبارک ۱۰۸۳ھ جمعہ کی صبح کو ہدایت وتقویٰ، عشق ومعرفت، علم وفضل اور اخلاص وایثار کا دمکتا سورج موت کے افق میں غروب ہوگیا، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ لیکن ؎

فنا کے بعد بھی باقی ہے شان رہبری تیری
خدا کی رحمتیں ہوں اے امیر کارواں تجھ پر

شیخ محمد ماہ دیوگامی قدس سرہٗ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی اور شیخ محمد ارشد وملا ملتانی کے ساتھ قبر میں بھی اترے۔ تدفین میں پہلے بیر کے تختے دیے گئے پھر وصیت کے مطابق ان پتھروں کا تختہ دیا گیا جن طلبہ کی جوتیاں اترتی تھیں۔ مزار مبارک رشید آباد شریف، ضلع جون پور میں واقع اور مرجع خلائق ہے۔

☆☆☆

حضرت قطب الاقطاب کے اوصاف وخصائل

محمد عبد المبین نعمانی قادری

تصوف اور صوفیہ پر بے شمار کتابیں معرض تحریر میں آچکی ہیں۔ یوں ہی تصوف کیا ہے اور صوفیہ کس گروہ کو کہتے ہیں اس موضوع پر بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ میں نے اس کا خلاصہ یہ کیا ہے:

تصوف: ایمان کے بعد اتباع شریعت وسنت میں کمال پیدا کرنے کا نام ہے۔ احکام شریعت کی ظاہری پابندی کے ساتھ باطن کے سنوارنے کو تصوف سے تعبیر کرتے ہیں۔ اب اس میں جو جتنی ترقی کرتا ہے، اتنا ہی بڑا صوفی کہلاتا ہے۔ اسی کو تزکیۂ نفس بھی کہتے ہیں۔ تخلق باخلاق اللہ کو تصوف کہتے ہیں۔ حضور معلم اخلاق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جملہ اخلاق حسنہ سے اپنے کو آراستہ کرنا بھی اس میں آگیا۔ اسی لیے بعض اکابر صوفیہ نے فرمایا ہے:

"التصوف هو الخلق." (تصوف سراپا خلق یعنی خلق حسن کا نام ہے)

جملہ اعمال اور افعال میں اخلاص اور حسن نیت کو تصوف کہا جاتا ہے۔ اسی بات کو سلطان المشائخ شیخ نظام الدین اولیا یوں فرماتے ہیں:

"جو کچھ مردان خدا کرتے ہیں، وہ خدا کے لیے کرتے ہیں" [فوائد الفواد مترجم، ص: ۶۸]

تصوف کا فائدہ رجوع الی اللہ اور تعلق باللہ کا حصول ہے اور یہی بندۂ مومن کی معراج ہے۔

☆ مہتمم دار العلوم قادریہ چریا کوٹ، مئو

اس کا دوسرا نام عرفان ہے اور جو اس مقام عرفان پر فائز ہوتا ہے، اس کو عارف باللہ کہتے ہیں۔

جتنے سلاسل طریقت ہیں، سب کا مطمح نظر اور مقصود وصول الی اللہ ہی ہے۔ طریقۂ تربیت وسلوک اور اوراد و وظائف میں چاہے جس قدر بھی اختلاف ہو۔ یوں ہی خدمت خلق اور عبادت خالق سے کسی کو چھٹکارا نہیں اور یہی دونوں چیزیں صوفیہ واولیا کی زندگی میں نمایاں طور پر پائی جاتی ہیں۔ ہاں بعض صوفیہ وہ بھی ہوتے ہیں جو تجرد اور گوشہ نشینی کو اختیار کرتے ہیں۔ وہ شاید کہتے ہیں کہ ''ہمیں رجوع الی اللہ سے فرصت کہاں کہ خدمت خلق کی طرف توجہ دیں''، اس فکر کے حامل صوفیہ کی تعداد بہت ہی قلیل ہے۔

علما، فقہا اور صوفیہ ہر ایک طبقے نے اپنے اپنے انداز سے دین پاک اور مخلوق خدا کی خدمت کی ہے۔ مگر اسلام کے فروغ میں صوفیۂ کرام نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور عالمی پیمانے پر صوفیہ کی تاریخ اور ان کے کارنامے ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں۔ ہندوستان کے مورخین بھی اس میں پیچھے نہیں۔

ہندوستان میں ایک سے ایک اولیا وصوفیا پیدا ہوئے اور کچھ باہر سے بھی آئے۔ ان کی ایک طویل تاریخ ہے۔ بہت سی خانقاہیں اپنے اثرات اور افادیت کھو چکی ہیں، لیکن بہت سی زندہ اور بافیض ہیں۔ انہیں میں ایک خانقاہ رشیدیہ، جون پور بھی ہے جس کے موجودہ سجادہ نشین، فاضل معقولات ومنقولات، مدرس کامل حضرت علامہ مفتی عبید الرحمٰن رشیدی پورنوی دامت برکاتہم العالیہ ہیں جو خانقاہ رشیدیہ، جون پور کے علاوہ بیک وقت خانقاہ مصطفائیہ، درگاہ چمنی بازار، پورنیہ، خانقاہ طیبیہ معینیہ، منڈواڈیہہ، بنارس، خانقاہ تکیہ حیدری، بھمن برہ، سیوان، خانقاہ علیمیہ، غازی پور کے بھی سجادہ نشیں اور فیض بخش خواص وعوام ہیں اور سلسلۂ رشیدیہ اس وقت آپ کی وساطت سے کافی فروغ پا رہا ہے۔ مریدین ومسترشدین کی آپ تربیت بھی فرما رہے ہیں اور اس سلسلۂ عالیہ کی اہم خصوصیت فروغ علم دین پر بھی بھرپور توجہ دے رہے ہیں۔ خانقاہ طیبیہ معینیہ منڈواڈیہہ بنارس میں ایک شاندار دار العلوم قائم فرمائے ہیں، جہاں عالمیت تک کی اچھی تعلیم کا بندوبست ہے۔ خانقاہ رشیدیہ جون پور میں بھی ایک مدرسہ قائم ہے اور دار العلوم سرکار آسی سکندر پور کی سرپرستی بھی فرما رہے ہیں۔

بانی سلسلہ رشیدیہ، قطب الاقطاب حضرت علامہ شیخ محمد رشید مصطفیٰ عثمانی جون پوری، اپنے عہد کے عمدۃ العلما تھے۔ درس وتدریس آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ درسی کتاب، مناظرۂ رشیدیہ'' جوفن مناظرہ میں ایک بے نظیر اور بے مثل کتاب ہے اور ہند وپاک کے جملہ مدارس میں داخل نصاب، اس کتاب کی مقبولیت میں مصنف کا اخلاص پورے طور پر کارفرما ہے اور مصنف کی قابلیت بھی ہویدا۔

چوں کہ اس سلسلے کے بانی ہی روحانیت کے تاجدار ہوتے ہوئے میدان تحقیق وتدریس کے شہسوار بھی تھے۔ اس لیے اس خاندان میں علم باطن کے ساتھ علم ظاہر پر بھی ہمیشہ توجہ دی جاتی رہی ہے اور اس سلسلے میں ایک سے ایک عالم، فاضل اور محقق گزرے ہیں۔

بانی سلسلہ کا ایک عجیب وغریب واقعہ ہدیۂ ناظرین ہے:

آپ سات برس کی عمر میں اپنے والد گرامی منزلت حضرت شیخ مصطفیٰ جمال الحق علیہ الرحمہ سے سلسلہ چشتیہ میں مرید ہوئے تھے اور اجازت وخلافت بھی حاصل تھی۔ ایک مرتبہ جب آپ روحانیت وسلوک کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ قطب بنارس حضرت مخدوم شیخ طیب بنارسی علیہ الرحمہ (متوفی ۱۰۴۲ھ) جون پور تشریف لے گئے۔ آپ نے حضرت مخدوم سے ملاقات کی اور یہ آپ کی پہلی ملاقات تھی۔ لہٰذا پورا میلان نہ ہوا، پھر ایک بار بنارس منڈواڈیہ ایک تقریب میں جانا ہوا تو حضرت مخدوم سے ملے۔ اس بار دل میں حضرت مخدوم کی محبت گھر کر گئی۔ کچھ دن روحانی استفادے کی غرض سے حضرت مخدوم شاہ طیب بنارسی فاروقی علیہ الرحمہ کی خدمت میں رہنے لگے اور درس وتدریس کا مشغلہ ترک کر دیا تو حضرت مخدوم نے اس بات کو پسند نہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ''تم صبح کے وظیفے کے بدلے طلبہ کو سبق پڑھایا کرو کہ یہ بھی عبادت ہے اور جون پور کے لیے رخصت کر دیا'' [سمات الاخیار، عبدالمجید کاتب مصطفیٰ آبادی، ص:۳۶-۳۷]

حضرت قطب الاقطاب کو سلسلۂ چشتیہ میں بیعت وخلافت اپنے والد حضرت شیخ محمد رشید مصطفیٰ سے حاصل تھی اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کی اجازت وخلافت مخدوم شیخ طیب فاروقی بنارسی سے حاصل تھی اور سلسلۂ قادریہ شمسیہ کی اجازت وخلافت میر سید شمس الدین کالپی بخاری نے خود عطا فرمائی تھی۔ اور سلسلۂ قلندریہ کی خلافت شیخ عبدالقدوس قلندر جون پوری سے ملی اور سلسلۂ

فردوسیہ ومداریہ کی تعلیمات بھی حضرت شیخ عبدالقدوس قلندر سے حاصل ہوئی۔ سمات الاخیار میں تمام اجازت نامے اور شجرے موجود ہیں سوائے فردوسیہ ومداریہ کے۔

حضرت راجیسید احمد مجتبیٰ مانک پوری قدس سرہ سے بھی سلسلۂ قادریہ چشتیہ کی اجازت طلب کی، صرف چشتیہ نظامیہ کا شجرہ سمات الاخیار میں ہے اور آپ کو سلسلۂ سہروردیہ حضرت شیخ تاج الدین جھونسوی کی روح سے پہنچا۔

سلاسل کی اجازت وخلافت کے علاوہ خاص خاص اوراد و وظائف کی اجازتیں بھی اپنے عصر کے علماوصوفیہ سے حاصل کیں۔ تفصیلات سمات الاخیار میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ جس طرح قطب الاقطاب شیخ محمد رشید مصطفیٰ جون پوری حصولِ خلافت واجازت اور طلبِ فیض و برکت میں حریص تھے اور جس بزرگ کی شہرت سنتے اور اطمینان کرتے ان سے طالب فیض ہوتے، اسی طرح تربیت طالبین ومسترشدین کے معاملے میں سخی واقع ہوئے تھے۔ طالبان علوم ظاہر کو بھی نوازتے اور سالکین راہ طریقت کو بھی فیض یاب کرتے، یہ بہت بڑی خصوصیت ہے اس سلسلۂ عالیہ رشیدیہ کی اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

تصوف میں اخلاص، ریا سے اجتناب، حاجت برآری، خدمت خلق، عجب سے گریز، تکبر سے پرہیز، تواضع وانکساری، دنیاداری سے دوری، امراوسلاطین سے بے نیازی، یہ وہ اوصاف ہیں جو تصوف کی جان اور صوفیہ کی شان ہیں۔

الحمدللہ! یہ ساری صفات خانقاہ رشیدیہ کے اورنگ نشینان کی ہمت بلند کے ہمیشہ نخچیر رہے ہیں اور یہی خصوصیات واوصاف آج بھی اپنا جلوہ بکھیر رہے ہیں جیسا کہ واقعات شاہد ہیں؛ لیکن ان کو پردۂ خفا میں رکھنا ہی فی الحال مناسب ہے۔ تواضع وانکساری اور شہرت ونا موری سے بُعد ودوری اس خانقاہ کی اہم خصوصیات سے ہیں۔ یہ کیوں نہ ہو کہ بانی خانقاہ رشیدیہ نے اس میں بیج ہی ایسا ڈالا ہے اور اپنا کردار وعمل ہی ایسا پیش فرمایا ہے کہ گویا تواضع اور شہرت سے دوری اس خانقاہ کی گھٹی میں موجود ہے۔

حضرت دیوان محمد رشید جون پوری ان خصوصیات ومحامد کے حامل تھے جن کا اجتماع بڑی مشکل سے کسی شخص میں ہوتا ہے۔ آپ کی سیرت اور اخلاق کا ایک اجمالی نقشہ پیش کیا جاتا ہے،

ملاحظہ کریں:

(۱) حضرت قطب الاقطاب دیوان محمد رشید مصطفیٰ قدس سرہ ایک عالم عامل اور درویش کامل تھے

(۲) شیخ اکبر محی الدین ابن العربی سے متاثر تھے اور آپ کی تصانیف کو مطالعے میں رکھتے، خاص طور سے ''فصوص الحکم'' کو مطالعے میں رکھتے اور اس کا درس دیتے، اس کے حقائق و دقائق سے آپ اچھی طرح واقف تھے۔

(۳) تمام شب عبادت میں گزارتے

(۴) اٹھتے بیٹھتے اسم جلالت ''اللہ'' کا ورد زبان میں جاری رکھتے

(۵) قناعت و استغنا مزاج میں بہت زیادہ تھا

(۶) کیمیا بنانا پسند نہیں فرماتے

(۷) حساب کسی سے نہیں لیتے

(۸) سلاطین و امرا کے در پر نہیں جاتے اور ہاں اگر کسی سید یا غریب کی حاجت امرا سے ہوتی تو بلا تامل جا کر رفع حاجت فرماتے، کوئی سید قید ہوتا تو چھڑا لاتے

(۹) دنیا داروں کو اپنی طرف سے خط نہیں لکھتے

(۱۰) قاضی (جج) سے کسی معاملے میں سفارش نہیں کرتے

(۱۱) جس خط میں شکایتی کلمات ہوتے، اس کا جواب نہیں دیتے

(۱۲) جس کام کو شروع فرماتے، ادھورا نہیں چھوڑتے

(۱۳) کل کا لفظ بغیر ان شاء اللہ ملائے نہیں بولتے، اس میں اتباع سنت اور حکم قرآنی پر عمل ہے

(۱۴) اسلامی تہذیب اور ادب کا لحاظ بہت کرتے حتیٰ کہ عام لوگوں کے سامنے کبھی پاؤں نہیں پھیلاتے

(۱۵) کسی معاملے میں فیصلہ کرتے وقت دوست آشنا کی ہرگز رعایت نہ فرماتے

(۱۶) دنیا کے کاموں میں ذرا دخل نہیں دیتے (یعنی لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیتے کہ وہ اپنی صواب دید پر جو چاہیں کریں)

(۱۷) اکابر (بزرگوں) کی پیروی کا ہر کام میں لحاظ کرتے

(۱۸) اتباع سنت نبوی کا کامل اہتمام فرماتے اور سرکار اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قدم بہ

قدم چلنے کی پوری سعی کرتے

(۱۹) ہر کام میں بسم اللہ کا التزام فرماتے

(۲۰) جس چیز کو رکھتے، قبلہ رو کر کے رکھتے

(۲۱) زہد اور تقویٰ اس درجے کا تھا کہ ہمیشہ دریا کے پانی سے غسل اور وضو فرماتے۔ اگر کسی جگہ یہ میسر نہ ہوتا کنویں کے پانی کا استعمال کرتے مگر قدرت کے وقت نمازوں کا اعادہ فرماتے۔ اللہ اکبر! یہ شان تقویٰ کی۔

(۲۲) کچے مکانوں سے بہت خوش ہوتے، پکے مکان پسند نہ فرماتے

(۲۳) مریدوں کو نماز اور عبادت کی تعلیم و تلقین برابر فرماتے

(۲۴) مرشد گرامی مخدوم شاہ طیب بنارسی کے گاؤں شیخ پورہ (الہٰ آباد) کے طلبہ کو بہت مانتے

(۲۵) تسلیم و رضا کا حال یہ تھا کہ جو کچھ کھانا مل گیا کھالیا، جو پہننے کو مل گیا پہن لیا، اگر کبھی بیمار پڑتے دوا کا خود اہتمام نہ فرماتے۔ اگر کوئی تیار کر کے دوا دے دیتا پی لیتے

(۲۶) ہر مرض میں شہد اور کلونجی (منگریلا) استعمال فرماتے اور اس سے شفا ہو جاتی

(۲۷) دواؤں کے خواص و افعال پر اعتقا نہیں فرماتے اور کہتے یہ اقوال حکما ہیں جب کہ موثر حقیقی تو اللہ ہے۔ اگر وہ چاہے سرد کو گرم اور گرم کو سرد کر دے۔ ایک بار بخار ہوا، دوا سے آرام نہیں ہوا۔ آپ نے وہی شہد اور کلونجی باہم ملا کر چاٹ لیا۔ اچھے ہو گئے۔ ملا محمود جون پوری کو تعجب ہوا کہ گرم دوا صفراوی تپ (بخار) میں کیسے مفید ہوئی۔ آپ نے فرمایا "تم کو حکما کے قول پر اعتقاد ہے اور مجھ کو خدا اور رسول کے قول پر۔"

(۲۸) عملیات اور دعوت وغیرہ سے سخت نفرت تھی۔ (دعوت ان دعاؤں کو کہتے ہیں جو جادو کا کام کریں یعنی بسرعت اور عمل وہ ہے جس سے جنات (موکل) تابع ہوں)

فرماتے جو دعوت پڑھتا ہے، وہ فقیر نہیں۔ ایک عامل آپ کے مرید ہونے کو آیا۔ آپ نے فرمایا کہ "موکل کو چھوڑ دو تو مرید کروں گا"۔ پھر جب اس نے موکلوں کو چھوڑا تو آپ نے اسے مرید فرمایا۔

(۲۹) کسی کی ضمانت آپ نہ فرماتے، کیوں کہ ضمانت سلسلہ چشتیہ میں ممنوع ہے

(۳۰) سماع سے آپ کو انکار نہ تھا مگر شریعت کی پابندی غالب تھی
(۳۱) بہ نسبت پالکی کے گھوڑے کی سواری پسند تھی
(۳۲) اکثر پیدل چلتے اور تیز چلتے، نماز فجر کے بعد جون پور سے چلتے اور منڈواڈیہہ ظہر کے وقت پہنچ جاتے
(۳۳) جو کچھ فتوح (نذرانے) ملتے، اس کو خوشی اور عزت سے لیتے
(۳۴) آپ کسی کی غیبت نہیں سنتے، اگر کوئی ناواقف آپ کی مجلس میں غیبت کر بیٹھتا تو آپ بیزار ہوتے اور ناگواری کا اظہار کرتے اور اس کی کسی اچھی بات سے تاویل کرتے
(۳۵) آپ میں شجاعت و دلیری بھی تھی، تیر اندازی کا فن خوب جانتے تھے، کبھی کبھی تلوار بھی باندھتے تھے
(۳۶) حقے کو ناپسند فرماتے

حضرت قطب الاقطاب کے یہاں چند اقوال زریں بھی پیش کیے جاتے ہیں جو بلاشبہ سالکین معرفت اور وطالبین حقیقت کے لیے رہ نما اصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

(۱) سالک کو چاہیے کہ صف نعال میں بیٹھے تا کہ اپنے کو پستی میں دیکھ کر بلندی کی طرف ترقی کرے اور شیخ کو چاہیے کہ صدر میں بیٹھے تا کہ نعال نشینوں (حاشیہ کے بیٹھنے والوں) کی طرف متوجہ ہو اور ان کی تعلیم و ترقی کی کوشش کرے۔
(۲) طلب کامل وہی ہے جسے اپنی زبان سے کہنے کی نوبت نہ آئے اور شیخ خود اس کی غرض کی طرف توجہ کرے۔
(۳) خرقہ اس شخص کو پہننا چاہیے کہ جس قدر سوئیاں کہ خرقہ میں چبھوئی گئی ہیں اگر اس کے بدن میں ناحق چبھوئی جائیں تو تحمل (برداشت) کرے۔
(۴) گودڑی (بزرگوں کا لباس) پہن کر دنیاداروں کے ساتھ یا گانے کی مجلس میں بیٹھنا اچھا نہیں۔
(۵) ملکی ہونا سالک کا کام نہیں، کیوں کہ باعتبار سلوک ملکیت میں تنزل ہے، اس لیے کہ سلوک (۱۱۶) کے عدد ملکی (۱۰۰) کے عدد سے زیادہ ہیں۔
(۶) پیر کا عرس مرید کی عید ہے

(۷) جو شخص بزرگوں کی فاتحہ کا تبرک کھاتا ہے سال آئندہ تک اس بزرگ کی پناہ میں رہتا ہے۔

(۸) آدمی کو چاہیے کہ کسی کو بلا میں گرفتار دیکھ کر نہ ہنسے، بلکہ دعا و استغفار کرے اور اپنی سلامتی و صحت پر خدا کا شکر ادا کرے۔

(۹) مومن کو چاہیے کہ بلاؤں میں مبتلا ہونے کے ڈر سے تضرع کیا کرے۔ شاید رحیم مطلق (رب عز و جل) کے رحم کے سبب بلا سے محفوظ رہے۔ مگر صابر رہنا چاہیے یعنی اگر بلا میں پڑ گیا تو صبر کرے۔

(۱۰) جو عمارت حاجت سے زیادہ ہو، قیامت کے دن تعمیر کرانے والے کے کاندھے پر رکھی جائے گی۔

(۱۱) استحکام (مضبوطی) کے لیے جو لوگ نیو (بنیاد) کو عمیق (گہری) کھدواتے ہیں، بڑی حماقت کرتے ہیں، کیوں کہ فانی چیز کو باقی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ بھی دوسروں کے لیے۔

(۱۲) کسی نے مسجد بنواتے وقت عرض کیا کہ اس کی دیوار اینٹ کی ہوتی تو اچھی تھی۔ فرمایا میری حیات سے تو مضبوط ہی ہے۔

(۱۳) اہل دنیا چاہتے ہیں کہ فقرا کو دو ایک ملاقات میں پہچان لیں، یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ فقیر کو غیر فقیر پہنچان لے۔' [ماخوذ از سمات الاخیار]

میں نے پہلے ہی عرض کر دیا ہے کہ خانوادۂ رشیدیہ علم ظاہر و باطن کا شروع ہی سے سنگم رہا ہے۔ اس خانقاہ کے خلفا و سجادہ نشینان نے درس و تدریس کا مشغلہ جاری رکھا اور ساتھ ہی تصوف کی تعلیم بھی دی۔ حضرت دیوان جی شیخ محمد رشید مصطفیٰ عثمانی سے لے کر آج تک یہ خانقاہ آباد و بافیض ہے اور علم و فضل کی آماجگاہ بھی۔ اس خانقاہ نے ہندوستان کے بہت سے خطوں کو اسلام سے روشناس کرایا اور اشاعت اسلام کی خدمت بھی انجام دی۔ طالبان طریقت کو سلوک کی تعلیم دی اور بہتوں کو تکمیل کی منزل سے آشنا کیا۔ افادہ و استفادہ میں اس سلسلے کے مشائخ بالکل بے تعصب رہے ہیں۔ جہاں سے جو ملا، لینے کی کوشش کی اور جس کسی نے طلب کا ہاتھ بڑھایا، اس کی آرزو برآری کی، تواضع و فروتنی کو بطور خاص فروغ دیا اور تکبر کی لعنت سے اپنے مریدین کو دور رکھا۔ فقر کامل سے خود کو مرصع کیا اور دوسروں کو تعلیم دی۔ دوسروں کی ہمدردی و غمگساری کو ہمیشہ مطمح

نظر رکھا اور متعلقین کو اس کی تلقین کی۔ فقر و عرفان کی ترویج و اشاعت میں خاندان رشیدی کی نمایاں خدمات ہیں جنھیں تفصیل درکار ہو وہ "سمات الاخیار" کا مطالعہ کریں۔ یہ کتاب خاندان رشیدی کی سچی تصویر ہے جسے منظر عام پر آنا اور عام ہونا چاہیے۔

اس کتاب میں اس عہد زریں کی پوری تاریخ ثبت ہے، جس وقت خانقاہ رشیدیہ کی بنیاد پڑ رہی تھی، اس میں ضمناً خلفا و مجازین خانقاہ کے احوال بھی درج ہیں۔ اس طرح صوفیۂ ہند کا تذکرہ بھی اس کتاب میں آ گیا ہے۔ خانقاہ رشیدی کے اثرات کہاں کہاں تک پہنچے اور کہاں کہاں روحانی انقلاب برپا ہوا، اس کی پوری تفصیل اس میں ضبط کی گئی ہے۔ جگہ جگہ حاشیے میں بھی بہت سے بزرگوں کے حالات قلم بند ہیں۔

آخر دور میں حضرت مولانا شاہ عبدالعلیم آسیؔ سکندرپوری ثم غازی پوری بڑے پایے کے بزرگ عالم و عارف اور صاحب دیوان صوفی شاعر گزرے ہیں، مگر افسوس علمی و ادبی حلقوں میں ان کا اور خاندان رشیدی کا بہت کم تذکرہ ملتا ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب موجودہ سجادہ نشیں حضرت علامہ شاہ عبیدالرحمٰن رشیدی پورنوی دامت برکاتہم العالیہ کی سرکردگی میں کچھ بیداری آئی ہے اور اکابر کی کتابوں کے تراجم بھی ہو رہے ہیں اور اشاعت بھی عمل میں آ رہی ہے۔ خانقاہ کی طرف سے مدارس بھی قائم ہو رہے ہیں۔ جو اس خاندان کی تدریسی یادگار کا درجہ رکھتے ہیں۔ حضرت سرکار آسیؔ علیہ الرحمہ پر سمینار و محفل مذاکرہ کا انعقاد بھی اسی بیداری کی علامت ہے۔ بنارس میرا وطن ہے اور منڈواڈیہہ کی عظمت ہم لوگوں کی گھٹی میں پلائی گئی ہے۔ اس تعلق سے بھی مجھے سلسلۂ رشیدیہ سے خاص تعلق خاطر ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ان دنوں الفی قرآن کے ساتھ کنز الایمان و تفسیر خزائن العرفان کی عمدہ انداز سے کتابت و اشاعت کی خدمت میں لگا ہوا تھا اور لگا ہوں۔ اس لیے بھرپور مطالعہ اور مقالہ نگاری کے لیے وقت نہ نکال سکا۔ ان شاء اللہ آئندہ مزید اور کچھ لکھنے کی کوشش کروں گا۔

☆☆☆

شیخ محمد رشید جون پوری کے چند تلامذہ

ڈاکٹر ارمان احمد رشیدی

شہر جون پور عہد وسطیٰ میں اسلامی علوم و فنون کا گہوارہ رہا ہے۔ بے شمار علما و فضلا، مشائخ و صوفیہ اور مفکرین و محققین نے اس کو اسلامی علوم و فنون میں مرکزیت عطا کی اور پھر زمانہ اسے ''شیراز ہند'' کے نام سے یاد کرنے لگا۔

شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری، علما و صوفیہ جون پور میں امتیازی مقام رکھتے تھے۔ آپ نے علم و معرفت کی دنیا میں اپنی عظیم شخصیت کا لوہا منوایا ہے۔

اپنے مرشد گرامی مخدوم شیخ طیب بنارسی کے حکم سے درس و تدریس اور رشد و ہدایت کا وہ بحر بیکراں جاری کیا ہے کہ دنیا آج تک اس سے فیض حاصل کر رہی ہے۔ دعوت و تبلیغ اور علم و عرفان کا جو نظام آپ نے قائم کیا، اس نے آپ کو روحانی و اخلاقی دنیا کے ساتھ ساتھ علمی دنیا میں بھی بہت مشہور و مقبول بنا دیا۔

استاذ گرامی قطب وقت شیخ محمد افضل عثمانی جون پوری فرماتے ہیں:

''جس وقت علامہ تفتازانی و جرجانی دنیا سے گئے، اس وقت سے کسی نے بھی اتنے بڑے

☆ ریسرچ اسکالر، ہندو بنارس یونیورسٹی، بنارس

دو فاضلوں کو ایک شہر میں اکٹھا نہیں دیکھا۔ یعنی ملا محمود جون پوری اور شیخ محمد رشید۔''

[مآثر الکرام ص:۲۱۱]

طالبانِ علوم نبویہ سے آپ بہت محبت فرماتے تھے، حتی کہ آپ نے بوقت انتقال وصیت فرمائی کہ''جس پتھر پر طلبہ جوتیاں اتارتے ہیں، میری قبر میں اسی کا تختہ دیا جائے۔''

وہ شاگرد کتنے عظیم المرتبت ہوتے ہیں، جن کا نام لے کر ان کے استاد کی تعریف کی جائے۔

ابوالعرفان ندوی رقم طراز ہیں:

''فلسفہ اور معقولات کی درس وتدریس میں ملا افضل جون پوری کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ان کے علمی جلالت وشان وشکوہ کے لیے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ یہ ملا محمود جون پوری صاحب شمس بازغہ وفرائد اور دیوان محمد رشید جون پوری صاحب رشیدیہ کے استاد ہیں۔''

[ہندوستان میں اسلامی علوم ادبیات، ص:۷۳]

اس کے بعد حضرت قطب الاقطاب کے بارے میں ابوالعرفان ندوی لکھتے ہیں:

''دیوان محمد رشید جون پوری کی علمی منزلت کے لیے کسی ثبوت اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔'' [ایضا]

حدائق الحنفیہ میں آپ کا تذکرہ حنفی فقیہ کے طور پر ہوا ہے۔ علاوہ ازیں مولانا عبدالحی حسنی لکھنوی نے آپ کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

'' الشیخ العالم الکبیر العلامة محمد رشید بن محمد مصطفیٰ بن عبد الحمید العثمانی الجونپوری، احد العلماء المبر زین فی الفقه و الاصول و التصوف۔'' [نزھۃ الخواطر، ج،۵،ص:۲۹۷]

شیخ عبداللہ خویشگی کی طلب راہ طریقت ومعرفت میں آپ کی علمی وروحانی شخصیت کی طرف رہبری کرتے ہوئے ملا خواجہ علی لاہوری فرماتے ہیں:

'' در جون پور شیخ عبدالرشید بزرگی ممتاز است وعنایات والطاف ربانی سرفراز، زیارت وی مشرف شوند وفوائد دینی اخذ کنید۔'' [احوال وآثار: عبداللہ خویشگی، ص:۴۲]

آپ اپنے دور کے بڑے بڑے عالموں سے سبقت لے گئے۔ عہد شاہجہانی کا کوئی بھی

تذکرہ بغیر آپ کے ذکر کے مکمل نہیں ہوسکتا۔

آپ کی تصانیف میں رشیدیہ، تذکرۃ النحو، زاد السالکین، مقصود الطالبین، ترجمۂ معینیہ، بدایۃ النحو، مکتوبات اور دیوان شمسی وغیرہ جیسی علمی، فنی اور فکری و تحقیقی کتابیں شامل ہیں۔ رشیدیہ ''شریفیہ'' کی شرح ہے۔ فن مناظرہ میں ''رشیدیہ'' کے سوا کچھ پڑھنے کی حاجت نہیں سمجھی جاتی۔ یہ کتاب اکثر مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔

آپ کی تصانیف کے مقابلے میں آپ کے جید اور باکمال تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

مولانا عبدالحی حسنی لکھنوی ''نزھۃ الخواطر'' جلد اوّل کے ص: ۱۱۱ر پر رقم طراز ہیں:

'' وفی نشر العلوم و تفریح الطلبة و تربیتهم، امثال الشیخ احمد بن شهاب الدین دولت آبادی و الشیخ محمد رشید الجونپوری (۱۰۸۳ھ)۔''

آپ کے تلامذہ میں سے اکثر نے آپ ہی سے تعلیم طریقت حاصل کی ہے اور پھر بعد میں اجازت وخلافت سے بھی بہرہ ور ہوئے ہیں یا کم از کم آپ کے مرید ضرور ہوئے ہیں۔ آپ کے تلامذہ میں ملک و بیرون ملک کے طلبہ کے ساتھ ساتھ آپ کے صاحب زادگان گرامی بھی شامل ہیں۔ چناں آپ کے صاحبزادگان سمیت چند تلامذہ کے احوال، آثار اور کمالات بطور اختصار پیش کیے جاتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں۔

شیخ محمد حمید جون پوری، آپ حضرت قطب الاقطاب جون پوری کے بڑے صاحب زادے اور سب بھائیوں میں بڑے ذہین وفطین تھے۔ درسی کتابوں پر عبور حاصل تھا، والد کی جگہ درس وتدریس کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ دیوان شمسی جو حضرت قطب الاقطاب جون پور ی کے فارسی اشعار کا مجموعہ ہے، آپ ہی نے مرتب فرمایا تھا۔ شیخ غلام معین الدین جون پوری، آپ حضرت قطب الاقطاب جون پوری کے تیسرے صاحب زادے تھے- آپ کو بھی اجازت وخلافت حاصل تھی۔ شیخ غلام قطب الدین جون پوری، آپ حضرت قطب الاقطاب جون پوری کے سب سے چھوٹے صاحب زادے تھے۔ قادر الکلام شاعر تھے۔ فارسی میں شعر کہا کرتے تھے۔ تاریخ گوئی میں ید طولی رکھتے تھے۔ شیخ غلام معین الدین جون پوری کی تاریخ وفات کیا اچھی کہی ہے:

حریف نفس را دولت قریں بس
شہید زہد را قصر بریں بس
فنا فی اللہ چوں گشتی زسالت
معین الدین ترا ایزد معیں بس

[سمات الاخبار، ص:۵۹]

شیخ محمد ارشد جون پوری، آپ حضرت قطب الاقطاب جون پوری کے منجھلے صاحبزادے تھے- آپ علم وفضل اور زہد وتقویٰ میں اعلیٰ مقام پہ فائز تھے۔ آپ ہی اپنے والد گرامی اور پیرومرشد حضرت قطب الاقطاب جون پوری کے جانشین قرار پائے۔ آپ فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ والہ تخلص اختیار کرتے تھے۔ آپ کے کلام کا انتخاب آپ کی مایۂ نازتصنیف وتحقیق ''گنج ارشدی'' میں موجود ہے۔ آپ کی شاعری تصوف کی مٹھاس سے بھری ہوئی ہے۔ ادبی نقطۂ نظر سے کلام کا درجہ بہت اونچا ہے۔

روئے تو آفتاب را رشک است
موئے تو مشک ناب را رشک است
آب و آتش تر است اے والہ
شورش تو کباب را رشک است

آپ نے اپنے والد کے طریقے کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ سلسلۂ جنیدیہ اور سلسلۂ چشتیہ اشرفیہ کی اجازت وخلافت شیخ عبداللطیف مٹھن پوری سے حاصل کر کے اپنے سلسلے میں ایک اور روحانی سلسلے کا اضافہ فرمایا اور رشد وہدایت اور درس وتدریس کے مشن کو بلندی پر پہنچایا۔

حضرت قطب الاقطاب جون پوری کے دو ممتاز خلیفہ تھے۔ میر سید شاہ قیام الدین گورکھپوری اور میر سید شاہ جعفر پٹنوی۔ آپ اپنے دور کے اکابر علما ومشائخ میں سے تھے۔ انہوں نے آپ کی بارگاہ میں رہ کر علوم وفنون کی تحصیل فرمائی ہے۔

اوّل الذکر کے خاندان میں ہمیشہ خلافت واجازت کا سلسلہ جاری وساری رہا۔ آپ ہی کی اولاد سے سید شاہ شاہد علی سبز پوش فانؔی گورکھ پوری (صاحب دیوان فانی) اور سید شاہ مصطفیٰ علی

سبز پوش شہید آسی گورکھ پوری بالترتیب آٹھویں اور نویں سجادہ نشین قرار پائے اور رشد و ہدایت کے کارواں کو آگے بڑھایا۔

حضرت میر سید جعفر پٹنوی اپنے وقت کے عالم، عامل اور عارف کامل تھے۔ طریقۂ نبویہ ہر امر میں ملحوظ رہتا تھا۔ آپ کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ ایک مرتبہ قطب الاقطاب نے فرمایا:

''قیامت کے دن مریدوں کو پیروں سے شفاعت کی امید ہوگی اور مجھ کو اپنے مرید میر سید جعفر پٹنوی اور میر سید قیام الدین گورکھپوری سے۔''

آپ کے خاندان میں اجازت و خلافت کا سلسلہ جاری ہے۔ حضرت قطب الاقطاب ہر جون پوری کے ایک ممتاز خلیفہ حضرت شیخ یٰسین جھونسوی ہیں۔ آپ حضرت قطب الاقطاب کے مرشد گرامی مخدوم شاہ طیب بنارسی کے جانشین بھی تھے۔ آپ کا علمی مرتبہ بہت بلند تھا۔

مولانا عبدالحی حسنی لکھنوی ''نزہۃ الخواطر'' میں آپ کے بارے میں رقم طراز ہیں:

'' **الشیخ العالم الفقیه یٰسین بن احمد محمد ...... احد المشائخ الچشتیه**۔'' [ج:۵،ص:۴۶۸]

آپ نے حضرت قطب الاقطاب سے فقہ، اصول فقہ، منطق و فلسفہ اور صرف ونحو کی کتابیں پڑھیں تھیں۔ آپ کا ایک بڑا کارنامہ ''مناقب العارفین'' کی تصنیف ہے۔ جس میں لگ بھگ ۱۴۲۰ھ سے ۱۰۴۴ھ تک کے اکابر علما و مشائخ کے احوال جمع کیے ہیں۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ بنارس اور قرب و جوار کے علما و مشائخ کے متعلق یہی تذکرہ اولین ماخذوں میں سے ایک اہم ماخذ و مصدر ہے۔

شیخ نصرت بن جمال ملتانی ملتان کے رہنے والے تھے۔ آپ نے حضرت قطب الاقطاب کی صحبت سے بہت نفع اٹھایا ہے۔ آپ حضرت کے مرید و خلیفہ تھے۔ صاحب نزہۃ الخواطر نے آپ کو قطب زمانہ کے لقب سے یاد کیا ہے۔ آپ کا مایۂ ناز کارنامہ ''گنج رشیدی'' کی تالیف و ترتیب ہے۔ جو حضرت قطب الاقطاب کا بسیط ملفوظ ہے۔ جسے آپ نے ۱۰۷۲ھ سے ۱۰۸۲ھ تک جمع کیا ہے۔

ملا عبدالشکور منیری صوبۂ بہار کے قصبہ منیر کے رہنے والے تھے۔ شیخ محمد ارشد عثمانی جون

پوری نے صرف ونحو کی تعلیم آپ ہی سے حاصل کی تھی- آپ اپنے دور کے جید عالم تھے- حضرت قطب الاقطاب سے اجازت وخلافت حاصل تھی- منیر میں آپ نے ایک عالی شان مسجد تعمیر کی تھی، اسی مسجد کے احاطہ میں آپ کا مزار قدس ہے۔[ملخص از آثار منیر، ص:۸۷]

شیخ عبدالشکور جون پوری نے حضرت قطب الاقطاب سے اجازت وخلافت حاصل کی- آپ اپنے دور کے بہترین عالم تھے- ''مختصر الوقایۃ'' آپ کی تصنیف ہے-

قاضی شیخ نوراللہ بنارسی، آپ بنارس کے قاضی تھے- عہد اورنگ زیب میں آپ کو بڑی عزت واہمیت حاصل تھی- دارانگر (بنارس) کی مسجد کی تعمیر کے وقت اس نے آپ سے مشورہ کیا تھا اور آپ ہی کی نگرانی میں مسجد تعمیر ہوئی- اورنگ زیب کے حکم سے آپ کے لیے ایک عظیم الشان خانقاہ بھی تعمیر ہوئی تھی- [علمائے بنارس کا شاندار ماضی، ص:۲۴]

صاحب نزھۃ الخواطر تحریر کرتے ہیں:

"الشیخ الصالح نورا للہ بن الحسین المفتی المحمد آبادی احد الفقہاء الحنفیہ، اخذ طریقۃ عن شیخ محمد رشید .... ثم لبس الخرقۃ عن شیخ محمد ارشد بن محمد رشید -"[نزھۃ الخواطر، ج:۶ص:۴۰۴]

آپ نے حضرت قطب الاقطاب سے تعلیم حاصل کی- اجازت وخلافت حضرت کے جانشیں حضرت شیخ محمد ارشد سے حاصل کیا-

شیخ محمد نعیم بن مفتی محمد فائض صدیقی اودھی ثم جون پوری نے علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل حضرت قطب الاقطاب سے کی- آپ مایۂ ناز عالم اور کثیر التصانیف بزرگ تھے- حاشیہ ''ہدایۃ الفقہ'' چودہ جلدوں میں اور ''مشکوۃ'' کی نہایت دقیق شرح لکھی- آپ سلسلۂ قلندریہ میں حضرت قطب الاقطاب کے مرشد شیخ عبدالقدوس قلندر سے بیعت ہوئے۔[احوال وآثار: عبداللہ خویشگی، ص:۵۲]

شیخ ابوالعلاء جون پوری اپنے وقت کے بڑے عالم وفقیہ تھے- آپ صدر جہاں جونپوری کے خاندان سے تھے- حضرت قطب الاقطاب سے تعلیم حاصل کی اور خرقہ پہنا- آپ کا مزار شہر سے باہر مصطفیٰ آباد میں ہے-

شیخ جعفر بن عزیز اللہ جونپوری اپنے وقت کے جید عالم اور کامل بزرگ تھے- اکثر کتب

درسیہ آپ نے حضرت قطب الاقطاب سے پڑھی- آپ کی ایک تصنیف ''نورالانوار'' کا بھی ذکر ملتا ہے۔ مولانا شمس الدین جون پوری موضع بروننہ کے رہنے والے تھے- آپ اپنے عہد کے مشہور عالم تھے- آپ نے حضرت قطب الاقطاب سے تعلیم حاصل کی اور علم ظاہر و باطن اخذ کیا-

نزہۃ الخواطر میں ہے:

''الشیخ الفاضل العلامة شمس الدین بن نور الدین ..... کان من العلماء المشهورین فی عصره-'' [ج:۵،ص:۱۸۴]

مفتی محمد خلیل جون پوری اپنے دور کے کامل بزرگ تھے- نزہۃ الخواطر میں مولانا عبدالحی حسنی لکھنوی رقم طراز ہیں:

'' الشیخ العالم الفقیه المفتی محمد خلیل بن شمس الدین .... احد العلماء العاملین قرأ علی والده و تفنن فی الفضائل علیه و اخذ الطریقة عن الشیخ محمد رشید بن مصطفی عثمانی الجونپوری -''[ج:۵،ص:۳۹۷]

قاضی عبدالصمد جون پوری اپنے دور کے فقیہ اور اصول کے عالم کامل تھے- آپ دکن کے قاضی مقرر ہوئے تھے-

'' الشیخ الفاضل عبد الصمد العثمانی احد العلماء المبر زین فی الفقة و الاصول، قرأ علی عمه محمد رشید بن مصطفی العثمانی و لازمه زماناً حتی برع وفاق فی کثیر من العلوم و الفنون ثم سارا لی دهلی و شارت العلماء فی تصنیف '' الفتاوی الهندیه- '' [نزہۃ الخواطر، ج:ص:۱۶۰]

حضرت میر سید سعد اللہ صوبۂ بہار کے ضلع سارن میں قصبہ پسونڈھ کے رہنے والے تھے- (اب یہ جگہ ضلع سیوان میں پسیور (Pasiwar) کے نام سے موسوم ہے)- آپ حضرت قطب الاقطاب جون پوری کے مرید اور خادم خاص تھے- حضرت قطب الاقطاب کے جانشیں شیخ محمد ارشد سے اجازت وخلافت حاصل ہوئی- حضرت کے ایک مایۂ ناز خلیفہ حضرت نورالدین مداری ہیں- آپ اپنے دور کے جید عالم تھے- دائرہ شاہ اجمل کے بانی شاہ افضل الہ آبادی (۱۰۳۸ھ-۱۱۲۴ھ) اور حضرت بدرالحق شیخ محمد ارشد (۱۰۴۱ھ-۱۱۱۳ھ) نے آپ سے تعلیم

حاصل کی تھی-آپ کا تذکرہ ''نزھۃ الخواطر'' میں موجود ہے-

'' الشیخ العالم الفقیه نور محمد بن نصیر الدین المداری،احد رجال العلم و الطریقه-'' [ج:۵ص:۴۶۳]

بہر حال حضرت قطب الاقطاب کے تلامذہ نے اسلام کے آفاقی پیغام اور احکامات کی اشاعت وتوسیع میں حصہ لے کر قابل فخر کارنامہ انجام دیا ہے اور لوگوں کو خوف خدا، حب رسول، طلب حق وصداقت اور معرفت کا لائق تقلید درس دیا ہے-حضرت قطب الاقطاب دیوان محمد رشید مصطفیٰ عثمانی جون پوری کے تلامذہ اور خلفا کی بے لوث دینی خدمات سے یہ حقیقت واضح طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ ان کی فکر وشعور میں بلندی، خدمت دین کا جذبہ، علمی وعملی زندگی میں انقلاب کا سبب ان کے استاد ومرشد کی ذات اعلیٰ صفات کی بدولت ہے، جن کی تعلیم وتربیت سے شرف یاب ہو کر ہی یہ حضرات دنیا وآخرت کی سعادتوں سے بہرہ مند ہوئے-

فہرست مراجع

(۱) آثار منیر، سید شاہ مراد اللہ منیری، خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ ۲۰۱۰ء

(۲) احوال وآثار عبد اللہ خویشگی قصوری، محمد اقبال مجددی، دار المورخین لاہور ۱۹۷۲ء

(۳) الاحسان، حسن سعید صفوی، شاہ صفی اکیڈمی الہ آباد ۲۰۱۲ء

(۴) تصوف اور مشائخ رشیدیہ، ڈاکٹر ڈی این چترویدی، پرمانندپور، بلیا ۱۹۹۴ء

(۵) سمات الاخیار، محمد عبد المجید کاتب، ۱۳۴۴ھ

(۶) علمائے بنارس کا شاندار ماضی، سلام اللہ صدیقی، تنویر بک ڈپو، بنارس ۱۹۹۴ء

(۷) مآثر الکرام، آزاد بلگرامی، مترجم یونس رضا مونس اویسی، جامعہ الرضا بریلی ۲۰۰۸ء

(۸) مناقب العارفین اول، شیخ یٰسین جھونسوی، مترجم سید غلام سمنانی، خانقاہ رشیدیہ جون پور ۲۰۰۰ء

(۹) نزھۃ الخواطر، عبد الحی الحسنی ندوی، ندوۃ العلماء لکھنؤ ۱۹۹۲ء

(۱۰) ہندوستان میں اسلامی علوم وادبیات، عماد الحسن آزاد فاروقی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ۱۹۸۶ء

☆☆☆

خانقاہ رشیدیہ: تاریخ اور کارنامے

مولانا مجیب الرحمٰن علیمی

آج سے تقریباً سات سو سال پہلے سلطان فخر الدین محمد تغلق عرف جونا شاہ نے دریائے گومتی کے کنارے ہموار زمین پر ایک شہر قائم کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر ارادہ پایۂ تکمیل کو پہنچتا کہ ۲۰ر سال تک ہندوستان کی بادشاہت کی ذمہ داری ادا کر کے ۷۵۲ھ میں وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا چچازاد بھائی سلطان فیروز شاہ تخت نشیں ہوا اور ۷۷۲ھ میں جب وہ ملک بنگال کی بغاوت و سرکشی کو مٹا کر واپسی میں قصبہ مظفر آباد متصل جون پور خیمہ زن ہوا تو بادشاہ کی نگاہ جانب مغرب لب دریائے گومتی ایک ہموار زمین پر پڑی، چاہا کہ یہاں شہر آباد کرے، اسی شب بادشاہ نے ملک جونا کو خواب میں دیکھا کہ وہ خواہش ظاہر کرتا ہے کہ یہ شہر میرے نام سے موسوم ہو۔ صبح کو سوار ہو کر موقع کے معائنے کے بعد ایک بلند مقام تجویز کر کے قلعہ بنانے اور اس کے اطراف میں شہر جون پور بسانے کا حکم دیا۔ سخن وران شاہی نے شہر جون پور کے لفظ سے تاریخ بنا نکالی۔ اس میں بادشاہ نے ہر فن کے اہل کمال کو نزدیک و دور سے بلا کر آباد کرایا تھا، اسی وجہ سے ایک زمانے میں یہ شہر سلاطین شرقیہ کا دار السلطنت بن گیا جن کی وجہ

☆ استاد جامعہ عارفیہ سید سراواں کوشامبی، الہ آباد، یوپی

سے اس شہر کی دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی- علماے عظام اور صوفیۂ کرام کثرت سے یہاں پیدا ہوئے، جن کے ذکر سے تاریخ کی کتابیں بھری ہوئی ہیں- سر دست اس وقت اسی قدیم تاریخی شہر کے ایک قدیم روحانی مرکز، خانقاہ رشیدیہ کی تاریخ اور اس کی دعوتی و علمی خدمات پر روشنی ڈالی جارہی ہے-

بانی سلسلہ شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری کے آبا واجداد میں ایک سے بڑھ کر ایک اولوالعزم اولیا و علما گزرے ہیں اور آپ کے خاندان میں برابر اہل علم وعرفان پیدا ہوتے رہے ہیں- حضرت شیخ بخشیؔ رومی آپ کے مورث اعلیٰ ہیں- آپ کے جد امجد شیخ عبدالحمید عثمانی تھے، ان کے دولڑکے پیدا ہوئے؛ مصطفیٰ اور عثمان- ان دونوں بزرگوں کی آخری آرام گاہ پورنیہ بہار میں ہے- شیخ عثمان کی اولاد امیٹھی میں بسی ہوئی ہے اور شیخ مصطفیٰ نے شیخ محمد رشید جیسا متبحر عالم اور عارف باللہ فرزند پایا جس نے اپنے علم وعرفان سے ایک جہاں کو روشن کر دیا-

بانی سلسلۂ رشیدیہ کی سیرت

شیخ محمد رشید آپ ایک متبحر عالم، عارف باللہ اور زبردست صاحب تصرف بزرگ تھے- آپ سے مدعاے دل ظاہر کرنے کی ضرورت نہ تھی- اٹھتے بیٹھتے اللہ کا لفظ زبان پر جاری رکھتے- قناعت اور استغنا آپ کے مزاج میں ہی داخل تھا- سلاطین اور امرا کے دروازے پر جانا پسند نہ تھا- جس کام کو شروع کرتے اس کو پورا کرتے- کل کا لفظ بغیر ان شاء اللہ نہ فرماتے- تہذیب وادب کا لحاظ رکھتے- ہر کام میں بزرگوں کی پیروی کرتے- مریدوں کو نماز اور عبادت کی تعلیم دیتے اور اس کی پابندی کا حکم فرماتے- بیمار ہوتے تو بہت کم دوا لیتے اور فرماتے کہ دوا میں توکل اچھی چیز ہے اور دوا کرنے کا حکم بھی ہے- سماع سے آپ کو انکار نہ تھا- آپ کسی کی غیبت نہیں سنتے تھے- اگر کوئی ناواقف غیبت کر بیٹھتا تو آپ بیزار ہوتے اور اس کی کسی اچھی بات سے تاویل فرماتے- مثلاً ایک مرتبہ حاجی جلال الدین نے سادات خان حاکم شہر کی شکایت کی، آپ نے فرمایا کہ میرے سامنے کوئی کسی کی بدی ظاہر کرتا ہے تو مجھے اس کے جواب میں مشکل درپیش آتی ہے، کیوں کہ خدا نے بدی اور گمان بد سے منع فرمایا ہے اور اس کے رسول نے حسن ظن کا حکم دیا ہے- لامحالہ مجھے توجیہ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے- مثلاً اگر کسی کو رمضان میں

سر بازار کھاتے ہوئے دیکھوں تو گمان کروں گا کہ مسافر یا بیمار ہے کہ بھوک کے غلبے سے الگ لے جا کر کھانے کی طاقت نہیں رکھتا ہے۔ اگر کسی کو ننگے بدن اس طور سے نماز پڑھتا ہوا دیکھوں کہ عورت غلیظہ چھپا ہوا ہو، تو سمجھوں گا کہ مالکی المذہب ہے۔ اگر کسی کو دیکھوں کہ وضو کے بعد بلا تجدید وضو نماز پڑھ رہا ہے تو خیال کروں گا کہ شافعی المذہب ہے۔ اگر کسی کو جانوں کہ اس نے شراب پی ہے، کہوں گا توبہ کر لی ہوگی۔ ایک مرتبہ کسی نے کہا کہ حاکم شہر ظالم اور رافضی ہے مگر نماز عید اس نے جماعت سے پڑھی تھی آپ نے فرمایا کہ جب تم نے نماز جماعت سے پڑھتے ہوئے دیکھا پھر کیوں اس کے حق میں برا گمان کیا، انسان کو نیکی پر نظر کرنی چاہیے نہ کہ بدی پر۔

(سمات الاخیار، ص:۸۲/۸۳ ملخصاً)

شیخ محمد رشید کے ہم عصر اور خواجہ تاش نے جن الفاظ و القاب میں آپ کا ذکر کیا ہے، اس سے جہاں آپ کی عظمت، رفعت اور مقام ولایت کا علم ہوتا ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو عبدالرشید بھی کہا اور لکھا گیا ہے۔ یوں ہی مآثر الکرام کے مصنف میر سید غلام علی آزاد بلگرامی نے بھی آپ کا نام عبدالرشید اور لقب شمس الحق لکھا ہے۔ (مآثر الکرام، ص:۳۱۱) حدائق الحنفیہ میں آپ کا تعارف کراتے ہوئے یوں تحریر ہے: ''مخدوم شیخ عبدالرشید بن شیخ مصطفیٰ عبد الحمید عثمان: پہلا نام آپ کا محمد رشید تھا اور اسی کو دوست رکھتے تھے اور مراسلات و مکاتبات میں لکھتے تھے۔ لقب آپ کا شمس الدین تھا (حدائق الحنفیہ ص:۴۲۹) حدائق الحنفیہ میں آپ کی تاریخ وفات ۱۰۵۵ھ بتائی گئی ہے جو دیگر تمام مراجع سے مختلف ہے۔ اس کے علاوہ تمام مراجع و مصادر میں ۱۰۸۳ھ ہے اور یہی درست ہے۔ صاحب نزہۃ الخواطر نے بھی آپ کا نام محمد رشید اور گنج ارشدی کے حوالے سے تاریخ وصال ۹ رمضان ۱۰۸۳ھ لکھا ہے۔

[نزہۃ الخواطر، ج:۵، ص:۳۹۹، ۴۰۰]

خانقاہ رشیدیہ کا قیام

آپ حضرت راجی سید احمد مجتبیٰ مانک پوری سے روحانی نعمتوں کو حاصل کرنے کے بعد مانک پور سے جب واپس ہوئے تو جون پور میں حضرت راجی کے حکم کے مطابق ایک خانقاہ قائم کی اور پھر رشد و ہدایت کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل پڑا، جو آج تک جاری ہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا

کہ اس خانقاہ کے قیام کی تاریخ کیا تھی، مگر اندازہ لگایا جاتا ہے کہ اس وقت حضرت محمد رشید بانی خانقاہ کی عمر تقریباً ۴۰ رسال کی تھی، گویا ۱۰۴۰ھ کے آس پاس ہی اس خانقاہ کا قیام عمل میں آیا- اس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ خانقاہ رشیدیہ تقریباً چارسوسال قدیم خانقاہ ہے جہاں سے آج بھی علم وعرفان، رشدوہدایت اور خدمت خلق کا کام اپنے پورے آب وتاب کے ساتھ جاری وساری ہے اورموجودہ صاحب سجادہ حضرت مفتی عبیدالرحمٰن رشیدی کی لائق تعریف قیادت میں یہ خانقاہ اور اس سے متعلق چند دیگر خانقاہیں آج بھی کامیابی کے ساتھ اپنے مقصد کی طرف رواں دواں ہیں-

صاحب سمات الاخیار تحریر فرماتے ہیں:

اس کا پتہ نہیں چلتا کہ خانقاہ رشیدیہ کی بنیاد کس سال پڑی مگر میرا خیال یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ آپ کے عمر کی چالیسویں سال میں خانقاہ تعمیر ہوئی ہوگی اور یہ شاہ جہاں کا زمانہ تھا جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے- اگر یہ مان لیا جائے تو تادم تحریر اس کو بنے ہوئے تین سو برس ہوتے ہیں- بہرحال حضرت شیخ محمد رشید قدس سرہ نے حضرت راجی سید مجتبیٰ سجادہ نشین خانقاہ مخدوم شیخ حسام الحق مانک پور کے حکم سے اور تمام قبائل آپ کے موضع برونہ سے چلے آئے- آپ نے خانقاہ اور مسجد تعمیر فرمائی، کنواں کھدوایا، مسجد پہلے مسطح تھی بعد کو گنبدی بنی اور خانقاہ پہلے پوش نہ تھی اس پر چھپر پڑا تھا، چنانچہ اس نقل سے ظاہر ہے کہ حضرت قطب الاقطاب خانقاہ میں بیٹھے ہوئے تھے اور پانی برس رہا تھا چھپر ٹپکا تو کسی نے عرض کیا کہ چھپر خوب نہیں بنا جس سے پانی رکتا، آپ نے فرمایا کہ چھپر پانی کو روکنے کے لیے نہیں بنا ہے بلکہ دھوپ کو روکنے کے لیے، کیوں کہ بارش کا زمانہ صرف چار مہینہ ہے، اس میں بھی اول آخر میں پانی کم برستا ہے- کچھ دن، رات پانی نہیں برستا اگر حساب کیا جائے تو بارش کا زمانہ کل پندرہ سولہ روز ہی ہوگا پس عاقل کا کام نہیں کہ اتنے دن کے لیے گھر بنائے، ہاں آفتاب ہمیشہ رہتا ہے، گھر اس کے لیے ہونا چاہیے-

بانی سلسلہ رشیدیہ کی علمی خدمات

آپ کی ذات علمی دنیا میں نہ کل محتاج تعارف تھی اور نہ آج ہے- آپ اپنے دور کے بڑے بڑے عالموں اور محققین پر سبقت لے گئے- آپ کے ہم عصر علما و مشائخ نے جہاں آپ کی روحانی حیثیت کو تسلیم کیا وہیں آپ کی علمی قدر و قیمت کو بھی سراہا ہے-

آپ کے شیوخ میں مخدوم شاہ طیب بنارسی حضرت عبد القدوس قلندر، میر سید شمس الدین کالپی اور راجی احمد مجتبیٰ مانک پوری جیسے مشائخ کا نام آتا ہے اور شیخ نور الحق ابن شیخ عبد الحق محدث دہلوی شارح بخاری اور افضل العلماء شیخ محمد افضل جیسے متبحر علما آپ کے اساتذہ ہوتے ہیں۔ ملا عبد الحکیم سیالکوٹی (۱۲ر ربیع الاول ۱۰۶۷ھ) ملا عصمت اللہ سہارن پوری (۱۰۳۹ھ) اور شیخ محب اللہ الہ آبادی جیسے نامور علما و مشائخ آپ کے ہم عصر اور ملا محمود جون پوری جیسے منقولی اور معقولی عالم آپ کے ہم سبق ساتھی تھے۔ آپ کے استاذ شیخ محمد افضل کہتے تھے کہ جس وقت علامہ تفتازانی اور جرجانی دنیا سے گئے اس وقت سے کسی نے بھی اتنے بڑے فاضلوں کو ایک شہر میں اکٹھا ہوتے نہیں دیکھا یعنی ملا محمود اور شیخ عبد الرشید۔ [مآثر الکرام، ص:۳۶]

(۳) آپ کے اساتذہ نے بھی آپ پر فخر کیا ہے۔ صاحب شمس بازغہ ملا محمود جون پوری جیسے عالم آپ کے ہم سبق ساتھی تھے۔ ملا موہن بہاری آپ کے مداحوں میں شامل ہیں۔ آپ اپنے اساتذہ کا حد سے زیادہ احترام کرتے تھے، بلکہ ان کے گھر کے درودیوار کا احترام بھی ضروری خیال کرتے تھے۔ آپ ہمیشہ طالبان علوم نبویہ کو درس دیا کرتے تھے اور ان کی قدر کیا کرتے تھے، حتی کہ آپ نے وصال کے وقت وصیت کی تھی کہ جس پتھر پہ طلبہ کی جوتیاں اترتی ہیں میری قبر میں اسی کا تختہ دیا جائے۔ [سمات الاخبار، ص:۶۵ ملخصاً]

ایک روز آپ حسب معمول استاذ العلما شیخ محمد افضل کی خدمت میں تشریف لے گئے، وہ علم مناظرہ کی کتاب شریفیہ کسی کو پڑھا رہے تھے، آپ کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ متن خوب ہے اگر کوئی اس کی شرح لکھے تو اچھی ہوگی۔ دوسرے ہفتے میں جب آپ ملنے گئے تو شریفیہ کی شرح رشیدیہ لکھ کر لیے گئے۔ استاذ العلما نے دیکھ کر بہت پسند فرمایا۔ یہ شرح ایسی جامع و مانع اور سلیس واقع ہوئی ہے کہ فن مناظرہ میں رشیدیہ کے سوا اور کچھ پڑھنے کی حاجت نہیں ہوتی۔

[سمات الاخبار، ص:۶۵]

جس طرح آپ کی تصانیف کی کثرت ہے، اس سے کئی گنا زیادہ آپ کے جید تلامذہ کی تعداد ہے۔ آپ کے تلامذہ میں سے اکثر نے آپ ہی سے طریقت میں بھی اجازت وخلافت حاصل کی یا کم از کم آپ کے مرید ہوئے۔ آپ کی تصانیف بہت ہیں جن میں رشیدیہ، شرح

اسرار المخلوقات ،تذکرۃ النحو،زاد السالکین،مقصود الطالبین،ترجمۂ معینیہ،بدلیۃ النحو،مکتوب،دیوان شمسی وغیرہ شامل ہیں

بانی سلسلہ رشیدیہ کی دعوتی خدمات

سلسلہ رشیدیہ کو جاری ہوئے تقریباً چار سو سال کا طویل عرصہ گزر گیا،مگر آج بھی اپنے پورے آب وتاب کے ساتھ یہ سلسلہ جاری ہے-مخلوق خدا کی خدمت اور رشد وہدایت کا کام بحسن وخوبی انجام پا رہا ہے-اس سلسلے کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں سجادگی میراثی نہیں ہے-پورے سلسلے میں جو اولوالعزم علماومشائخ اور صالحین ہوں گے وہ اتفاق رائے سے سلسلے کے کسی فرد کو جو اجازت اور خلافت یافتہ ہوگا اس کو سجادگی کے لیے منتخب کرتے ہیں-یہ طریقہ منہاج نبوت و خلفائے راشدین کے طریقے کے مطابق ہے-دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ جو اس سلسلہ کا سجادہ ہوگا اس کے ذمے اس سلسلے کی فقط ایک خانقاہ کی ذمہ داری نہ ہوگی بلکہ اس کی چند خانقاہوں کی مکمل ذمہ داری ادا کرنا اس کا دینی اور روحانی فریضہ قرار پاتا ہے-بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ اگر کوئی سجادہ خانقاہی فرائض اور دینی اور روحانی ذمہ داریوں اور خدمت خلق سے لاتعلقی کا ثبوت دیتا ہے،تو اس سلسلے کے اصحاب حل وعقد نے جس طرح ان کو منتخب کیا تھا اسی طرح ان کو معزول بھی کر سکتے ہیں اور کسی دوسرے کو اس عہدے کے لیے منتخب کرنے کا حق بھی رکھتے ہیں-آج جب کہ ہم زمانۂ نبوت سے چودہ سو سال دور ہو چکے ہیں،یہ خانقاہ اپنی مثال آپ ہے-دوسری تمام خانقاہوں کو اس سے سبق لینا چاہیے-

بانی سلسلہ شیخ محمد رشید نے آج سے چار سو سال پہلے اللہ ورسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رضا کے مطابق دعوت وتبلیغ اور علم وعرفان کا جو نظام قائم کیا تھا وہ آج بھی قائم ہے اور آپ کے خلفا اور سلسلے کے افراد اپنے اسلاف کے طریقے کے مطابق دعوت وتبلیغ،رشد وہدایت کا فریضہ انجام دینے میں مصروف ہیں-بانی سلسلہ نے جو دعوتی نظام برپا کیا تھا وہ اپنی پوری تابانی کے ساتھ آج بھی جاری ہے اور اس سلسلے کی مختلف خانقاہیں خدمت خلق میں آج بھی مصروف ہیں-ان خانقاہوں کے ذریعے مخلوق خدا کی علمی اور روحانی سیرابی کا سامان آج بھی فراہم کیا جا رہا ہے-بانی سلسلہ کے خلفا اور پھر ان کے خلفا کا جو ایک لمبا سلسلہ چلا اور چل رہا ہے،ان

تمام کا سہرا بانی سلسلہ شیخ محمد رشید قدس سرہ کے سر جاتا ہے۔

سلسلۂ رشیدیہ کے سجادگان ایک نظر میں

(۱) شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری

(۲) شیخ محمد ارشد عثمانی جون پوری

(۳) شیخ غلام رشید عثمانی جون پوری

(۴) شیخ حیدر بخش جون پوری

(۵) شیخ امیر الدین جون پوری

(۶) شیخ غلام معین الدین جون پوری

(۷) شیخ سراج الدین جون پوری

(۸) شیخ محمد عبد العلیم آسی غازی پوری

(۹) سید شاہ شاہد علی سبز پوش گورکھپوری

(۱۰) سید شاہ مصطفیٰ علی سبز پوش گورکھپوری

(۱۱) شاہ مفتی عبید الرحمٰن رشیدی دام ظلہ (موجودہ سجادہ نشیں: خانقاہ رشیدیہ، جون پور)

سلسلۂ رشیدیہ کی سجادگی کے تحت آباد خانقاہیں

(۱) خانقاہ عالیہ رشیدیہ، جون پور

(۲) خانقاہ عالیہ طیبیہ معینیہ، منڈواڈیہہ، بنارس

(۳) خانقاہ عالیہ مصطفائیہ، چمنی بازار، پورنیہ، بہار

(۴) خانقاہ عالیہ حیدریہ معینیہ، بھن برہ، سیوان، بہار

(۵) خانقاہ عالیہ علیمیہ، غازی پور، بلیا

سلسلہ رشیدیہ کے چند ممتاز علما و مشائخ

شیخ محمد رشید جون پوری جہاں علمی اعتبار سے مرجع خلائق تھے وہیں دوسری طرف طریقت، حقیقت اور معرفت کے لحاظ سے اپنے دور کے شیخ المشائخ تھے۔ بے شمار لوگوں نے آپ سے اپنی علمی اور روحانی تشنگی دور کی۔ تلامذہ اور خلفا کی ایک بڑی جماعت آپ نے تیار کی۔ ۳۴ رخلفا کا

ذکر کتابوں میں ملتا ہے- ان کے علاوہ بھی آپ کے خلفا تھے جن کا ذکر نہیں ملتا- ذیل میں اس سلسلے کے بعض اولوالعزم خلفا اور مشائخ کا اجمالاً ذکر کیا جاتا ہے-

(۱) میر سید قیام الدین گورکھ پوری قدس سرہٗ (متوفی ۱۱۲۸ھ)

آپ کا اصلی وطن سگڑی اعظم گڑھ تھا- بعد میں آپ نے گورکھ پور کو شرف بخشا- شیخ محمد رشید قدس سرہٗ سے آپ کو ارادت وخلافت دونوں حاصل تھی- آپ بڑے زاہد، صائم الدہر، قائم اللیل درویش تھے- آپ کے بارے میں آپ کے مرشد گرامی نے فرمایا: ''تم اور سید محمد جعفر کل اس فقیر کی نجات کے سبب ہوگے-'' آپ کے خاندان میں سجادگی کا سلسلہ اب تک جاری ہے- شاہ شاہد علی سبز پوش قدس سرہٗ کے آپ مورث اعلیٰ ہیں-

(۲) حضرت شیخ محمد ارشد قدس سرہٗ (متوفی ۱۰۴۱ھ)

آپ کا نام محمد ارشد، کنیت ابوالکشف اور لقب بدرالحق تھا- آپ قطب الاقطاب شیخ محمد رشید بانی سلسلۂ رشیدیہ کے منجھلے صاحب زادے اور سلسلۂ رشیدیہ کے پہلے سجادہ تھے- آپ نے علوم شرعیہ متداولہ شیخ عبدالشکور منیری، مولانا الہداد جون پوری، ملا نورالدین مداری جون پوری اور اپنے حقیقی چچا شیخ محمد ولید اور استاذ العلما شیخ محمد افضل جون پوری سے حاصل کی جب کہ کتب تصوف کا علم اپنے والد گرامی سے حاصل کیا- ۲۱ سال کی عمر میں ظاہری اور باطنی علوم سے آراستہ ہو چکے، پھر طالبان علوم نبویہ کی خدمت میں مصروف ہو گئے- ۲۲ رسال کی عمر میں اپنے والد کے دست مبارک پر سلسلۂ چشتیہ احمدیہ میں بیعت ہوئے اور انہی سے اجازت وخلافت بھی حاصل کی- آپ اپنے والد ہی کی طرح جواں مرد اور باہمت تھے- خاندانی نعمتوں کے حصول کے بعد مزید کوشش جاری رہی- شیخ عبداللطیف مٹھن پوری جو سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی قدس سرہٗ کی اولاد سے تھے اور سلسلۂ جنیدیہ اور سلسلۂ چشتیہ اشرفیہ میں صاحب اجازت وخلافت تھے ،آپ شیخ محمد ارشد کے خسر ہوئے- شادی کے بعد ان دونوں سلسلوں کی اجازت وخلافت بھی آپ نے حاصل کی- حضرت قطب الاقطاب کے آپ قابل فخر فرزند اور جانشین تھے- ایک دفعہ پٹنہ میں کسی بزرگ نے حضرت قطب الاقطاب سے پوچھا کہ دوست جب دوست کے پاس جاتا ہے تو کچھ ہدیہ لے کر جاتا ہے- آپ جب خدا کے سامنے جائیں گے اگر خدا نے پوچھا کہ

میرے واسطے کیا ہدیہ لائے ہو؟ تو کیا جواب دیں گے؟ اس پر آپ آب دیدہ ہوئے اور فرمایا ''دست محمد ارشد گرفتہ پیش خواہم کرد کہ ہمیں راہدیہ آوردہ ام۔'' (سمات الاخیار، ص: ۱۱۸/۱۱۹)

شیخ محمد ارشد بدرالحق ایک بار دہلی کے سفر پر تھے، لکھنؤ کے قریب سے گزر رہے تھے تو حضرت شاہ عبدالرزاق بانسوی نے حاضرین سے فرمایا کہ اس نواح میں ایک عاشق اللہ پہنچا ہے اور حضرت بدرالحق نے بھی اپنے ساتھیوں سے شاہ صاحب کے حق میں فرمایا کہ ان قصبات میں خدا کے دوست کی بو آرہی ہے۔ (سمات الاخیار، ص: ۱۲۴، بحوالہ بحر زخار)

آپ کی طبیعت میں موزونیت تھی۔ شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ آپ کے چند کلام بھی ملتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ شاعری میں بھی کمال رکھتے تھے۔ شاعری میں اپنا تخلص والہ کرتے تھے۔ یہ اشعار آپ کی قادرالکلامی کی شہادت ہیں:

رخ او بے نقاب باید دید
روز را آفتاب باید دید
لب لعل تو با پیالہ مدام
مست را با شراب باید دید
والہا غیر او مبیں ہر گز
آب را با حباب باید دید

خلفا و مریدین

سمات الاخیار کے مصنف نے تحریر کیا ہے کہ ۲۹۷۱ افراد نے مختلف سلسلوں میں آپ سے بیعت کی اور تیس نفوس قدسیہ نے آپ سے روحانی سلسلوں کی اجازت و خلافت حاصل کی۔ ذیل میں بعض ممتاز خلفا کا مختصراً ذکر کیا جارہا ہے۔

(۱) میر سید محمد باقر پٹنوی (متوفی ۱۱۱۸ھ)

آپ میر سید جعفر پٹنوی کے بڑے صاحب زادے ہیں۔ اپنے والد ہی سے علوم ظاہری کی تکمیل کی اور ان ہی کے دست حق پرست پر بیعت بھی ہوئے۔ بعد میں حضرت محمد ارشد کی بارگاہ میں سلوک کی تکمیل کی اور تمام عمر درس و تدریس، ہدایت خلق اور ارشاد فقرا میں مشغول

رہے- آپ اپنے شیخ اجازت وخلافت سے بے حد محبت کرتے تھے- ان کے انتقال کے چند ہی سال بعد آپ کا بھی انتقال ہو گیا اور پٹنہ محلّہ شریعت آباد میں اپنے والد کے روضے میں مدفون ہوئے- (سمات الاخیار، ص: ۱۳۸/ ۱۳۹ ملخصا)

(۲) میر سید محمد اسلم پٹوی (متوفی ۱۱۳۸ھ)

آپ کا لقب عبد القدوس تھا- میر سید محمد جعفر کے منجھلے بیٹے تھے- علوم متداولہ کے علاوہ اجازت وخلافت بھی اپنے والد ہی سے حاصل کی اور پھر شیخ محمد ارشد بدر الحق سے مزید نعمتیں میسر آئیں- آپ نے اپنی ساری عمر مخلوق خدا کی رشد و ہدایت اور طالبان علوم نبویہ کے درس و تدریس میں صرف کردی- رسالہ عمدة النجاة فی حل الزلات آپ نے تحریر فرمایا- [سمات الاخیار، ص: ۱۳۹ تا ۱۴۱ ملخصاً]

(۳) میر سید سعد اللہ (متوفی ۱۱۱۷ھ)

آپ بہار ضلع سارنگ کے رہنے والے اور بانی سلسلۂ رشیدیہ شیخ محمد رشید کے مرید اور خادم خاص تھے- شیخ محمد ارشد سے اجازت و خلافت حاصل تھی- آپ کا مزار پسونڈ میں ہے- (سمات الاخیار، ص: ۱۴۱ تا ۱۴۳ ملخصاً)

مختصر یہ ہے کہ شیخ محمد ارشد بدر الحق نے اپنے والد سے جن نعمتوں کو پایا تھا ان میں اضافہ بھی کیا اور دعوت وارشاد کا جو سلسلہ قائم ہوا تھا اس کو مزید وسیع پیمانے پر جاری رکھتے ہوئے خدمت خلق اور تزکیۂ نفوس کی غرض سے مریدین اور خلفا کی ایک بڑی جماعت تیار کی-

(۳) سید محمد جعفر پٹوی (متوفی ۱۱۰۵ھ)

آپ کا نام محمد جعفر اور لقب بحر الحقائق نجم الحق تھا- سلسلۂ نسب حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے- آپ جب آٹھ برس کے تھے تو آپ کے والد سید ابو الحسن نے وفات پائی- دادا نے پرورش کی اور سلسلۂ چشتیہ میں مرید کر کے خرقۂ خلافت دے کر اپنا جانشین بنایا- جب سن شعور کو پہنچے تو تحصیل علوم کے لیے جون پور آئے اور حضرت قطب الاقطاب (شیخ محمد رشید) کے مدرسہ میں مقیم ہوئے- تکملۂ علوم کے بعد چوں کہ پہلی بیعت صغر سنی کی وجہ سے ٹھیک یاد نہ تھی، حضرت سے سلسلۂ قادریہ میں مرید بھی ہو گئے اور چند دن خدمت میں رہ کر مرتبۂ

کمالات کو پہنچے- اس کے علاوہ دیگر سلاسل مثلاً چشتیہ، سہروردیہ، فردوسیہ ومداریہ کی بھی خلافت واجازت حاصل کی اور بحکم شیخ پٹنہ میں قیام کیا- ایک مدت تک مجرد رہے اور ایک مسجد میں بسر کی- جب آپ کی عمر زیادہ گزر گئی تو آپ کی والدہ کی تحریک سے حضرت قطب الاقطاب نے آپ کو سنت نبوی کے اتباع پر مجبور کیا اور خود ہی میر سید نورالدین نبیرۂ حضرت سید فضل اللہ عرف سید گوشائیں دامادِ حضرت قطب بینادل قلندر کی صاحب زادی سے نسبت مقرر کر کے شادی کرادی- پھر وہ مادرزاد ولی پیدا ہوئے- آپ عالم، عامل اور عارف کامل تھے- طریقۂ نبوی ہر امر میں ملحوظ رہتا-

کسی نے آپ سے پوچھا تھا کہ آپ کے پیر سماع سنتے ہیں، آپ کیوں نہیں سنتے؟ جواب دیا کہ پیر نے رخصت کے وقت فرمایا تھا کہ حضرت امام اعظم کی فقہ پر عمل کرنا، میں پیر کی اطاعت کو سعادت دارین جانتا ہوں- آپ کا قول مشہور ہے: ”میں نے رشید (خدا) کو رشید کے سبب سے پہچانا- اگر رشید نہ ہوتے تو میں خدا کو نہ پہچانتا-“ آپ کا مرتبہ اسی سے روشن ہے کہ ایک بار حضرت قطب الاقطاب نے فرمایا تھا کہ ”قیامت کے دن مریدوں کو پیروں سے شفاعت کی امید ہوگی اور مجھ کو اپنے مرید میر سید جعفر پٹنوی اور میر سید قیام الدین گورکھپوری سے-“

آپ نے کل تبرکات وخرقۂ خلافت اپنے بیٹوں میر محمد باقر ومیر محمد اسلم میں تقسیم کر دیا- صرف ایک رومال رکھ لیا اور وصیت کی کہ کفناتے وقت اس رومال کو میرے سر پر باندھ دینا، چنانچہ ایسا ہی ہوا- آپ نے رمضان المبارک ۱۱۰۵ھ کی تیسری تاریخ کو پنج شنبہ کے روز وصال فرمایا اور شریعت آباد بیرون شہر پٹنہ میں مدفون ہوئے- آپ کے گزراوقات کے لیے ایک مرید نے ایک موضع دینا چاہا تھا، مگر قبول نہ فرمایا- اس کے اصرار پر آپ نے چند بیگہہ زمین لے لی اور اس کا نام شریعت آباد رکھا- [سمات الاخیار، ص: ۱۰۷تا۱۰۹]

(۴) شیخ یٰسین جھونسوی (سنہ وصال معلوم نہیں)

آپ شیخ احمد ابن شیخ محمد ابن شیخ عبدالرحیم ابن بندگی شیخ اوجھر صدیقی جون پوری کے بیٹے تھے- چوں کہ آپ سعید ازلی تھے اس وجہ سے آپ کو بچپن ہی سے حضرت مخدوم طیب بنارسی کی صحبت نصیب ہوئی- حضرت مخدوم نے آپ کی پرورش اور تعلیم مربیانہ فرمائی- گیارہویں

برس سلسلۂ چشتیہ میں مرید کر کے اپنا خلیفہ بنایا- شہاب الدین دولت آبادی ثم جون پوری کا رسالہ نحو ارشاد پڑھایا، پھر جون پور بھیجا- استاذ العلما شیخ افضل اللہ آبادی اور حضرت قطب الاقطاب شیخ محمد رشید سے کتابیں پڑھیں- سات برس تک جون پور میں رہے- درمیان میں وقتاً فوقتاً حضرت مخدوم کی زیارت کو جا کر فیض یاب بھی ہو آتے تھے- بیسویں برس جمیع سلاسل کے خرقے اور خلافتیں حضرت مخدوم نے عطا کیے- حضرت مخدوم کے بعد جو کسر رہ گئی تھی حضرت دیوان جی شیخ محمد رشید نے پوری کر دی اور خلافت و اجازت بخشی- ان باتوں کے باوجود حضرت دیوان جی اپنے مرشد کے سجادہ نشین ہونے کی وجہ سے آپ کی بڑی تعظیم کرتے تھے، یہاں تک کہ جب وہ قدم بوس ہونا چاہتے تھے تو آپ بھی اپنا ہاتھ ان کے پاؤں تک ضرور پہنچاتے تھے- آپ پر کشف کی حالت بہت طاری رہا کرتی تھی- آپ نے تصوف کے بہت سے مشکل مسائل بذریعۂ تحریر پوچھے ہیں اور حضرت دیوان جی نے ان کے جواب میں مکتوب لکھے ہیں- اپنے پیرانِ سلاسل کے حالات میں مناقب العارفین آپ کی عظیم تصنیف ہے-

آپ کا سال وصال معلوم نہیں آپ کا مزار قصبہ جھونسی، الہ آباد میں شیخ نصیر الدین اسد العلما کے روضے کے اندر ہے- [سمات الاخیار، ص:۱۱۱/۱۱۲]

(۵) شیخ غلام رشید جون پوری (متوفی صفر ۱۱۶۷ھ)

آپ کا نام غلام رشید، کنیت ابو الفیاض اور لقب قمر الحق ہے- آپ شیخ محب اللہ کے لڑکے اور شیخ محمد ارشد کے پوتے و جانشین اور سلسلۂ رشیدیہ کے دوسرے سجادہ نشیں تھے- آپ چودہ دن کے تھے کہ آپ کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور ایک سال چار ماہ کے ہوئے کہ والد کا سایہ بھی اٹھ گیا- آپ کے دادا شیخ محمد ارشد نے آپ کی پرورش کی اور کامل و مکمل بنا دیا- علوم ظاہرہ متداولہ آپ نے مختلف علمائے وقت سے حاصل کیا اور اس کی بھی تکمیل اپنے دادا شیخ محمد ارشد ہی سے کی اور دعوت و تبلیغ، درس و تدریس میں اپنی عمر عزیز صرف کر دی- شیخ حیدر بخش آپ کے نواسے تھے، جن کی تعلیم کے لیے آپ نے رسالہ ''درایۃ النحو'' کی نہایت بسیط شرح لکھی تھی- آپ متبحر عالم اور کامل درویش ہونے کے ساتھ زود گو شاعر بھی تھے- آپ کا فارسی کلام بھی ملتا ہے-

پٹنہ کے سفر میں جب آپ خانقاہ جعفریہ میں مقیم تھے تو آپ سے ملاقات کی غرض سے

خانقاہ مجیبیہ کے بانی حضرت مجیب اللہ پھلواروی تشریف لائے اور اپنی خانقاہ میں حاضری کی دعوت دی- آپ تشریف لے گئے- پٹنہ سے پورنیہ گئے اور پھر طبیعت خراب ہوئی- اسی سفر میں آپ کا انتقال بھی ہو گیا- آپ کی وصیت کے مطابق خانقاہ رشیدیہ جون پور میں دفن کیا گیا- کثرت سے آپ کی کرامتوں کا ذکر ملتا ہے- (سمات الاخیار، ص:۱۴۴ تا ۱۶۲ر ملخصاً)

خلق خدا نے کثرت سے آپ کے دست مبارک پر توبہ کیا- مخلوق خدا کی اصلاح، تزکیۂ قلوب اور تصفیہ نفوس کے لیے آپ نے چالیس سے زائد نفوس قدسیہ کو اپنی روحانی نعمتوں کی اجازت وخلافت سے سرفراز فرما کر رشد وہدایت کا بہتر انتظام فرما دیا-

[سمات الاخیار، ص:۱۶۳ ملخصا]

(۶) شاہ حیدر بخش جون پوری (متوفی ۱۲۲۴ھ)

آپ کا نام حیدر بخش اور لقب نور الحق اور قطب الدین ہے- آپ محبوب الحق شاہ فصیح الدین کے لڑکے اور حضرت قمر الحق غلام رشید کے نواسے وجانشیں اور سلسلۂ رشیدیہ کے تیسرے سجادہ تھے- آپ کا نسبی سلسلہ حضرت ابوبکر صدیق سے جاملتا ہے- آپ پانچ بھائی تھے- ۱۱۶۳ھ میں آپ اپنے نانا کے دست مبارک پر سلسلۂ چشتیہ احمدیہ میں مرید ہوئے- آپ کی تعلیم وتلقین اور تکمیل نانا کے ہاتھوں ہو چکی تھی- نانا کے بعد بھی آپ نے اپنے والد سے مزید فیض حاصل کیا- آپ کی دو شادیاں ہوئیں- پہلی سے نجیب الدین اور دوسری سے شاہ امیر الدین پیدا ہوئے- آپ کو شعر وسخن کا بھی ذوق تھا- اردو زبان میں آپ کے چند اشعار ملتے ہیں-

آپ سیوان بہار کا اکثر سفر کرتے اور مہینوں قیام فرماتے- بھہن برہ نامی گاؤں میں آپ نے خانقاہ اور مسجد بنوائی تھی- ساٹھ سال سے زائد عمر پا کر ۲۵ر شوال ۱۲۲۴ھ کو سیوان ہی میں آپ وصال فرما گئے اور یہیں مدفون بھی ہوئے- اس مقام کو تکیۂ حیدری کہا جاتا ہے- (سمات الاخیار، ص:۱۷۸ تا ۱۸۲ ملخصاً)

آپ کے بعد آپ کے صاحب زادے شاہ امیر الدین سجادہ ہوئے اور سلسلۂ رشیدیہ کے دعوتی وعلمی اور رفاہی کاموں کو بحسن وخوبی انجام دیا- شاہ امیر الدین کے علاوہ آپ کے ۱۲ر خلفا کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے- ان ۱۲ر کے علاوہ بھی خلفا کے بارے میں بتایا جاتا ہے-

(۷) شیخ امیر الدین جون پوری (متوفی ۱۲۲۵ھ)

آپ کا نام امیر الدین اور لقب قیام الحق ہے- آپ شاہ حیدر بخش کے چھوٹے لڑکے و جانشین اور سلسلۂ رشیدیہ کے چوتھے سجادہ نشیں تھے- آپ اپنے والد سے سلسلۂ چشتیہ احمدیہ میں مرید ہوئے اور تمام سلاسل کی اجازت وخلافت اور خاندانی فیوض وبرکات سے شرف یاب ہوئے-

آپ میں متانت، وقار، توکل اور قناعت بے حد تھی- دنیا کی باتوں سے زبان کو بچانے کے لیے بہت کم بولتے تھے اور بلا ضرورت کبھی زبان نہیں کھولتے تھے- اگر کبھی تکلیف تکلم گوارا فرماتے تو پیران سلاسل کا ذکر زبان پر لاتے- اپنے خاندانی بزرگوں کی طرح برابر درس و تدریس اور بندگان خدا کی ہدایت وتعلیم میں اپنے اوقات صرف کیے-

آپ کی تین شادیاں ہوئیں- پہلی شادی سے کوئی اولاد نہ تھی- دوسری سے شاہ ولی بخش اور دو بیٹیاں ہوئیں- تیسری بیوی سے شاہ معین الدین قطب الہند اور ایک صاحب زادی پیدا ہوئی- [سمات الاخیار، ص:۱۸۷/۱۸۸، ملخصاً]

کثرت سے آپ کی کرامات کا تذکرہ ملتا ہے- آپ کے مریدین ومتوسلین دور دور تک پھیلے ہوئے تھے- سمات الاخیار کے مصنف تحریر کرتے ہیں کہ مولوی شاہ عبد الغفور ابو العلائی یوسف پوری جو اپنے وقت کے ایک جلیل القدر بزرگ تھے، جنہوں نے ہند سے عرب تک کی سیاحت اور تمام متبرک مقامات کی زیارت کی تھی، عرب میں ایک بزرگ سے ملے جو نہایت مشغولی اور استغراقی حالت میں تھے- آپ کو حیرت ہوئی کہ ایسے بزرگ اس زمانے میں بھی موجود ہیں- پوچھا آپ کس کے مرید ہیں؟ جواب دیا کہ اپنے باپ کے مرید ہیں- پھر پوچھا کہ ان کے شیخ کون ہیں؟ جواب دیا کہ حضرت شاہ امیر الدین جون پوری جو ملک ہندوستان کے رہنے والے تھے- ۹ محرم الحرام ۱۲۲۵ھ کو آپ کا وصال ہوا اور رشید آباد میں مدفون ہوئے- [سمات الاخیار، ص:۱۹۰]

آپ کے مریدین اور خلفا کی تعداد بہت زیادہ تھی- آپ کے بعض خلفا کا تذکرہ بھی ملتا ہے- ان میں سے چند کے اسما یہ ہیں: (۱) شاہ غلام معین الدین، آپ حضرت کے صاحب زادے تھے اور جانشین بھی ہوئے- (۲) شیخ قنبر حسین سکندر پوری، آپ شاہ معین الدین کے ہم عمر اور شاہ قیام الحق کے مرید وخلیفہ ہونے کے ساتھ سکندر پور کے رئیس اور شاہ عبد العلیم آسی

غازی پوری کے والد تھے-۱۰ر محرم الحرام ۱۲۸۰ھ کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے- شاہ رشید الحق میر سید حسین علی جعفری (پ: ۱۲۲۶ھ، م: ۱۶ر رجب ۱۳۰۳ھ) آپ مولوی سید جعفر علی کے بیٹے اور اپنے حقیقی چچا فیاض الحق سید سجاد علی کے مرید و خلیفہ اور سجادہ نشین تھے- شاہ قیام الحق سے بھی مختلف سلاسل کی اجازت و خلافت حاصل تھی- ان کے علاوہ قطب الہند شاہ غلام معین الدین سے بھی اجازت و خلافت رکھتے تھے- سمات الاخیار کے مصنف نے ان تین کے علاوہ آپ کے چار اور خلفا کا بھی ذکر کیا ہے-

(۸) شاہ غلام معین الدین جون پوری (متوفی ۱۳۰۷ھ)

آپ کا نام غلام معین الدین، کنیت ابو الخیر اور لقب قطب الہند تھا- آپ حضرت قیام الحق کے چھوٹے لڑکے، مرید و خلیفہ، جانشین اور سلسلہ رشیدیہ کے پانچویں سجادہ تھے- اپنے والد سے مختلف سلاسل کی اجازت و خلافت کے علاوہ شیخ بدر الدین بدر عالم زاہدی سے سلسلۂ زاہدیہ کی بطریق اویسیہ اجازت و خلافت رکھتے تھے-

آپ نے حرمین شریفین کی زیارت کے لیے مکہ شریف کا سفر کیا تو حاجی امداد اللہ مہاجر مکی چشتی صابری نے آپ سے ملاقات کی اور جو کچھ مطلوب و مقدر تھا لے گئے- دوسرے دن جب دوبارہ تشریف لائے تو اپنا ایک رسالہ مع اجازت نامہ کے دے گئے-

صاحب سمات الاخیار تحریر کرتے ہیں کہ مولوی شاہ عبد الغفور ابو العلائی یوسف پوری جو بڑے سیاح اور بڑے مشائخ کی صحبت اٹھائے ہوئے درویش تھے، ان کا بیان ہے کہ ہند سے عرب تک میں نے اس جامعیت کا شیخ کہیں نہیں پایا- کسی نے مولوی صاحب سے پوچھا کہ شاہ معین الدین اور مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی میں کیا نسبت ہے؟ مولوی صاحب نے فرمایا کہ مولانا کی مثال اس شخص کی ہے جس نے بذات خاص ایک دولت پیدا کی ہو اور شاہ صاحب کی مثال اس آدمی کی ہے جس نے خود بنفس نفیس بھی دولت پیدا کی ہو اور اس کو اپنے باپ دادا کئی پشتوں کی دولت بھی ہاتھ لگی ہو- ۱۶ر ذی الحجہ ۱۳۰۷ھ کا دن قیامت ڈھانے والا تھا- اس شام کو مغرب کی فرض اور سنت نماز کے درمیان طالب مطلوب سے، عاشق معشوق سے جاملا-

[سمات الاخیار، ص: ۲۰۰/۲۰۳/۲۰۶/۲۳۳ ملخصاً]

تعمیری اور دعوتی خدمات

آپ کو اپنے مشائخ سے جو روحانی نعمتیں میسر آئی تھیں اس کی حفاظت کے ساتھ توسیع تو کی ہی ساتھ ہی خانقاہ رشیدیہ اور اس کے تحت قائم دیگر خانقاہوں میں وسیع پیمانے پر تعمیری و توسیعی کام بھی کرایا- خانقاہ رشیدیہ کے تقریباً تمام مشائخ ہی باضابطہ عالم و فاضل ہونے کے ساتھ شاعر، مدرس اور مصنف بھی تھے- شاہ معین الدین قطب الہند بھی باضابطہ عالم تھے، شعری ذوق بھی رکھتے تھے، آپ کے کچھ اشعار بھی ملتے ہیں، مگر آپ نے زیادہ توجہ افراد سازی اور خانقاہ کی توسیع و تعمیر پر صرف کی- مریدین و متوسلین کی تربیت و تزکیہ کے ساتھ آپ نے کچھ ایسے افراد تیار کیے جو بعد کی نسلوں کے لیے عظیم مربی واور مرشد ثابت ہوئے- حضرت آسی غازی پوری اور شاہد حسین راج گیری، محمد سجاد جعفری بہاری، واجد علی شاہ سبز پوش گورکھ پوری جیسے اشخاص آپ کے خلفا میں پیدا ہوئے- سمات الاخیار کے مصنف نے آپ کے دس خلفا کا مختصراً تذکرہ کیا ہے-

(۹) شاہ سراج الدین جون پوری (متوفی ۱۳۱۴ھ)

آپ کا نام سراج الدین عرف محمد حسین ہے آپ قاضی باسط علی کے، جو قیام الحق کے نواسے تھے، حقیقی پوتے اور حکیم مولوی قاضی محمد ناصر کے بیٹے اور قصبہ نظام آباد، اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے- شاہ سراج الدین قطب الہند شاہ غلام معین الدین کے مرید وخلیفہ اور جانشین اور متولی اوقاف اور سلسلہ رشیدیہ کے چھٹے سجادہ بھی ہوئے- ۱۳۱۴ھ میں آپ نے اس دنیا کو خیر باد کہا اور خانقاہ رشیدیہ جون پور میں مدفون ہوئے- آپ کا مزار اس سلسلے کے تمام سجادہ نشینوں کی طرح خام ہے- [سمات الاخیار، ص:۲۳۹ تا ۲۴۵ ملخصاً]

(۱۰) شیخ محمد عبد العلیم آسی غازی پوری (متوفی ۱۳۳۵ھ)

آپ کا نام محمد عبد العلیم اور تخلص آسی ہے- آپ اچھے شاعر، متبحر عالم اور زبردست صاحب استغراق صوفی، سلسلۂ رشیدیہ کے ساتویں صاحب سجادہ تھے- دنیا آپ کو بحیثیت صوفی شاعر کے آسی غازی پوری سے جانتی ہے- آپ ۱۹ رشعبان ۱۲۵۱ھ سکندر پور میں پیدا ہوئے- تاریخی نام خلیل اشرف رکھا گیا- بچپن ہی میں آپ کی والدہ کا انتقال ہوگیا- آپ کے نانا مفتی

احسان علی قاضی پوری، شاہ آباد نے آپ کی پرورش کی اور ابتدائی تعلیم سے بذات خود آراستہ کیا، پھر آپ اپنے والد کے پیر خانہ خانقاہ رشیدیہ میں حاضر ہوئے اور صاحب سجادہ شاہ غلام معین الدین سے بقیہ تعلیم حاصل کی۔ مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی آپ کے اساتذہ میں آتے ہیں۔ آپ کے اساتذہ کو بھی آپ کی ذکاوت پر ناز اور شاگردی پر فخر تھا۔

حضرت آسی غازی پوری سلسلۂ قادریہ احمدیہ میں شاہ غلام معین الدین سے مرید ہوئے اور ایک مدت تک آپ ہی کی صحبت سے فیض یاب ہوتے رہے۔ سفر میں بھی آپ ساتھ رہتے۔ بالآخر مختلف اشغال واذکار کی تعلیم کے ساتھ تمام سلاسل کی اجازت وخلافت سے نوازے گئے۔

آپ اپنے وقت کے طبیب حاذق بھی تھے حالاں کہ فن طبابت میں کوئی استاد نہ رکھتے تھے۔ سمات الاخیار کے مصنف تحریر کرتے ہیں کہ شاہ سراج الدین کی جانشینی سات ہی برس میں ختم ہوگئی اور ضرورت نے یہ سہرا آپ کے سر باندھا۔ سجادہ نشینی کے بعد جون پور میں مستقل قیام فرمایا۔ خانقاہ کے مشاغل اور اہل طلب کی کثرت کی وجہ سے رفتہ رفتہ طبابت چھوٹ گئی۔

[سمات الاخیار، ص: ۲۵۴/۲۵۵]

دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں کہ جب تک سجادہ نشینی کی خدمت آپ کے متعلق نہیں ہوئی تھی تب تک باوجود تکمیل مراتب ظاہری وباطنی وتحصیل اجازت وخلافت کبھی کسی کو مرید نہیں کیا اور اپنے آپ کو طبابت کے بھیس میں ایسا چھپا رکھا کہ بجز اہل نظر کوئی پہچان نہ سکا اور آپ کی درویشی کی طرف کسی کا وہم وگمان بھی نہ جاسکا۔ (سمات الاخیار، ص: ۲۵۳]

آپ کی طبیعت میں قدرت اور ضبط کا اتنا مادہ تھا کہ مجال نہ تھی کہ کسی حالت میں کوئی راز کھل جائے۔ اواخر عمر میں چشتیت غالب آگئی تھی۔ بلا مزامیر کے سماع سنتے تھے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ قاضی عبدالبصیر معصوم پوری اور حافظ فریدالدین احمد غازی پوری آپ کی غزلیں شب کو سوتے وقت خوش الحانی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ ہاں منڈواڈیہہ کے عرس میں گاگر اٹھتے وقت جو باقاعدہ قوالی ہوتی ہے اس میں آپ شریک ہوتے تھے۔ وجد کی حالت میں صرف آنکھیں سرخ ہو جاتی تھیں اور بس۔ آپ کی شادی ہوئی اولاد بھی ہوئے مگر نسبی سلسلہ قائم نہ رہا۔

[سمات الاخیار، ص: ۲۵۶/۲۷۴/۲۷۵ ملخصا]

آپ نے اپنی زندگی ہی میں اپنی جانشینی کے سلسلے میں غور و فکر کیا اور سلسلے کے اصحاب حل و عقد سے مشورہ اور روحانی اشارات کے بعد شاہ سید شاہد علی سبز پوش کو اپنا جانشین بنا دیا۔ اس واقعے کو سمات الاخیار کے مصنف نے تحریر کیا ہے کہ جانشینی کا مسئلہ ایک اہم مسئلہ تھا جو اکثر مریدین یا احباب کبھی کبھی آپ سے پوچھ بیٹھتے تھے کہ آپ نے کس کو تجویز فرمایا ہے، اس لیے کہ آپ کے بعد اول تو انتخاب میں دقت پڑے گی دوسرے انتخاب صحیح ناممکن بھی ہے۔ اس وقت آپ یہی فرماتے تھے کہ میں نے شاہ سراج الدین اور مفتی غلام قادر دو لڑکوں کو منتخب کیا تھا لیکن خدا کی مشیت اور تھی اب میں اپنی رائے سے کچھ نہ کروں گا۔ اگر چہ آپ اسی جواب سے دوسروں کو ساکت و صامت فرما دیتے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ خود بھی اس سوال کی اہمیت خوب سمجھتے تھے۔ جب وقت آیا تو آپ نے حضرت قطب الاقطاب ابوالبرکات شمس الحق شیخ محمد رشید مصطفیٰ قدس سرہ کے خلیفۂ اجل و اکمل حضرت میر سید قیام الدین گورکھ پوری رحمۃ اللہ علیہ کی نسل سے جناب سید شاہد علی صاحب کا انتخاب فرمایا اور اپنی صحبت کیمیا خاص میں رکھنے لگے۔

۱۳۲۹ھ میں آپ کا لقب شہود الحق اور نام رشید الدین ارشاد ہوا اور یہ بھی فرمایا کہ یہ نام و لقب پیروں نے میرے دل میں ڈالا ہے۔ اس کے بعد آپ نے خلافت نامہ بھی زیب رقم فرمایا۔ [سمات الاخیار، ص: ۲۷۶/۲۷۷]

حضرت آسی غازی پوری کا آخری دور استغراقی دور تھا۔ تقریباً پندرہ سولہ سالوں تک حالت استغراق میں رہے اور ۱۳۳۵ھ میں وصال ہو گیا۔ سمات الاخیار کے مصنف تحریر کرتے ہیں وصال کے قریب زمانے میں آپ کی ہیبت بہت بڑھ گئی تھی۔ خلوت و جلوت میں ساتھ رہنے والے اور ہر وقت بات کرنے والے مقربین کو بھی لب کھولنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ مریدانِ خوش اعتقاد روزانہ بعد نماز مغرب حاضر ہوتے مگر سلام کرنے یا قدم بوس ہونے کی جرأت نہ ہوتی۔ آہستہ پلنگ کی پٹی چوم کر تخت پر بیٹھ جاتے۔ کبھی آپ آہٹ پا کر اگر پوچھ لیتے کہ کون؟ تو بتا کر سلام عرض کرتے اور اگر اس سے زیادہ متوجہ پاتے تو جرأت کر کے قدم بوس بھی ہو لیتے، ورنہ پٹی چوم کر واپس آجاتے۔ وصال کے وقت تک بجز افراط استغراق و غلبۂ محویت کوئی مرض نہ تھا۔ [سمات الاخیار، ص: ۲۷۹]

وقت وصال جانب قبلہ اس شوق سے ملاحظہ فرمار ہے تھے کہ دیکھنے والے بھی اس کا امتیاز اچھی طرح کر سکے کہ ایک عاشق اپنے معشوق کو اشتیاق آمیز نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ آخر وہ قیامت خیز تاریخ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ کی دوسری پہنچ گئی اور وہ محشر انگیز روز اتوار آہی گیا جس میں اپنے وابستگان دامن ارادت کی چشم ظاہر سے آپ نے ہمیشہ کے لیے پردہ فرمالیا۔ یعنی وہ مستغرق دریائے شہود، غواص محیط وحدۃ الوجود، فانی فی اللہ، باقی باللہ، قطب المشائخ والعالمین، شیخ الاسلام والمسلمین حضرت مولانا شاہ محمد عبد العلیم رشیدی قدس سرہ پچاسی برس کی عمر میں اول وقت ظہر ایک بج کر بیس منٹ پر واصل بحق ہوئے۔

آج آسی نے کر لیا پردہ
ہم غریبوں سے وہ کریم چھپا

آپ کے وصال کے بعد آپ کے جانشین حضرت سید شاہ شاہد علی سبز پوش نے جن رسومات کی ادائیگی کی اس کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں جناب سید صاحب نے جون پور کی خانقاہ میں حسب معمول خاندان رشیدی سوم، دسواں، بیسواں، چالیسواں وغیرہ کیا جس طرح حضرت نے اپنے پیر ومرشد کا سوم وغیرہ بھن برہ سے آکر خانقاہ جون پور میں فرمایا تھا۔ ہر سال حسب آداب خاندان رشیدی غازی پور میں عرس کرتے ہیں اور مہمانوں کی میزبانی و راحت رسانی کو سعادت دارین سمجھتے ہیں۔ قابل ذکر امر یہ ہے کہ جو اہل غازی پور کی خدمت میں روزانہ بلاناغہ حاضر ہوا کرتے تھے، وہ اب بھی بلاناغہ بعد نماز مغرب فاتحہ کے لیے حاضری کو لازمی سمجھتے ہیں۔ ہر جمعرات کی شام کو مزار مبارک پر قل ہوا کرتا ہے۔ [سمات الاخیار، ص: ۲۸۲]

سلسلۂ رشیدیہ کے تقریباً تمام مشائخ کا یہ معمول رہا ہے کہ وہ طالبین وسالکین کی تعلیم و تربیت کرتے اور اسی کے پردے میں مقامات تک پہنچانے کی کوشش کرتے یعنی علم وعمل کے پردے ہی میں سارا کام ہو جاتا۔ اسرار و معارف کی باتیں بہت کم ظاہر ہو پاتیں۔ اس سلسلے کے مشائخ اور ان کے اخلاف کا حلقہ بہت بڑا تھا۔ حضرت آسی غازی پوری کے خلفا میں زیادہ تر ایسے اصحاب تھے جن کو ارادت بھی آپ ہی سے تھی مگر بعض وہ تھے جن کو صرف خلافت واجازت آپ سے تھی۔ وہ علما و مشائخ جن کو ارادت وخلافت دونوں آپ سے تھی۔ ان میں سے سمات

الاخیار کے مصنف نے ۹ رکا ذکر کیا ہے جس میں شاہ شاہد علی سبز پوش گورکھ پوری جو آپ کے جانشین بھی ہوئے ان کے علاوہ سید شاہ عبد العزیز بہاری، سید شاہ نذیر احمد بہاری، شاہ عبد الحق ظفر آبادی بھی شامل ہیں۔

جن مشائخ کو صرف خلافت میسر آئی، ان میں مولوی عبد السبحان غازی پوری بھی ہیں۔ بیعت و تعلیم آپ کو مولانا عبد القادر شاہ غازی پوری سے حاصل تھی۔ ۲۴ر جمادی الاولیٰ ۱۳۴۳ھ بنگال میں وصال ہوا، غازی پور میں مدفون ہوئے۔ دوسرے مفتی محمد وحید قادری جو آسی صاحب کے ماموں زاد بھائی اور قاضی عنایت حسین چریا کوٹی کے مرید تھے۔ تیسرے شاہ محمد فصیح شیخ پوری، آپ خواجہ محمد عیسیٰ تاج کے چھوٹے بھائی تھے۔ آپ اپنے والد شاہ عنایت حسین بلیاوی کے مرید تھے اور بعد میں حضرت آسی سے اجازت و خلافت میسر آئی۔ چوتھے شیخ محمد امیر معصوم پوری، آپ بلیا کے رئیس اور شاہ علی حبیب سجادہ نشین خانقاہ مجیبیہ پھلواروی کے مرید اور فیض یافتہ تھے۔ چوں کہ آپ کے بزرگوں کو مشائخ خانقاہ رشیدیہ سے برابر بیعت رہی، اس نسبت کو باقی رہنے کے لیے آخر عمر میں آپ حضرت آسی سے طالب ہوئے اور اجازت و خلافت سے نوازے گئے۔ ان کے علاوہ شاہ محمد ادریس پھلواروی، شاہ ذاکر حسین چوکی قتال پوری، مولوی عبد الرحیم سیوانی، مولوی محب اللہ غازی پوری، شاہ الفت حسین غازی پوری اور مولانا سید محمد فاخر بے خود اجملی الٰہ آبادی کو بھی حضرت آسی غازی پوری سے اجازت و خلافت حاصل تھی۔

آسی غازی پوری کی علمی خدمات

یوں تو سلسلۂ رشیدیہ کے تمام مشائخ و علما نے علمی اور دعوتی خدمات میں اپنی حصہ داری پیش کی مگر بعض وہ مشائخ جو علمی اور دعوتی خدمات کے اعتبار سے ممتاز حیثیت کے مالک ہیں، ان میں ایک نام حضرت آسی غازی پوری کا بھی آتا ہے۔ آپ نے خانقاہ رشیدیہ اور اس کے تحت چلنے والی خانقاہوں کی تعمیر و ترقی، رفاہ عام، خدمت خلق، درس و تدریس، تصنیف و تالیف، ارشاد و ہدایت اور دعوت و تبلیغ سارے میدانوں میں اپنے وجود کا احساس دلایا۔ ایک طرف علمی اور روحانی اعتبار سے جہاں اچھے اور مفید افراد تیار کیے، وہیں دوسری طرف تصنیف و تالیف اور صوفیانہ و عارفانہ شعر گوئی اور غزل گوئی میں آپ نے ایک مثال قائم کی۔ آپ کی تصنیفات میں

سراج الصرف، فوائد صدیقیہ اور قواعد جوہریہ کا ذکر ملتا ہے۔شعر گوئی کے ذریعے ناسخ جیسے شعرا نے زبان کی صفائی و شستگی میں جو سعی بلیغ تھی اسے حضرت آسی نے آگے بڑھایا اور مزید نئی راہیں ہموار کیں بلکہ حضرت آسی نے اس فن میں جو کمال حاصل کیا اور جیسے تلامذہ پیدا کیے ان کی بنیاد پر آپ کو ناسخ وقت کہنا بے جا نہ ہوگا۔حضرت آسی کا کلام مجاز کے پردے میں حقیقت کا جلوہ دکھاتا ہے، خود فرماتے ہیں:

اگر بیان حقیقت نہ ہو مجاز کے ساتھ
وہ شعر لغو ہے آسی کلام ناکارا

آپ کے خلیفہ و جانشین سید شاہ شاہد علی نے آپ کے وصال کے بعد عین المعارف کے نام سے آپ کے کلام کا مجموعہ شائع کیا۔

(۱۱) سید شاہ شاہد علی سبز پوش فانی گورکھپوری (متوفی ۱۳۷۲ھ)

آپ کا نام شاہد علی اور لقب رشید الدین و شہود الحق اور تخلص فانی تھا۔آپ حضرت آسی غازی پوری کے مرید و خلیفہ اور سلسلۂ رشیدیہ کے آٹھویں سجادہ جانشیں تھے۔آپ کے والد کا انتقال آپ کی پیدائش سے ۳ ماہ ۳ دن قبل ہو گیا۔آپ کا نسبی سلسلہ ۲۹ رواسطوں سے حضرت علی امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔آپ اپنے وقت کے متبحر عالم شریعت، عارف باللہ اور اچھے شاعر تھے۔

خانقاہ رشیدیہ کے موجودہ سجادہ حضرت مفتی عبید الرحمٰن رشیدی مدظلہ العالی تحریر کرتے ہیں:

آپ حضرت سرکار آسی مولانا الشاہ محمد عبد العلیم قدس سرہ کے مرید خاص اور خلیفۂ اول اور خانقاہ رشیدیہ جون پور کے سجادہ نشین رہے ہیں۔آپ کی ذات والا صفات محتاج تعارف نہیں۔حضرت ملک العلما مولانا ظفر الدین فاضل بہاری مصنف صحیح البہاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ ''موذن الاوقات'' میں آپ کے جو آداب والقاب ذکر فرمائے ہیں وہ یہ ہیں:

''عارف باللہ، مقبول بارگاہ، ملحق الاصاغر بالاکابر، وارث العلم والفضل والمجد والشرف، کابراً عن کابرٍ، جامع شریعت وطریقت، حاوی اسرار حقیقت و معرفت، عالی جناب، معلّی القاب سید شاہد علی صاحب سبز پوش سجادہ نشین خانقاہ رشیدیہ علیمیہ، جون پور، دام بالفیض والسرور الی

مرالہ ہور۔'' [خطبات رشیدیہ، ص:۳۰]

حضرت مفتی صاحب نے الاحسان کو دیے گئے اپنے تحریری انٹرویو میں یہ بات بھی تحریر کی ہے کہ حضرت ملک العلما ظفر الدین بہاری، حضرت سید شاہ شاہد علی سبز پوش کے خلیفہ شاہ ایوب ابدالی خانقاہ اسلام پور پٹنہ کے اجازت یافتہ بھی تھے، اور یہ بھی تحریر کیا ہے کہ ۱۹۴۶ء میں بنارس میں چار روزہ سنی کانفرنس کے انعقاد کے سلسلے میں حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی خلیفۂ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ نے خانقاہ رشیدیہ کے ۹/ویں سجادہ نشیں سید شاہ شاہد علی سبز پوش قدس سرہ سے ملاقات کی اور ان کو کانفرنس کے اغراض ومقاصد سے آگاہ کیا۔

مخلوق خدا کے ساتھ وقت کے بڑے نام ور شعرا سے بھی آپ کے اچھے تعلقات تھے۔ چند نام ور شعرا جو آپ سے اپنے تعلقات پر فخر کرتے تھے ان میں حفیظ جون پوری، جگر مراد آبادی، وصل بلگرامی وغیرہم ہیں۔ (دیوان فانی، ص:۱ر تا ۳۰ ملخصاً) اور ان جیسے دیگر علما وشعرا مثلاً علمائے فرنگی محل، اصغر گونڈوی، ہادی مچھلی شہری، حسرت موہانی، سیماب اکبر آبادی سے بھی آپ کے خاص روابط تھے۔ (سمات الاخیار، ص ۳۰۱ تا ۳۰۳ ملخصاً) آپ نے دیوان فانی کے نام سے ایک شعری دیوان چھوڑا ہے جو عارفانہ اور صوفیانہ شاعری کا مجموعہ ہے۔ دعوت وتبلیغ کو جاری رکھتے ہوئے روحانی نعمتوں کو عام کرنے اور رہتی دنیا کے لیے رشد وہدایت کا سلسلہ باقی رکھنے کی غرض سے آپ نے کچھ افراد کی تعلیم وتربیت کر کے ان کو اجازت وخلافت سے بھی سرفراز فرمایا۔ ان میں سے چند جن کا نام کتابوں میں ملتا ہے وہ یہ ہیں: سید مصطفیٰ علی سبز پوش، سید شاہ ایوب ابدالی سجادہ نشیں خانقاہ اسلام پور پٹنہ، سید عبد الشکور سادات پوری، مولوی محمد یٰسین چمنی بازار پورنیہ، مولوی ذاکر حسین چوکی قتال پور، سیوان، بہار، حکیم لطیف الرحمٰن چمنی بازار، پورنیہ بہار۔

[سمات الاخیار، ص ۳۰۸]

(۱۲) سید شاہ مصطفیٰ علی سبز پوش آسی گورکھپوری (متوفی ۱۳۸۵ھ)

آپ سید شاہد علی سبز پوش کے لڑکے و جانشین اور خانقاہ رشیدیہ کے ۹/ویں سجادہ اور موجودہ سجادہ نشیں مفتی عبید الرحمٰن رشیدی مدظلہ العالی کے شیخ ارادت تھے۔ مدرسیہ صولتیہ مکہ معظمہ کے سند یافتہ عالم اور صاحب تصرف صوفی تھے۔ بہار کے ضلع چمپارن میں جہاں وہابیوں کا زور تھا

آپ نے زبردست دعوت وتبلیغ کی جس کی وجہ سے ہزاروں مسلمانوں نے توبہ کی اور جماعت اہل سنت میں شمولیت اختیار کی۔ [سمات الاخیار، ص:۳۰۹]

۱۸/ذی القعدہ ۱۳۷۸ھ/۱۱/جولائی ۱۹۵۸ء کو گورکھ پور میں شہادت کی موت پائی اور واصل بحق ہوئے۔ جون پور، رشید آباد میں مدفون ہوئے۔ آپ کے بعد خانقاہ کا انتظام وانصرام کچھ دنوں تک سید ہاشم علی کے سپرد کیا گیا پھر رشد و ہدایت کا کام سید شاہد علی کے خلیفہ سید شاہ ایوب ابدالی جو شاہ مصطفیٰ علی شہید کے مرشد کامل ہوتے ہیں، ان کے حوالے کیا گیا۔

[سمات الاخیار، ص:۳۰۹ تا ۳۱۱ ملخصا]

سلسلۂ رشیدیہ کے تقریباً تمام مشائخ کا یہ معمول رہا ہے کہ وہ طالبین وسالکین کی تعلیم و تربیت کرتے اور اسی کے پردے میں مقامات تک پہنچانے کی کوشش کرتے یعنی علم وعمل کے پردے ہی میں سارا کام ہو جاتا۔ اسرار و معارف کی باتیں بہت کم ظاہر ہو پاتیں۔ اس سلسلے کے مشائخ اور ان کے اخلاف کا حلقہ بہت بڑا تھا۔

سلسلۂ رشیدیہ کی موجودہ علمی ودعوتی سرگرمیاں

بانی سلسلۂ رشیدیہ شیخ محمد رشید جن کی عارفانہ حیثیت کو ان کے ہم عصر مشائخ وصوفیہ نے تسلیم کیا اور جن کے تبحر علمی کی شبلی اور ان جیسے دیگر علما اور دانش وروں نے قصیدہ خوانی کی ہے، اس سلسلے کے مشائخ کی علمی اور روحانی حیثیتوں کو ملک العلما ظفر الدین بہاری جیسی عبقری شخصیات نے بھی تسلیم کیا اور ان کے ادبی اور شعری شہ پاروں کو دیکھ کر غالبؔ اور ناسخؔ جیسے فن کار شعر وسخن نے رشک کیا ہے۔ اس عظیم خانقاہ کی علمی اور روحانی حیثیت آج بھی باقی ہے۔ اس وقت ایک صاحب سجادہ کی نگرانی میں اس سلسلے کی پانچ خانقاہیں مختلف مقامات پر چل رہی ہیں۔ سب کے سب دعوت وتبلیغ اور خدمت خلق میں مصروف ہیں اور اپنے مشائخ کے نقش قدم پر عمل کرتے ہوئے اشاعت علم ومعرفت کا سلسلہ جاری رکھی ہوئی ہیں۔ یہاں کے موجودہ صاحب سجادہ حضرت مفتی عبید الرحمٰن رشیدی کی لائق تعریف اور حکیمانہ قیادت میں مختلف مقامات پر اس سلسلے کے ترجمان مختلف معیاری علمی ادارے چل رہے ہیں جہاں سیکڑوں کی تعداد میں طالبان علوم نبویہ اپنی علمی تشنگی بجھا رہے ہیں۔ ان اداروں کے اسما یہ ہیں:

(۱) دار العلوم مصطفائیہ، چمنی بازار، پورنیہ، بہار

(۲) دار العلوم سرکار آسی، سکندر پور، بلیا

(۳) دار العلوم طیبیہ معینیہ، بنارس

(۴) دار العلوم رشیدیہ، جون پور

(۵) دار العلوم حیدریہ معینیہ، سیوان

(۶) دار العلوم علیمیہ شاہدیہ، غازی پور

(۷) مدرسہ آستانۂ رشیدیہ جون پور

مشائخ سلسلۂ رشیدیہ کا اعتقادی، فقہی اور صوفی مسلک

خانقاہ رشیدیہ ہندوستان کی قدیم روحانی اور علمی خانقاہ ہے- یہاں کے مشائخ نے اپنی علمی اور دعوتی دونوں حیثیتوں کو ثابت کیا اور ان دونوں میدانوں میں بے لوث خدمات انجام دیں- اس سلسلے کے مشائخ نے اعتقادی، فقہی اور سوانحی کتابیں بھی لکھی ہیں- خود بانی خانقاہ رشیدیہ شیخ محمد رشید قدس سرہ نے فن مناظرہ کی مشہور کتاب شریفیہ کی رشیدیہ کے نام سے جو شرح کی ہے وہ ان کے دینی افکار اور خیالات کو ثابت کرتی ہے- یوں ہی اس سلسلے کے مشائخ کی تصنیفات و تالیفات اور ملفوظات مثلاً: گنج رشیدی، گنج ارشدی، گنج فیاضی، کرامات فیاضی، مناقب العارفین، سمات الاخیار، عین المعارف، دیوان فانی وغیرہ کے مطالعے سے واضح طور پر جن افکار و نظریات اور خیالات کا علم ہوتا ہے اس کو ذیل میں قلم بند کیا جاتا ہے:

اعتقادی مسلک

ہندوستان کی دیگر خانقاہوں اور خانوادوں کے علما و مشائخ کی طرح سلسلۂ رشیدیہ کے علما و مشائخ اعتقادی طور پر حضرت امام ابو منصور ماتریدی قدس سرہ کے پیروکار رہے ہیں اور صدیوں سے متواتر طور پر چلے آ رہے اہل سنت کے معتقدات و معمولات خواہ وہ ضروری ہوں یا ظنی، ان کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں-

فقہی مسلک

ہندوستان کی اکثر مسلم آبادی فقہ و فتاویٰ میں حضرت امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت قدس

سرہ کی پیروی کرتی ہے۔ ہندوستانی علما و مشائخ نے فقہ حنفی کی صرف پیروی ہی نہ کی بلکہ وسیع پیمانے پر اس مسلک و مذہب کی ترویج و اشاعت بھی کی ہے۔ سلسلۂ رشیدیہ کے علما و مشائخ نے بھی دعوت و تبلیغ اور درس و تدریس کے ساتھ اپنی تصنیفات و تالیفات کے ذریعے بھی فقہ حنفی اور مسلک امام اعظم ابوحنیفہ قدس سرہ کی ترویج و اشاعت اور تبلیغ میں اپنے وجود کا احساس دلایا ہے۔

صوفی مسلک

حضرت خواجہ غریب نواز قدس سرہ کی حکیمانہ دعوت و تبلیغ کی بنیاد پر چشتی نسبت نے قدیم ہندوستان کے اکثر حصوں کو اپنی روحانیت سے منور اور پر سکون بنا دیا۔ بہت سے دوسرے مشائخ نے قادریت، نقش بندیت اور سہروردیت کی بھی ترویج و تبلیغ کی اور ان تمام روحانی چشموں سے خود بھی فیض یاب ہوئے اور دوسروں کو بھی فیض یاب فرمایا۔ البتہ چشتیت اور قادریت کا غلبہ ہندوستان میں زیادہ رہا۔ خانقاہ رشیدیہ جون پور بھی اصلاً چشتی خانقاہ ہے لیکن یہاں کے مشائخ کو دیگر مختلف سلاسل کی اجازت و خلافت شروع سے چلی آ رہی ہے۔ یہاں کے اکثر مشائخ نے زیادہ تر بیعت، سلسلۂ چشتیہ اور قادریہ میں کی ہے اور اجازت سے نوازا ہے۔ یہاں کے بعض مشائخ چشتی صوفی رسوم مثلاً رقص و سماع وغیرہ سے بھی خوب لطف اندوز ہوئے ہیں۔

سماع اور وجد و کیف اور رقص کے تعلق سے مناقب العارفین کے مصنف شیخ یٰسین جھونسوی اپنے شیخ ارادت مخدوم شاہ طیب بنارسی جو شیخ محمد رشید بانی سلسلۂ رشیدیہ کے شیخ اجازت اور شیخ تربیت ہیں، کے بارے میں تحریر کرتے ہیں: ''ابتدا میں آپ قدس سرہ کو سماع سے بہت شغف تھا اور وجد و رقص بہت فرماتے تھے اور اکثر صالح قسم کے قوال آپ کے ساتھ رہتے تھے۔ کبھی کبھی سماع کے جوش میں جنگل کی طرف چلے جاتے، دور دراز جنگل میں رہتے اور کوئی نہ جانتا کہ آپ کہاں ہیں، لیکن جب قوال اس نواح میں جاتے اور گانا شروع کرتے تو اس کو سنتے ہی آپ کسی طرف سے ظاہر ہو جاتے اور رقص میں مشغول ہو جاتے۔ جب آپ پر حال طاری ہوتا اور آپ رقص فرماتے تو در و دیوار مست ہو جاتے اور ایسا معلوم ہونے لگتا کہ ہر چیز عالم رقص میں ہے۔ بہت سی راتیں اسی حال میں گزر جاتیں۔ آخر وقت میں سماع سے پرہیز فرمایا اور اپنے اختیار سے نہیں سنتے تھے۔ فرمایا کرتے کہ اس دور میں سرود نہیں سننا چاہیے کیوں کہ اس کی کوئی شرط باقی

نہیں رہ گئی ہے، زمانہ فاسد ہو چکا ہے، یاران موافق نہیں رہ گئے ہیں اور قوالوں میں طمع جاگزیں ہوگئی ہے، اس لیے ایسے وقت میں سرود کا سننا فقرا کے طریقہ سے مناسبت نہیں رکھتا۔"

[مناقب العارفین، ص:۵۷،۶۷]

اور شیخ محمد ارشد ابن شیخ محمد رشید کے بارے میں سمات الاخیار کے مصنف ایک واقعہ یوں تحریر کرتے ہیں: "سماع کا سننا بعض روایتوں سے ثابت ہے- حضرت راجی سید احمد حلیم اللہ مانک پوری کا عرس تھا، بہت سے بزرگان دین مل کر گاگر بھرنے چلے، قوال ساتھ تھے، واپسی میں جب یہ شعر گایا: ؎

شنیدہ ام کہ سگاں را قلادہ می بندی
چرا بہ گردن حافظ نمی نہی رستے

آپ پر ایسی حالت طاری ہوگئی کہ دستار مبارک اتار کر قوال کو عطا فرمایا- پھر دوسروں نے بھی تبعاً اپنی اپنی دستار دے ڈالی- آپ کی حالت نے ایسی تاثیر پیدا کی کہ دیکھنے والوں کی بھی حالت متغیر ہوگئی- اسی طرح حضرت مخدوم طیب بنارسی کے عرس میں آپ کو حال آیا- پہلے آپ نے بہت کچھ ضبط کیا مگر ضبط نہ ہوسکا تو فرمایا کہ حضرت مخدوم کی روح (روحانیت) نے غلبہ کیا- بزرگان چشتیہ نے سماع کی تعریف یوں کی ہے کہ سماع ایک تازیانہ ہے جو محبّ کو محبوب کی طرف ہنکاتا ہے اور ایک وسیلہ ہے جو دلوں کو معشوق کے قریب پہنچاتا ہے- رموز رحمانی میں سے ایک رمز ہے جو بیان سے کھل نہیں سکتا اور زبان سے ادا ہوسکتا نہیں- شوریدگان محبت اس سے محظوظ ہوتے ہیں اور ہشیار و خود پرست اس سے بے بہرہ رہتے ہیں- سچ ہے ؎

حدیث عشق باخبار در نمی گنجد بیان شوق بگفتار در نمی گنجد

[سمات الاخیار، ص:۱۲۱]

معلوم ہوا کہ یہاں کے مشائخ نے سماع کے جو شرائط ہیں، ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے، سماع کا لطف اٹھایا ہے- جب جب شرائط پائے گئے تو سماع کیا اور جب شرائط کا فقدان رہا تو پرہیز کیا- یہی صوفیہ صافیہ کا طریقہ چلا آرہا ہے- آج بھی اگر شرائط یعنی زمان، مکان اور اخوان پائے جائیں تو اس کا لطف لیا جاسکتا ہے، ورنہ پرہیز بہتر ہے-

کتابیات

(۱) سمات الاخیار، مولوی محمد عبدالمجید وسید محمد اصغر ایوبی، ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی
مطبع: جمیل برادرز، لیاقت آباد، کراچی، ۱۴۱۹ھ
(۲) دیوان فانی، سید مصطفیٰ علی رشیدی، ناشر، انجمن فیضان رشیدی، کلکتہ
(۳) مناقب العارفین، شیخ یٰسین جھونسوی، مترجم ناشر: خانقاہ رشیدیہ جون پور شریف
(۴) عین المعارف، مولف: شاہ شاہد علی رشیدی، ناشر: انجمن فیضان رشیدی، کلکتہ
(۵) انوار الاولیا، مؤلف: مولوی حبیب اللہ مختار، خرم پرنٹنگ پریس، کراچی، ۲۰۰۰
(۶) ماہ نامہ جام نور، نئی دہلی، فروری ۲۱۰۲ء
(۷) تذکرہ علمائے ہند، مولوی رحمٰن علی، مطبع منشی نول کشور، لکھنو، ۱۹۱۴ء
(۸) حدائق الحنفیہ، مولوی فقیر محمد جہلمی، مکتبہ رضویہ، دہلی، ۲۰۰۶ء
(۹) نزہۃ الخواطر، عبدالحی الحسنی، مکتبہ دار عرفات، دائرہ الشیخ علم اللہ، رائے بریلی، ۱۹۹۲ء
(۱۰) مآثر الکرام، غلام علی آزاد بلگرامی، مترجم: یونس رضا اویسی، جامعۃ الرضا، بریلی، ۲۰۰۸ء
(۱۱) خطبات رشیدیہ، مولانا ذاکر حسین لطفی، مکتبہ آسی، بلیا، ۱۴۱۴ھ

☆☆☆

خانقاہ رشیدیہ کی مثالی وامتیازی خصوصیات

مولانا عبدالغفار نوری ☆

خدائے ذوالجلال نے مشائخ طریقت اور صوفیۂ ملت کو عام انسانوں کے مقابل جو ارفع و اعلیٰ مقام عطا فرمایا ہے اور شرف و بزرگی کی عظیم دولتوں سے مالا مال کیا ہے، وہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے اور یہی شرف و بزرگی صوفیۂ کرام کو امتیازی خصوصیات عطا کرتی ہیں۔ خداوند قدوس کے یہ وہ نیک اور برگزیدہ بندے ہیں کہ ان کے دامن کرم سے وابستہ ہو جانے کے بعد انسان اپنے گوہر مراد کو پالیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خانقاہوں کے قیام سے دین متین کی ترویج و اشاعت کو خاصا فروغ و استحکام حاصل ہوتا ہے۔ علمائے ظاہر سالہا سال میں جو منازل طے کراتے ہیں، علمائے باطن اور معرفت خداوندی کے حاملین چند لمحوں میں کر دکھاتے ہیں۔

پیر بن جانا تو بہت آسان کام ہے مگر دین متین کی خاطر اپنی ہستی کو فنا کر دینا اور نفس امارہ کو اپنے قبضہ واختیار میں رکھ کر شریعت کے مطابق عمل پیرا ہونا انتہائی مشکل کام ہے۔ اور جو حق شناس شخصیت جتنے ہی عظیم منصب پر فائز ہوتی ہے، انہیں اتنی ہی مشکل اور پر خار وادیوں سے بھی گذرنا پڑتا ہے۔ بقول شیخ محمد رشید جون پوری (حضرت دیوان جی) کے:

☆ استاد دارالعلوم سرکارِ آسی سکندر پور، بلیا

''طلب کامل وہی ہے جو اپنی زبان سے کہنے کی نوبت نہ آئے اور شیخ خود اس کی غرض کی طرف توجہ کرے، اور خرقہ اس شخص کو پہننا چاہیے کہ جس قدر سوئیاں کہ خرقہ میں چبھوئی گئی ہوں، اگر اس کے بدن میں ناحق چبھوئی جائیں تو تحمل کرے۔''

اس قول سے آپ یہ درس دینا چاہتے ہیں کہ طریقت محض گدڑی پہن لینے کا نام نہیں بلکہ اوصاف ذمیمہ کو دور کرے، اور اوصاف حمیدہ سے اپنے آپ کو مزین و مرصع کر کے زندگی گزارنے کا نام ہے۔

لیکن آج کل کچھ زر پسند اور ہوس پرست پیروں نے منصب طریقت کو آسان سمجھ لیا ہے، جب بھی جیب خاص میں کمی واقع ہوئی، مریدوں کی بارگاہوں میں حاضری دے دی اور دنیاوی مال و دولت سے اپنے دامن کو بھر کر واپس آ گئے۔ بعض کا تو حال یہ ہے کہ بغیر بلائے از خود حاضر ہوتے ہیں۔ جب کہ کسی بھی ذی منصب کے لیے یہ قطعی روا نہیں ہے کہ بن بلائے کسی کے دروازے پر دستک دے، خصوصاً امرا و حکام کے دروازے پر جانا۔ اس لیے کہ علمائے سابقین نے ارباب حکومت اور اہل اقتدار کے پاس جانے کو ناپسند کیا ہے۔ چناں چہ حضرت امام غزالی نے ایسے علما کو ''علمائے سو'' یعنی خراب علما کی علامتوں میں سے ایک علامت بتایا ہے۔ اور بقول علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ کے:

''شیطان کے اہل علم کو متاثر کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ارباب اقتدار کے پاس ان کی آمد و رفت بڑھ جائے۔''

ظاہر ہے کہ یہ اس صورت میں ہے جب علما و مشائخ اپنی ذاتی اغراض یا عہدہ و منصب کے حصول کے لیے جائیں اور ان کی غلطیوں پر نشاندہی نہ کر پائیں۔ یہ اس لیے کہ جب تم ارباب اقتدار کے دروازے پر جاؤ گے تو تم جتنا اس سے دنیا حاصل کرو گے، اس سے زیادہ وہ تم کو تمہارے دین سے محروم کر دیں گے۔ جب حب دنیا غالب آ جائے تو اس کا علاج بہت مشکل ہے۔ فی زمانہ یہ بے اعتدالی جو پیروں میں عام ہو رہی ہے، اس میں یہی چیز کارفرما ہے۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ دین برائے دنیا ہو کر رہ گیا ہے، تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ حدیث میں ہے:

''الدنیا جیفۃ و طالبھا کلاب'' (دنیا مردار ہے اور اس کے طلب گار کتے ہیں)

یہی وجہ ہے کہ اجازت وخلافت کے لیے نہ اب ان کے نزدیک کوئی پیمانہ اور معیار رہ گیا ہے اور نہ ہی کوئی ضابطہ۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس دور انحطاط میں نہ پیروں کی کمی ہے اور نہ نادان مریدوں کی کثرت۔ بعض حضرات ایسے بھی دیکھے جاتے ہیں جو خلافت واجازت اور جبہ و دستار لیے ہوئے مسند طریقت پر براجمان ہیں۔ اگر ان سے تصوف کا کوئی مسئلہ پوچھا جائے تو بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔ تصوف تو درکنار شریعت کے ضروری و بنیادی مسائل ان سے دریافت کیے جائیں تو پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے اور عالم غضب میں یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ایسے مسائل سے ہمیں کیا سروکار، ان مسائل کا تعلق خانقاہوں سے نہیں دارالافتاؤں سے ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ جن کو علم سے دور کا واسطہ وسروکار نہ ہو اور خود قابل اصلاح ہو، وہ اپنے متعلقین و متبعین کو کیوں کر صحیح راستہ بتا سکتا ہے اور اپنے پیروکاروں کی کیا اصلاح کر سکتا ہے؟

اگر خانقاہ رشیدیہ، جون پور کے مشائخ کرام کی مثالی و امتیازی خصوصیات پر غیر جانب دارانہ نظر ڈالی جائے تو یہ بات اظہر من الشمس وابیض من الامس ہو جاتی ہے کہ خانقاہ رشیدیہ جون پور، ہندوستان کی ایک ایسی قدیم، تاریخی اور روحانی خانقاہ ہے جو دین وملت اور اعتقاد و مسلک کی صحیح ترجمانی اور اشاعت کے لحاظ سے ایک عظیم مرکز ہے۔ یہاں کے مشائخ کرام نے دین ومسلک کے میدان میں بے لوث خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے قیام کا تقریباً چار سو سال کا طویل عرصہ گذر گیا ہے، مگر آج بھی یہ پورے آب وتاب کے ساتھ دینی خدمات میں مصروف عمل ہے اور مخلوق خدا کی دلجوئی اور رشد وہدایت کا کام بحسن وخوبی انجام دے رہی ہے۔ اس خانقاہ کے اب تک جتنے بھی سجادہ نشین ہوئے ہیں، سب کے سب علم وفضل، زہد و ورع، تقوی و طہارت اور فقر واستغنا کے بلند مقام پر فائز رہے اور اتباع شریعت اور احیائے سنت وطریقت میں اہم مقام رکھتے تھے۔

اس سلسلے میں سب سے اہم اور خصوصی امتیاز یہ ہے کہ اس میں سجادگی کا معاملہ میراثی اور خاندانی نہیں ہے بلکہ جو بھی اولوالعزم اور بارگراں کو عقیدت ومحبت اور خلوص وللّٰہیت کے ساتھ سنبھالنے والا ہو، وہی اتفاق رائے سے اس کا سجادہ نشین ہوتا ہے۔ تمام مریدین ومعتقدین اور علمائے کرام اسے عزت واحترام سے چنتے ہیں اور انہیں حضرت دیوان جی کے جبہ ودستار سے

نوازتے ہیں اور حضرت دیوان جی کے ہی حجرۂ شریفہ میں داخل کرکے عہد و پیمان بھی لیتے ہیں۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ جو اس سلسلہ کا سجادہ نشین ہوتا ہے، اس کے ذمے اس خانقاہ کے ماتحت جتنی خانقاہیں اور اراضی و جائداد ہیں، مکمل ذمے داری سے اس کی دیکھ ریکھ کرنا اس کا روحانی اور ایمانی فریضہ قرار پاتا ہے۔ اگر کوئی سجادہ نشین اپنی ذمے داریوں کو صحیح ڈھنگ سے نہیں ادا کرپاتا اور بزرگان رشیدیت کے بتائے ہوئے اصول پر کھرا نہیں اترتا ہے تو جس طرح اس کی تاج پوشی کی جاتی ہے، اسی طرح واپس بھی لے لی جاتی ہے۔ ایسے کمالات عالیہ اور مجمع فیوض و برکات ہونے کے باوجود ان حضرات کے اندر وسیع النظر فی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

اس خانقاہ کے سجادہ نشینوں کی ایک عام مگر اس زمانے کے اعتبار سے بڑی اہم بات ہے کہ فقر و استغنا کے باوجود کبھی کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں فرماتے۔ نہ کبھی دنیاوی جاہ و حشمت، مال و منال اور سرخروئی کے لیے کسی کی ملازمت اختیار کی۔ یہاں تک کہ امرا و حکام نے بڑے بڑے عہدے اور ذمے داریاں سونپیں مگر دنیاوی جاہ و منصب سمجھ کر اس کی جانب کبھی راغب نہ ہوئے اور یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ ''فقیروں کو اس سے کوئی واسطہ نہیں''۔ اور فقر و قناعت کے دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں درج ہے کہ:

ایک مرتبہ بادشاہ نے اصرار کیا اور باریابی کی اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا کہ:

''اس فقیر کے گھر میں دو دروازے ہیں۔ بادشاہ اگر ایک دروازے سے آئے گا تو میں دوسرے دروازے سے باہر چلا جاؤں گا۔''

اس طرح سجاگان و مشائخ رشیدیہ دنیا طلبی کی خاطر خانقاہ سے کبھی قدم باہر نہ نکالا؛ بلکہ بزرگان سلاسل کی زیارت اور خدمت خلق کے لیے اکثر دور و دراز مقامات کا سفر کرتے اور بندگان خدا کی رشد و ہدایت اور رہنمائی فرماتے۔

چناں چہ شیخ محمد ارشد عثمانی جون پوری کے حالات میں درج ہے کہ:

آپ قول و فعل ہر امر میں حضرت دیوان جی کے قدم بقدم چلتے، نماز جنازہ اور مریضوں کی عیادت اور دعوت میں اکثر پیدل جاتے۔ کھانا اگر مل جاتا تو کھا لیتے ورنہ پرواہ نہ کرتے۔ جس

روز فاقہ ہوتا بہت خوش ہوتے۔ فقرا اور مساکین کے آنے سے بے حد مسرور ہوتے۔ سائل آپ کے در سے کمتر محروم ہوتے، قناعت اور توکل سے ہمیشہ کام رکھتے۔

سلسلۂ رشیدیہ کے تقریباً تمام مشائخ کا یہ معمول رہا ہے کہ وہ طالبین و سالکین کی تعلیم و تربیت کرتے اور اس کے پردے میں بلند مقامات تک پہنچانے کی کوشش کرتے۔ یعنی علم وعمل کے پردے میں ہی سارے کام ہو جاتے۔ اسرار و معارف کی باتیں کم ظاہر ہو پاتیں۔

اس خانقاہ کے مشائخ کرام کی شان اخفا کا یہ عالم ہے کہ کشف و کرامت کی تشہیر کو ہمیشہ برا تصور کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ صاحب کرامت ہونے کے باوجود کشف و کرامت کے واقعات بہت کم ملتے ہیں۔ حضرت آسیؔ کی بارگاہ عالیہ سے مستفیض ہونے والے حضرات کا بیان ہے کہ:

آپ سے سینکڑوں کرامتوں کا ظہور ہوا۔ مگر کوئی حاضر باش ایسا نہ تھا جس کے ہاتھ سے سینکڑوں کرامتوں کا ظہور نہ ہوا ہو؛ لیکن اخفا کا یہ عالم تھا کہ جو واقعہ جس کے ساتھ پیش آتا تھا دوسروں کو اس کی خبر نہیں ہو پاتی تھی۔ بارہا فرمایا کرتے تھے کہ ''میرے پیر و مرشد نے وصیت کی تھی کہ درویشی کو اس طرح چھپانا چاہیے جیسے عورت کرسف کو چھپاتی ہے۔''

اگر کوئی کرامت کا اظہار کرتا تھا تو اس کو نقصان ہو جاتا تھا۔ لوگوں کے دلوں کے خطرات کا جواب دوسروں سے گفتگو کے دوران بے تکلف دے دیتے تھے۔ جن کو صاحب خطرہ کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔

اسی طرح حضرت شاہ شاہد علی سبز پوش گورکھپوری فرماتے ہیں کہ:

ایک شخص بہت بیمار تھا، لائق سفر بھی نہیں، حضرت سے مرید ہونے کی تمنا پیدا ہوئی۔ اسی پس و پیش میں کہ حضرت کے پاس کیسے جا کر مرید ہوں اور نہ حضرت کو بلا سکتا ہوں۔ حضرت آسی نے اس کے حال کا مشاہدہ فرما لیا اور اپنے خادم سے فرمایا کہ فلاں ابن فلاں کا نام مریدوں کی فہرست میں لکھ لو۔ اور وہاں اس مرید کے تکیہ کے نیچے شجرہ ملا۔ اس کے بعد اس شخص نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

سنت رسول اور اسلاف کے طریقوں کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے اساتذہ کرام کا بے حد احترام کرتے تھے۔ بلکہ ان کے گھر کے در و دیوار کا احترام بھی ضروری خیال کرتے تھے۔

چناں چہ شیخ محمد رشید جون پوری کے حالات میں درج ہے:

''جب آپ استاذ العلما حضرت ملا افضل جون پوری کے یہاں پڑھنے کو جایا کرتے تھے تو پہلے چوکھٹ کو بوسہ دیتے پھر استاد کے قدموں کو چوم کر پڑھنے بیٹھتے۔''

آپ کے مرشد حضرت مخدوم شاہ طیب بنارسی قدس سرہ کا حکم تھا کہ:

''تم وظیفۂ صبح کے بدلے طلبہ کو سبق پڑھایا کرو کہ یہ بھی عبادت ہے۔''

اس طرح آپ طالبان علوم نبویہ کے سینے کو علم و معرفت کا گنجینہ بناتے رہے، اور ان سے بے حد عقیدت و محبت رکھتے تھے، ان کا طرح ادب واحترام فرماتے جس طرح مہمانوں کی قدر و منزلت کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ آپ اپنی وصیت میں لکھتے ہیں:

''جس پتھر پر طلبہ اپنی جوتیاں اتارتے ہیں میری قبر میں اس کا تختہ دیا جائے۔''

چناں چہ ایسا ہی کیا گیا پہلے بیر کے تختے دیے گئے پھر ان پر پتھروں کا تختہ دیا گیا۔

سبحان اللہ! یہ ہے درویش کامل اور صاحب تصرف و کرامت بزرگ کی طلبہ سے الفت و محبت جو اس دور میں بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ آپ کی بارگاہ کے حاضر باشوں کو مدعائے دلی ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ادھر دل میں کوئی خطرہ گذرا، ادھر ظاہر ہو گیا۔

اس خانقاہ کے سجادہ نشین حضرات کا یہ عام دستور تھا کہ مریدوں کے گھر بے بلائے کبھی نہ گئے اور غیر مریدوں کی دعوت قبول نہیں کرتے تھے۔ ملکیت کی طرف کبھی راغب نہ ہوئے۔ فقر و قناعت کو ہمیشہ اپنا شعار بنائے رہے۔ غیر مریدوں کی نذر بھی قبول نہیں کرتے۔ اور مریدین سے طلب و سوال نہیں کرتے۔ بے طلب اگر کسی مرید نے کچھ دے دیا تو من جانب اللہ سمجھ کر قبول کر لیتے۔

بانی خانقاہ رشیدیہ کے احوال بیان کرتے ہوئے موجودہ سجادہ نشین، فقیہ عصر، پیر طریقت حضرت علامہ الحاج مفتی محمد عبید الرحمٰن صاحب قبلہ رشیدی مدظلہ العالی نے فرمایا کہ:

''حضرت دیوان جی قدس سرہ کے مرید خاص نے ایک مرتبہ آپ کی دعوت کی۔ آپ نے اسے قبول کیا۔ اور اس کے گھر پہنچے، اس نے اپنی حیثیت کے مطابق دستر خوان چن دیا۔ مگر پانی رکھنا بھول گئے۔ حضرت نے بہت شوق سے تناول فرمایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر واپس آ گئے مگر اپنے مرید سے پانی تک طلب نہ کیا۔ دوسرے دن پھر اس کے یہاں دعوت تھی۔ حضرت تشریف

لے گئے، آج بھی وہاں پانی رکھنا بھول گئے، حضرت نے پھر کھانا تناول فرمایا، مگر آج بھی پانی کا سوال نہیں کیا، بغیر پانی پیے واپس آ گئے۔‘‘

یہ تھی بانی خانقاہ رشیدیہ کی کسرِ نفسی کہ پانی جو کھانے کے بعد نہایت ضروری ہے، اپنی ذات کے لیے مانگنا گوارا نہ کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میزبان بھولنے کی وجہ سے نادم ہو جائے اور ان کی دل شکنی ہو۔

اس خانقاہ کے مشائخ کرام کا دستور ہے کہ نہ کسی کی غیبت بیان کرتے نہ برائی اور اگر کوئی کسی کی برائی بیان کرتا تو اس کو سننا پسند نہیں کرتے۔ ممکن ہوتا تو اس کی کوئی اچھی تاویل کرتے۔ جیسا کہ حضرت دیوان جی کے حالات میں ہے کہ:

’’ایک مرتبہ جلال الدین نے سادات خان حاکم شہر کی شکایت کی، آپ نے فرمایا:

’’میرے سامنے کوئی کسی کی بدی ظاہر کرتا ہے تو مجھے اس کے جواب میں مشکل درپیش آتی ہے، کیوں کہ خدا نے بدی اور گمان بد سے منع فرمایا ہے۔ اور اس کے رسول نے حسن ظن کا حکم دیا ہے۔ لامحالہ مجھے توجیہ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔‘‘

مخالفین و معاندین کے حق میں نرم گوشہ رکھتے اور انہیں بھی اچھائی سے یاد کرتے۔ مشکل کشائی و حاجت روائی میں کوتاہی نہیں کرتے۔ خانقاہ میں آنے والے کو بغیر کھلائے رخصت نہیں کرتے، مریدی اور دعا و تعویذ کو پیشہ بنانا سخت ممنوع و ناپسندیدہ سمجھتے، ہاں! خدمت خلق اور مریدوں کی دلجوئی کی وجہ سے تعویذات وغیرہ ضرور دیتے، ویسے بسا اوقات وظیفہ وغیرہ کی تلقین فرماتے۔ چناں چہ حضرت دیوان جی کے حالات میں یوں قلم بند ہے کہ:

’’ایک شخص نے تپ ولرزہ کا تعویذ آپ سے مانگا، آپ نے فرمایا: ’’جاؤ! جب تپ ولرزہ آئے تو فقیر کی دعا کہنا اور یہ کہنا کہ پھر نہ آئے۔‘‘ اسی طرح ایک شخص نے آ کر بخار کا تعویذ مانگا تو آپ نے فرمایا: ’’سو مرتبہ ’’یا غفورُ‘‘ کے پڑھنے سے دفع ہو جائے گا۔‘‘

اس فانی زندگی میں رہائش کے مکانات کی بنیاد کو مستحکم و مضبوط بنانے کو بڑی حماقت تصور کرتے جیسا کہ آپ کا مقولہ ہے:

’’لوگ فانی چیز کو باقی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ بھی دوسرے کے لیے۔‘‘

ایسے ہی ایک دن حضرت دیوان جی خانقاہ میں بیٹھے ہوئے تھے اور پانی برس رہا تھا، چھپّر ٹپکا تو کسی نے عرض کیا کہ چھپّر خوب نہیں بنا جس سے پانی رکتا، آپ نے فرمایا چھپّر پانی کے روکنے کے لیے نہیں بنا ہے؛ بلکہ دھوپ کو روکنے کے لیے، کیوں کہ بارش کا زمانہ صرف چار ماہ ہے۔ اس میں بھی اول و آخر پانی کم برستا ہے، کچھ رات و دن پانی نہیں برستا۔ اگر حساب کیا جائے تو بارش کا زمانہ کل پندرہ سولہ روز ہوگا۔ بس عاقل کا کام نہیں کہ اتنے دن کے لیے گھر بنائے۔ ہاں آفتاب ہمیشہ رہتا ہے، گھر اس کے لیے ہونا چاہیے۔

اس خانقاہ کے جملہ سجادہ نشین حضرات علوم ظاہری و باطنی کے پیکر تھے۔ ان کمالات عالیہ کے باوجود تواضع اور کسر نفسی اتنا غالب تھا کہ جس نے دوسرے کے غرور کو چکنا چور کر دیا۔ یہاں کے مشائخ کرام خاکساری اور تواضع پر زیادہ زور دیے اور نفسانیت و خودغرضی کی مذمت بیان کر کے اس سے اجتناب کا حکم دیتے۔

اس خانقاہ کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس خانقاہ میں دوسری خانقاہوں کے بزرگوں کا حسب حیثیت احترام کیا جاتا ہے، جو بھی شیخ یا بزرگ یہاں آئے، اس کی حیثیت کے مطابق اس کا خیر مقدم ہوا۔ ان سے کچھ لیا اور کچھ دیا۔ خود بانی خانقاہ رشیدیہ کا مقولہ ہے:

"الفقراء کلھم کنفس واحدۃ" (جتنے اللہ والے ہیں، وہ مثل ایک جان کے ہیں)

یہی وجہ ہے کہ آپ نے دوسری خانقاہوں کے بزرگوں سے بھی اکتساب فیض کیا۔ جہاں کہیں بھی موقع ملا وہاں گئے، اگر ان میں اپنے سے کچھ زیادہ پایا تو حاصل کیا۔ اور اگر کم پایا تو انہیں عطا فرمایا۔ تعصب اور تنگ نظری کو اس راہ میں حائل ہونے نہ دیا۔ جیسا کہ آج کل عموماً دیکھا جا رہا ہے۔

ہندوستان میں ایسے مشائخ طریقت و علمائے دین بہت ہیں جن کے اس خانقاہ سے نیازمندانہ تعلقات و روابط رہے، جن میں مفتی اعظم ہند مولانا شاہ مصطفیٰ رضا خاں قادری بریلوی، صدر الافاضل مولانا محمد نعیم الدین مرادآبادی، ملک العلما مولانا ظفر الدین بہاری، حضرت سید مردان شاہ، حضرت محدث اعظم ہند کچھوچھوی، شارح بخاری مفتی شریف الحق امجدی، قائد ملت مولانا ارشد القادری بلیاوی وغیرہم قابل ذکر ہیں۔

یہاں کے مشائخ کرام نے علمی اور دعوتی اپنی دونوں حیثیتوں کو ثابت کیا ہے اور ان دونوں میدانوں میں بے لوث خدمات انجام دی ہیں۔ اس سلسلے کے مشائخ کرام نے اعتقادی، فقہی، اور سوانحی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ خود بانی خانقاہ رشیدیہ شیخ محمد رشید جون پوری نے فن مناظرہ کی مشہور کتاب ''شریفہ'' کی شرح ''رشیدیہ'' لکھی ہے جو ان کے علمی وفکری کمالات اور افکار و خیالات کو ثابت کرتی ہے۔ اس سلسلے کی دیگر تصنیفات وتالیفات مثلاً گنج رشیدی، گنج ارشدی، گنج فیاضی، کرامات فیاضی، مناقب العارفین، سمات الاخیار، عین المعارف، دیوان فانی وغیرہ کے مطالعے سے واضح طور پر جن افکارونظریات کا علم ہوتا ہے، وہ وہی افکاروعقائد ہیں جو اہل سنت و جماعت کے ہیں۔ کیوں نہ ہو کہ جملہ مشائخ کرام اعتقادی طور پر حضرت امام ابومنصور ماتریدی کے پیروکار تحقیقات وتالیفات میں مسلک امام اعظم ابوحنیفہ کی ترویج واشاعت کے علمبردار اور دعوت وتبلیغ میں چشتیت وقادریت کا رنگ نمایاں طور پر جھلکتا ہے۔

یہی وہ امتیازی خصوصیات ہیں جس کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خانقاہ دوسری خانقاہوں سے ایک اہم امتیازی مقام رکھتی ہے۔ یہاں کے مشائخ طریقت مخزن کمالات ومعدن نعمات ہوتے ہیں جس کی وجہ سے دوسروں کے لیے اکتساب فیض کا مرجع بن جاتے ہیں اور تبلیغ وہدایت کے لیے مشعل راہ۔ اور پھر کیوں نہ ہو کہ خداوند قدوس نے ان حضرات کو علم ومعرفت، حکمت ومصلحت اور کشف وکرامت سے آراستہ فرمادیا ہے جس کی بنا پر در پر ہمیشہ پروانوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ اور آج بھی ان کا روحانی فیض جاری وساری ہے۔ اور دعا ہے کہ تا قیام قیامت جاری رہے۔ آمین

خدا رحمت کند ایں پاک طینت را

☆☆☆

سلسلۂ رشیدیہ جون پور کی علمی وروحانی روایات

ابرار رضا مصباحی☆

شیراز ہند شہر جون پور اپنی علمی وتاریخی عظمتوں کی بدولت عالم گیر شہرت کا حامل ہے، یہ خطہ ہمیشہ سے دین و مذہب، علم وادب، فکر وفن، تحقیق وتصنیف، تہذیب وثقافت، دعوت وتبلیغ، رشد و ہدایت، سلوک وتصوف اور ولایت ومعرفت کا مرکز رہا ہے، اس گہوارۂ علم وادب سے باکمال اور عہد ساز علما وفقہا، حکما وفلاسفہ، عرفا وصوفیہ، ادبا وشعرا، محدثین و محققین، دعاۃ وقضاۃ، مبلغین و مفکرین پیدا ہوئے، جنہوں نے اشاعت دین و مذہب، ترویج علوم وفنون اور خدمت خلق و انسانیت کے لیے دینی ادارے، درس گاہیں، تنظیمیں، مسجدیں اور خانقاہیں قائم کیں اور اپنی علمی و دینی کاوشوں، خدمتوں اور برکتوں سے جون پور کو ''شیراز ہند جون پور'' بنادیا۔

علمی وتاریخی حیثیت

خانقاہ رشیدیہ جون پور، ہندوستان کی ایک قدیم علمی وتاریخی خانقاہ ہے جو اپنی علمی وروحانی خدمات اور نمایاں خصوصیات کے اعتبار سے امتیازی حیثیت کی حامل ہے۔

تاریخی حقائق کی روشنی میں خاندان رشیدی کا علمی وروحانی فیضان ساتویں صدی ہجری

☆رکن شاہ عبدالعلیم آسی فاؤنڈیشن، نئی دہلی

سے شروع ہوکر موجودہ صدی تک پہنچتا ہے۔ خاندان رشیدی میں علم و ولایت کا علم سب سے پہلے قدوۃ العارفین حضرت مخدوم شیخ تخشی چشتی عثمانی رومی نے نصب کیا، جو ملک روم سے ہجرت کر کے ہندوستان تشریف لائے اور پایۂ تخت سرزمین دہلی کو شرف قدوم بخشے۔ سلطان المشائخ حضرت خواجہ سید محمد نظام الدین اولیا کے چشمۂ علم و معرفت سے سیراب ہوکر بیعت و ارادت سے شرف یاب ہوئے اور روحانی نعمتوں سے بہرہ ور ہوئے، اور پھر بعد میں حضرت محبوب الٰہی کے محبوب حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی سے بھی آپ کو روحانی نعمتیں اور دولتیں ملیں اور ان کے محبوب و منظور قرار پائے، شیخ رومی دہلی میں کچھ دنوں قیام کرنے کے بعد سکلائی، قصبہ امیٹھی، ضلع بارہ بنکی تشریف لائے اور یہیں دعوت و ارشاد کے فرائض انجام دے کر ہمیشہ کے لیے سکونت پذیر ہو گئے، یہیں آپ کا انتقال بھی ہوا، مزار پُر انوار سکلائی میں فیض بخش انام ہے۔ پھر کئی پشتوں کے بعد امام العارفین حضرت شیخ عبد الحمید عثمانی امیٹھوی نامی بزرگ ہوئے جو قطب الاولیا حضرت بندگی شیخ جمال الحق مصطفیٰ عثمانی جون پوری کے والد بزرگ وار اور بانی خانقاہ رشیدیہ کے جد امجد تھے۔ ان کے دو صاحبزادے تھے: شیخ مصطفیٰ عثمانی اور شیخ عثمان عثمانی۔ حضرت شیخ عثمان عثمانی امیٹھوی کی اولاد تو قصبہ امیٹھی، ضلع بارہ بنکی میں ہے؛ لیکن ان کا مزار مبارک اپنے برادر بزرگ حضرت بندگی شیخ مصطفیٰ عثمانی کے پہلو میں درگاہ شریف چمنی بازار، پورنیہ سیٹی، بہار میں واقع ہے۔ حضرت شیخ مصطفیٰ عثمانی علم و فقر کے میدان میں مشہور ہوئے اور قطب الاولیا کے عظیم لقب سے ملقب ہوئے۔ آپ بانی خانقاہ رشیدیہ، قطب الاقطاب حضرت شیخ محمد رشید جون پوری (مصنفِ مناظرۂ رشیدیہ) کے والد گرامی اور شیخ ارادت ہیں۔

شیخ مصطفیٰ عثمانی کی ولادت، ضلع بارہ بنکی، یوپی کی سکلائی نامی بستی میں تقریباً ۹۳۰ھ میں ہوئی۔ دسویں صدی ہجری کے اوائل میں حصول علم کے لیے سکلائی بارہ بنکی سے شہر جون پور وارد ہوئے اور علوم و فنون سے فراغت حاصل کر کے یہیں سکونت پذیر ہو گئے۔ اپنے دیار کے نامور بزرگ قدوۃ السالکین حضرت بندگی شیخ محمد بن نظام الدین عثمانی امیٹھوی سے بیعت و ارادت سے مشرف ہوکر خلافت و اجازت سے مالا مال ہوئے۔ پیر و مرشد کے علاوہ حضرت

شیخ قیام الدین بن قطب الدین جون پوری، حضرت شیخ نعمت اللہ جلال، شیخ فتح اللہ راج گیری جیسی عظیم ہستیوں سے بھی خلافتیں واجازتیں حاصل ہوئیں، نیز حضرت مخدوم نور قطب عالم پنڈوی سے بھی روحانی نعمتیں ملیں- حضرت مخدوم پنڈوہ نے آپ کو عالم روحانیت میں سرزمین پورنیہ کو (جو پورنیہ، کٹیہار، کشن گنج، سہرسا، اررِیا، دیناج پور، مالدہ مختلف اضلاع کو شامل تھا) آپ کی ولایت میں سپرد فرمائی اور اشاعت اسلام، خدمت خلق اور رشد وہدایت کے لیے اس عظیم خطے میں آپ کو مقرر فرمایا- لہٰذا اشارۂ روحانی سے آپ جون پور میں زیادہ قیام نہ کر پائے اور اپنی اولاد کو یہیں چھوڑ کر پنڈوہ کے لیے پا بہ رکاب ہوئے اور حضرت مخدوم پنڈوہ کی خدمت میں باریاب ہوئے، ان کی ہدایت کے مطابق پورنیہ تشریف لے گئے اور چمنی بازار نامی محلّہ میں سکونت پذیر ہوئے- یہاں آپ نے دعوت وتبلیغ اور رشد وہدایت کا ایک باضابطہ سلسلہ قائم کیا اور جھونپڑی ہی میں مسجد اور خانقاہ مصطفائیہ کی بنیاد ڈالی- آپ اپنی بیش بہا قربانیوں اور ہمہ گیر کوششوں سے اس تاریک سرزمین کو شمع اسلام سے فروزاں کیا اور لاکھوں لوگوں کو داخل اسلام فرما کر راہ راست پر گامزن کیا- تقریباً ۱۰۳۰ھ میں آپ کا وصال ہوا- مزار مبارک مصطفیٰ باغ، محلّہ چمنی بازار، پورنیہ سیٹی، بہار میں مرجع خلائق ہے-

خانقاہ رشیدیہ کے قیام کا پس منظر

گیارہویں صدی ہجری میں قطب الاقطاب، حضرت شیخ محمد رشید جون پوری کی علمی و روحانی شخصیت کا ڈنکا ملک وبیرون ملک میں بج رہا تھا، انہوں نے اپنے مرشد گرامی سلطان العارفین حضرت راجی سید شاہ احمد حلیم اللہ بن مجتبیٰ مانک پوری سے عرض کی کہ:

”اگر حکم ہو تو مانک پور ہی میں رہوں، (مرشد گرامی نے) فرمایا کہ یہ چھوٹی جگہ (صاحبزادے) راجی غلام محی الدین کے لیے رہنے دو، تمہیں بڑی جگہ جون پور دیتا ہوں، وہیں رہو اور خلق کی خدمت کرو“ [سمات الاخیار، ص:۶۷]

چناں چہ حضرت قطب الاقطاب جون پوری اپنے مرشد گرامی کے ارشاد کے مطابق مانک پور سے رخصت ہو کر جون پور تشریف لائے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کیے اور اپنی عمر کی چالیسویں سال یعنی ۱۰۴۰ھ میں خانقاہ اور مسجد تعمیر فرمائی جو آج ”خانقاہ رشیدیہ“ اور ”مسجد خانقاہ

رشیدیہ'' کے نام سے مشہور ہے۔

خانقاہ رشیدیہ کے روحانی مراکز

خانقاہ رشیدیہ جون پور ایک ہمہ گیر سلسلہ ہے جس کی شاخیں ملک کے مختلف خطوں اور صوبوں میں پھیلی ہوئی ہیں اور رشد و ہدایت اور تعلیم و تلقین کے فرائض میں مصروف ہیں، سلسلے کے بزرگان و سجادگان کے اعراس کی جملہ تقریبات مرکزی خانقاہ، خانقاہ رشیدیہ جون پور کے معمولات و روایات کے مطابق ہی انجام پذیر ہوتی ہیں، خانقاہ رشیدیہ کے علمی و روحانی مراکز درج ذیل ہیں:

(۱) خانقاہ عالیہ مصطفائیہ، چمنی بازار، پورنیہ، بہار

بانی: قطب الاولیا حضرت بندگی شیخ جمال الحق مصطفیٰ عثمانی جون پوری ثم پورنوی

(۲) خانقاہ عالیہ طیبیہ، منڈواڈیہ، بنارس، یوپی

بانی: قطب العارفین حضرت مخدوم شاہ طیب بنارسی

(۳) خانقاہ عالیہ تکیۂ حیدری، بھمن برہ، سیوان، بہار

بانی: نورالحق حضرت شاہ حیدر بخش رشیدی جون پوری

(۴) خانقاہ عالیہ علیمیہ، محلّہ نورالدین پورہ، غازی پور، بلیا

بانی: قطب عالم حضرت شاہ محمد عبدالعلیم آسی سکندر پوری ثم غازی پوری

مذکورہ خانقاہوں اور مقاموں کے علاوہ دارفانی، گورکھ پور، شریعت آباد، پٹنہ، سادات پور، سیوان اور بیگون، راجستھان میں بھی مشائخ رشیدیہ جون پور کے مزارات مبارکہ اوران کی خانقاہیں آباد ہیں۔

سجادگانِ خانقاہ رشیدیہ

بانی خانقاہ سمیت خانقاہ رشیدیہ کے کل ۱۱ رسجادگان ہوئے ہیں:

(۱) قطب الاقطاب، شمس الحق حضرت شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری

(۲) قطب عالم، بدرالحق حضرت شیخ محمد ارشد عثمانی رشیدی جون پوری

(۳) قطب الاولیا، قمرالحق حضرت شیخ غلام رشید عثمانی رشیدی جون پوری

(۴) نور الحق حضرت شیخ حیدر بخش رشیدی جون پوری

(۵) قطب العالمین، قیام الحق حضرت شیخ امیر الدین رشیدی جون پوری

(۶) قطب الہند ابوالخیر حضرت شیخ غلام معین الدین رشیدی جون پوری

(۷) امام العارفین حضرت شاہ سراج الدین رشیدی جون پوری

(۸) قطب العرفا، ظہور الحق حضرت شاہ عبدالعلیم آسیؔ رشیدی غازی پوری

(۹) مجدد سلسلہ رشیدیہ، شہود الحق حضرت سید شاہ شاہد علی سبز پوش علیمی رشیدی فانیؔ گورکھپوری

(۱۰) شہید ملت، منظور الحق حضرت سید شاہ مصطفیٰ علی سبز پوش آنیؔ گورکھپوری

(۱۱) مجمع البحرین، حضرت مفتی شاہ محمد عبید الرحمٰن رشیدی دام ظلہ العالی

(موجودہ سجادہ نشین: خانقاہ عالیہ رشیدیہ، جون پور شریف)

خصوصیات وروایات

● خانقاہ رشیدیہ کے تقریباً تمام سجادگان اور مشائخ باضابطہ عالم وفاضل، محقق ومدقق، منطقی وفلسفی اور فقیہ وصوفی ہونے کے ساتھ ساتھ مدرس، مصنف اور شاعر ہوتے چلے آئے ہیں۔

● مشائخ رشیدیہ نے زیادہ سے زیادہ توجہ مریدین ومتوسلین کی تربیت وتزکیہ، افراد سازی اور خانقاہ کی توسیع وتعمیر پر صرف کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے افراد بھی تیار کیے ہیں جو بعد کی نسل کے لیے عظیم مربی اور مرشد ثابت ہوئے ہیں۔

● مشائخ رشیدیہ کا یہ خاص امتیاز رہا ہے کہ یہ درویشی اور خانقاہی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد بحث ومباحثے سے گریز کرتے ہیں اور اگر کوئی اس کی نوبت کھڑی کر دیتا ہے اور سوالات واعتراضات کی محفل گرم کر دیتا ہے تو اس سے سکوت اختیار کر لیتے ہیں۔

● مشائخ رشیدیہ اپنے مورث اعلیٰ اور بانی خانقاہ رشیدیہ، حضرت قطب الاقطاب جون پوری کے اس دستور العمل اور قول زریں پر عمل کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں کہ:

"میرے سامنے کوئی کسی کی بدی ظاہر کرتا ہے تو مجھے اس کے جواب میں مشکل پڑ جاتی ہے، کیوں کہ خدا نے گمان بد سے منع فرمایا ہے اور اس کے رسول نے حسن ظن کا حکم دیا ہے، لا محالہ مجھے توجیہ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، مثلاً اگر کسی کو رمضان میں سر بازار کھاتے ہوئے

دیکھوں تو گمان کروں گا کہ مسافر یا بیمار ہے کہ بھوک کے غلبہ سے الگ لے جا کر کھانے کی طاقت نہیں رکھتا ہے، اگر کسی کو جانوں کہ اس نے شراب پی ہے، کہوں گا کہ توبہ کر لی ہوگی۔"

قدیم ومثالی راویت

● خانقاہ رشیدیہ کی روایتوں میں ایک ممتاز اور مثالی روایت یہ ہے کہ تمام خانقاہوں اور روحانی مراکز کا سجادہ نشیں، ذمے دار اور نگراں ایک ہی شخص ہوگا۔

● مشائخ رشیدیہ خانقاہ رشیدیہ کی سجادگی کے اہل اور لائق ہوتے ہوئے بھی قبول کرنے سے بہت گریز کرتے ہیں، بلکہ ایسے بھی سجادگان گزرے ہیں جو اپنے کو قتل ہونا تو گوارا کرتے ہیں؛ لیکن اس عظیم منصب کی ذمے داری قبول کرنا ہرگز گوارا نہیں کرتے، جیسا واقعات اس پر شاہد ہیں۔

● سجادگی اور رشد و ہدایت کی اہم ذمے داری بطور وراثت حاصل نہیں ہوتی کہ والد اگر پیر یا سجادہ نشیں تھا تو اس کی جگہ میں اس کا بیٹا ہی اس کا امین اور جانشیں ہوگا یعنی یہاں "پدرم سلطان بود" کے قول پر ہرگز عمل نہیں کیا جاتا؛ بلکہ پورے سلسلے کے افراد میں جو علم و عمل، فضل و کمال، تقویٰ و طہارت اور اخلاق و کردار وغیرہ اوصاف حمیدہ کے جامع و حامل ہوں، وہی سلسلے کی سجادگی کے لائق اور مشائخ کی امانت کے اہل ہوتے ہیں۔ سلسلے کے زیب سجادہ (اگر موجود ہوں)، خلفا، علما و مشائخ و مریدین، عمائدین شہر کی مرکزی خانقاہ رشیدیہ جونپور میں بیٹھک ہوتی ہے اور ان کے باہمی مشورے، اتفاق رائے اور اشارات روحانی سے نئے صاحب سجادہ مقرر کیے جاتے ہیں اور حضرت بانی خانقاہ کا خرقۂ مبارکہ انہیں اوڑھایا جاتا ہے اور سلسلۂ رشیدیہ سے منسلک تمام خانقاہوں، روحانی مراکز اور مدارس و جامعات کی ذمے داری سونپی جاتی ہے۔

تربیت وتزکیہ

خانقاہ میں تربیت و تزکیہ کو زبردست اہمیت حاصل ہے، خانقاہ کے اصول کے مطابق مریدین و معتقدین کی اصلاح و تربیت کی جاتی ہے، فرائض و واجبات کے ساتھ ساتھ نوافل و مستحبات کی ادائیگی نیز خاکساری اور تواضع وانکساری پر زیادہ زور دیا جاتا ہے، آدابِ خانقاہ، آداب مشائخ، آداب انسانیت، آداب معاشرت، طریقۂ خدمت خلق، توکل وقناعت اور توبہ و انابت پر برابر دھیان دلایا جاتا ہے، دوست و دشمن میں فرق و امتیاز نہ برتنے پر زور دیا جاتا ہے

بلکہ سب کے ساتھ حسن خلق اور خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آنے کی بھرپور تلقین کی جاتی ہے۔

سلاسل مجاریہ

خانقاہ رشیدیہ جون پور میں درج ذیل سلاسل ہیں:

چشتیہ احمدیہ، چشتیہ طیبیہ، چشتیہ اشرفیہ، قادریہ احمدیہ، قادریہ طیبیہ، قادریہ شمسیہ مداریہ، قلندریہ، سہروردیہ، جنیدیہ، زاہدیہ، فردوسیہ اور ان میں زیادہ تر چشتیہ و قادریہ جاری ہیں، لیکن ان میں سلسلۂ چشتیہ کو ہمیشہ غلبہ رہا ہے، اور اکثر سجادگان بھی اسی سلسلے سے بیعت ہوتے آئے ہیں۔

ذوق سماع

بانی خانقاہ اور اس کے اکثر سجادگان سلسلۂ چشتیہ میں مرید ہوئے ہیں؛ لیکن یہ سماع کے شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس سے کافی محظوظ ہوئے ہیں اور پھر بعد میں انہوں نے اس سے اجتناب بھی کیا ہے، لیکن ''نہ ایں کار می کنم نہ انکار می کنم'' کے قول پر ہمیشہ عمل کیا ہے یعنی اس سے نہ کبھی غلو تھا نہ اس سے انکار۔

خود بانی خانقاہ کے مرشد گرامی حضرت مخدوم شاہ طیب بنارسی قدس سرہ کو ابتدا میں سماع سے بہت شوق تھا؛ لیکن اخیر میں اس سے یہ کہتے ہوئے پرہیز فرمایا کہ:

''الا انا اسمع من اللہ و لا احتاج الی السماع''

(اب میں اللہ سے سنتا ہوں اور سماع کی حاجت نہ رہی) [تذکرۂ مشائخ بنارس، ص:۸۸]

مشائخ کے تفردات

خانقاہ رشیدیہ اور اس کے مشائخ کے اپنے اپنے تفردات رہے ہیں، جن میں سے چند کو بیان کیا جاتا ہے۔

- سلسلۂ رشیدیہ کے مشائخ کا یہ معمول رہا ہے کہ ہمیشہ درس و تدریس اور خدمت خلق سے وابستہ رہے ہیں اور علمی و فقہی اور تحقیقی و تصنیفی امور بھی انجام دیتے رہے ہیں، میکدۂ روحانیت میں قدم رنجاں ہونے کے بعد کسی بحث و مباحثے میں ہرگز نہیں پڑتے ہیں بلکہ اس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔
- راحت رسانی خلائق پر زیادہ زور دیتے، کوئی اگر کسی کی برائی بیان کرتا تو اس کو سننا پسند

نہیں کرتے، ممکن ہو تو اس کی کوئی اچھی تاویل کرتے، مخالفین و معاندین کے حق میں بھی نرم گوشہ رکھ کر انہیں بھی اچھائی سے یاد کرتے، مشکل کشائی و حاجت روائی میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے، خانقاہ میں آنے جانے والوں کو بغیر کچھ کھلائے رخصت نہیں کرتے، ان کے علاوہ اور بھی بہت سے معمولات ورسومات ہیں، جن کے بیان کا یہاں موقع نہیں۔

● علما و مشائخ رشیدیہ بانی خانقاہ کے دستور و اصول پر عمل کرتے ہوئے دعوت و تبلیغ اور رشد و ہدایت کے امور انجام دیتے چلے آرہے ہیں۔

● درس و تدریس مشائخ رشیدیہ کا خاص اور محبوب مشغلہ رہا ہے، حضرت شیخ محمد رشید جون پوری جہاں رشد و ہدایت اور تربیت و تزکیہ کے امور انجام دیتے تھے وہیں تاحیات درس و تدریس کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔

● مشائخ رشیدیہ نے بزرگان سلاسل کی زیارت کے لیے اکثر مقامات کا سفر کیا ہے اور اس میں بھی بندگان خدا کی ہدایت فرماتے رہے ہیں۔

● مشائخ رشیدیہ مریدوں کے گھر کبھی بے بلائے نہ گئے اور غیر مرید کی دعوت قبول نہیں کیے اور نہ ہی ان کی نذر قبول کیے، ملکیت کی طرف کبھی راغب نہ ہوئے، انہوں نے فقر و قناعت کو ہمیشہ اپنا شعار اور وقار بنائے رکھا، مریدین سے طلب و سوال نہیں کیے، بے طلب اگر کسی مرید نے کچھ دے دیا تو من جانب اللہ سمجھ کر قبول کر لیے اور عام حالات میں امرا و اغنیا کے یہاں نہیں جاتے۔

● سلسلۂ رشیدیہ کے تقریباً تمام مشائخ کا یہ معمول رہا ہے کہ وہ طالبین و سالکین کو پردے ہی میں مقامات تک پہونچانے کی کوشش کرتے ہیں یعنی علم و عمل کے پردے ہی میں سارا کام ہو جاتا ہے، اسرار و معارف کی باتیں کم ظاہر ہوتیں ہیں۔

طریقۂ بیعت

سلسلۂ رشیدیہ کا طریقۂ بیعت موجودہ بیعت کے طریقوں سے الگ اور منفرد ہے جو چار سو سال سے پابندی کے ساتھ چلا آرہا ہے، وہ یہ کہ بیعت کے وقت مرید کو شیرینی لے کر حاضر ہونا ہوتا ہے، اگر مرید ہونے والا مرد ہوتا ہے تو اس کو مرید کرنے کے بعد کلاہ چہار ترکی پہناتے ہیں، جس کا

طریقہ یہ ہوتا ہے کہ کلاہ چہارتر کی پہنانے سے پہلے مقراض رانی کرتے ہیں، پہلے پیشانی کے چند بال کاٹتے پھر دائیں جانب کے کچھ بال پھر بائیں جانب کے کچھ بال۔ اگر مرید کے سر پر بال نہ ہو تو صرف مقراض رانی کر دیتے ہیں اور اگر عورت کو مرید کرنا ہوتا ہے تو اس کے سر پر مقراض رانی نہیں کرتے، بلکہ صرف دامنی اوڑھا دیتے ہیں، پھر ہدایتیں کرتے ہیں، یہ ہدایتیں کچھ طویل ہوتی ہیں، پھر دوگانہ شکرانۂ بیعت کی نماز پڑھنے کو کہا جاتا ہے۔

عرس کی تقریبات

خانقاہ کے کسی بزرگ کا اگر رات میں عرس وقل ہوتا ہے تو سجادہ نشیں اس رات کو کھانا نہیں کھاتے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ زائرین میں کوئی بھوکا رہ گیا ہو اور میزبان کھائے، عموماً قل شریف ٹھیک وصال کے وقت ہی ہوتا ہے، اس میں قوالی وغیرہ نہیں ہوتی، کبھی کبھی قل شریف سے پہلے نعت خوانی ومنقبت خوانی بھی ہو جاتی ہے، فاتحہ وقل کے بعد چادر پوشی سے پہلے گلاب، صندل، عطر مزار شریف پر چھڑکے جاتے ہیں، تب سفید چادر مزار شریف پر چڑھائی جاتی ہے، پھر مریدین و معتقدین اپنی اپنی طرف سے چادریں چڑھاتے اور عطر وگلاب چھڑکتے ہیں، پھر اخیر میں پھولوں کے ہار بھی ڈالے جاتے ہیں، فاتحہ وقل میں چھوہارے کو خانقاہ کی طرف سے لازم سمجھا جاتا ہے، مریدین ومعتقدین بھی اپنی اپنی جانب سے قل میں شیرینی ومٹھائی رکھتے ہیں، عام طور پر مزار شریف پر قل ختم ہو جانے کے بعد قبولی پر فاتحہ ہوتی ہے اور یہی قبولی زائرین کو کھلائی جاتی ہے، کبھی کبھی بعض اعراس میں شربت اور چھوہارا دونوں ہوتے ہیں، چھوہارے کو پہلے دھو کر پاک کر لیا جاتا ہے پھر اس کی گٹھلی نکال دی جاتی ہے تب اس کو قل شریف میں فاتحہ کے لیے رکھا جاتا ہے، ڈالی کو صاحب سجادہ یا سلسلہ کے خلیفہ اپنے سر پر لے کر مزار شریف پر جاتے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ زائرین کی جماعت ہوتی ہے، قل شریف میں پہلے حضور اکرم سید عالم صلی اللہ علیہ و سلم، صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور شہدائے کربلا کے نام سے فاتحہ پڑھی جاتی ہے، پھر صاحب عرس کے مشائخ کے نام سے، اس کے بعد صاحب عرس کے لیے مخصوص فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔

تربیت وتزکیہ

صاحب سجادہ اور خلفا عام طور پر مریدین کو وظیفۂ پنج گنج رشیدی پڑھنے کو دیتے ہیں اور ذکر

واذکار کے جو لائق ہوتے ہیں، ان کی لیاقت کو مدنظر رکھتے ہوئے ذکر واذکار کی تعلیم دیتے ہیں، مریدین کو حلقۂ ذکر میں نہیں بٹھاتے، بلکہ جس کو ذکر واذکار کی تعلیم دینی ہوتی ہے اسے الگ سے ذکر کی تعلیم دیتے ہیں۔

عقائد ونظریات

خانقاہ رشیدیہ اور اس سلسلے کے سجادگان، علما اور مشائخ اعتقادی مسلک میں حضرت امام ابومنصور ماتریدی، فقہی مسلک میں امام ابوحنیفہ حضرت نعمان بن ثابت کے پیروکار رہے ہیں۔

اس وقت حضرت صاحب سجادہ مجمع البحرین، مفتی عبیدالرحمٰن رشیدی دام ظلہ کی زیر نگرانی و سرپرستی خانقاہ رشیدیہ اور اس کے تمام علمی وروحانی مراکز اور خانقاہیں اور مختلف تعلیمی ادارے ملک کے متعدد مقامات پر چل رہے ہیں، جو دعوت وتبلیغ، دینی علوم وفنون کی اشاعت اور خدمت خلق میں مصروف ہیں اور اپنے مشائخ کے نقوش قدم پر چلتے ہوئے اشاعت علم ومعرفت کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔

بہر حال خانقاہ رشیدیہ جون پور ملک کی ایک اہم اور مثالی خانقاہ ہے، جہاں سے ہمیشہ علمی و دعوتی، اخلاقی وروحانی اور تحقیقی وتصنیفی امور انجام پاتے رہے ہیں اور سلاسل طریقت خصوصا سلسلۂ چشتیہ اور سلسلۂ قادریہ فروغ پا رہے ہیں اور علما ومشائخ کی رہبری ورہنمائی اور مریدین و معتقدین کی تربیت وہدایت ہوتی رہی ہے۔

☆☆☆

سجادگانِ سلسلۂ رشیدیہ: ایک اجمالی تعارف

ابرار رضا مصباحی☆

قطب الاقطاب شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری
(بانی وسجادہ نشیں خانقاہ رشیدیہ جون پور)

آپ کا اسم مبارک محمد رشید، کنیت ابوالبرکات، تخلص شمس الحق اور عرف حضرت دیوان جی اور لقب قطب الاقطاب تھا- آپ مذہبا حنفی، مزاجا صوفی صافی، مشربا چشتی اور نسبا عثمانی تھے، شیراز ہند جون پور کے برونہ نامی گاؤں میں ۱۰۰۰ھ میں پیدا ہوئے، والد محترم قطب الاولیا حضرت بندگی شیخ مصطفیٰ جمال الحق عثمانی جون پوری ثم پورنوی تھے- آپ کا سلسلۂ نسب حضرت شیخ بخشیٔ عثمانی چشتی رومی کے واسطے خلیفۂ سوم امیر المومنین سیدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے- ابتدائی تعلیم والد بزرگوار وغیرہ سے حاصل کی، اس کے بعد حضرت مفتی شمس الدین جون پوری، حضرت شیخ افضل عثمانی جون پوری اور حضرت شیخ نور الحق بن شیخ عبد الحق محدث دہلوی وغیرہ سے باقاعدہ دینی تعلیم وتربیت حاصل کی- آپ نسبتِ بیعت وارادت اور شرفِ خلافت واجازت دونوں اپنے والد ماجد حضرت بندگی سے رکھتے ہیں، ان کے علاوہ حضرت مخدوم شاہ طیب بنارسی، حضرت میر سید شمس الدین کالپوی بخاری، حضرت راجی سید احمد

☆رکن شاہ عبد العلیم آسی فاؤنڈیشن، نئی دہلی

مجتبیٰ مانک پوری، حضرت شیخ عبدالقدوس قلندر شطاری جون پوری، حضرت شیخ شہباز احمد چشتی بھاگلپوری، شیخ تاج الدین چشتی جھونسوی، شیخ عبدالعزیز شطاری بھٹملوی اور شیخ ناصر الدین شیخ پوری علیہم الرحمہ جیسے مشاہیر مشائخ وصوفیہ سے خلافت واجازت کا شرف رکھتے ہیں-آپ کا عقد مسنون حضرت شیخ حاجی ارزانی قدس سرہ کی دختر نیک سے ہوا جن سے شیخ محمد حمید، شیخ محمد ارشد، شیخ غلام معین الدین اور شیخ غلام قطب الدین چار صاحبزادے پیدا ہوئے-آپ علوم و فنون سے فراغت کے بعد تدریسی امور کی طرف متوجہ ہوئے، اس دوران قطب العارفین حضرت مخدوم شاہ طیب بنارسی قدس سرہ کی ملاقات وزیارت سے مشرف ہوکر خلافت واجازت کی سعادتوں سے بہرہ ور ہوئے اور پھر انہی کے ہوکر رہ گئے-آپ کے تلامذہ میں شیخ یٰسین احمد جھونسوی، شیخ سید حسن رسول نما دہلوی، شیخ محمد ارشد جون پوری، ملا محمد جمیل جون پوری (یکے از مدونین ومرتبین ''فتاویٰ عالمگیری'')، مولانا امین الدین جونپوری، قاضی عبدالصمد عثمانی جون پوری (یکے از مدونین ومرتبین ''فتاویٰ عالمگیری'') وغیرہ نامور علما و محققین آپ کی بافیض درس گاہ سے پیدا ہوئے اور ایک خاص بات یہ ہے کہ ان میں اکثر آپ کے مریدین وخلفا تھے-آپ نے حضرت راجی سید احمد مجتبیٰ حلیم اللہ مانک پوری کے حکم سے خانقاہ وسلسلۂ رشیدیہ کی بنیاد رکھی -آپ کو شعر وادب سے بھی اچھا ذوق تھا، آپ کی شاعری خالص عافانہ رنگ وآہنگ میں ہے، فارسی اور ہندی دونوں زبانوں پر مشتمل آپ کے اشعار کا مجموعہ ہے جو ''دیوان شمسی'' کے نام سے ہے-آپ نے تقریبا درجن بھر علمی وتحقیقی کتابیں بھی یادگار چھوڑی ہیں، جن میں مناظرۂ رشیدیہ، زاد السالکین، مقصود الطالبین، شرح اسرار المخلوقات، حاشیہ فتوحات مکیہ، خلاصۃ النحو، بدایۃ النحو، تذکرۃ النحو، شرح ہدایۃ الحکمۃ، شرح مختصر عضدی، مکتوبات رشیدیہ، ترجمۂ معینیہ اور دیوان شمسی وغیرہ قابل ذکر ہیں-آپ نے ۸۳ر سال کی عمر میں ۹ رمضان المبارک سنہ ۱۰۸۳ھ کو وصال فرمایا اور مزار اقدس رشید آباد شریف جون پور میں امید گاہ انام ہے-

قطب عالم شیخ محمد ارشد عثمانی رشیدی جون پوری

(دوسرے سجادہ نشیں: خانقاہ عالیہ رشیدیہ جون پور)

آپ کا اسم گرامی شیخ محمد ارشد، کنیت ابو الکشف اور لقب بدر الحق اور قطب عالم ہے-

ولادت باسعادت جون پور میں ۱۰۴۱ھ میں ہوئی، علوم ظاہری والد ماجد حضرت قطب الاقطاب جون پوری، قطب وقت حضرت شیخ محمد افضل عثمانی جون پوری اور حضرت شیخ عبد الشکور منیری قدست اسرارہم سے تکمیل کی، ۲۱ ربرس کی عمر میں فارغ ہوکر طالبان علوم نبویہ کی تعلیم وتربیت میں مصروف ہوئے، ۲۲ رسال کی عمر میں والد ماجد حضرت قطب الاقطاب جون پوری سے سلسلۂ چشتیہ احمدیہ میں مرید ہوکر تمام سلاسل کی اجازتوں، خلافتوں اور نعمتوں سے بہرہ ور ہوئے۔ شعر وادب سے خاصہ ذوق تھا، تخلص والہ تھا۔ آپ کی دو شادیاں ہوئیں: پہلی شادی استاذ گرامی شیخ محمد افضل عثمانی جون پوری کی تجویز سے حضرت شیخ مبارک محی الدین ابن نور اللہ انصاری ہروی کی دختر نیک سے مقرر ہوئی اور دوسری شادی حضرت شیخ عبد اللطیف مٹھن پوری کی دختر نیک سے ہوئی۔ آپ کی کل چار اولادیں تھیں: (۱) شیخ نور اللہ (۲) شیخ ثناء اللہ (۳) شیخ محب اللہ (۴) شیخ محمد۔ سلسلۂ رشیدیہ کی اشاعت میں آپ کا عظیم حصہ اور اہم کردار ہے، آپ کے خلفا میں شیخ شکر اللہ (جامع گنج ارشدی)، شیخ امین الدین جون پوری، شاہ بدر الدین مچھلی شہری، ملا محمد ماہ دیوگامی، شیخ عبد اللہ اڑیسوی، شیخ نور محمد دہلوی، شیخ غلام رشید عثمانی جون پوری، میر سید محمد باقر جعفری پٹنوی، میر سید سعد اللہ سادات پوری وغیرہ جیسے علما، عرفا اور صوفیہ شامل ہیں۔ قابل قدر علمی وروحانی خدمات انجام دے کر ۷۳ رسال کی عمر میں ۱۱۱۳ھ میں واصل بحق ہوئے، نماز جنازہ حضرت مولانا محمد جمیل جون پوری (تلمیذ ومرید حضرت قطب الاقطاب جون پوری ویکے از مرتبین ومدونین فتاویٰ عالمگیری) نے پڑھائی، مزار اقدس اپنے والد بزرگوار اور شیخ کامل حضرت قطب الاقطاب جون پوری قدس سرہ کے پائنتی میں (حظیرۂ مبارکہ سے باہر) واقع ہے۔ آپ کا عرس مبارک ۲۴ رجمادی الاخریٰ کو ہوتا ہے، قل شریف قبل صبح صادق ہے۔

قمر الحق شیخ غلام رشید عثمانی جون پوری

(تیسرے سجادہ نشیں: خانقاہ عالیہ رشیدیہ جون پور)

آپ کا اسم گرامی غلام رشید، کنیت ابوالفیاض اور لقب قمر الحق ہے، نسباً عثمانی، مشرباً چشتی اور خانقاہ عالیہ رشیدیہ جون پور کے تیسرے سجادہ نشیں تھے۔ ولادت مبارکہ ۸ ربیع الاول ۱۰۹۶ھ میں جون پور میں ہوئی، اپنے پرداد اقطب الاقطاب حضرت شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری کی بشارت کے

مطابق ''غلام رشید'' نام رکھا گیا والد بزرگوار حضرت شیخ محب اللہ افضل عثمانی جون پوری تھے جو اپنے والد ماجد قطب عالم حضرت شیخ محمد ارشد عثمانی بن حضرت شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری کے تلمیذ و مرید تھے - رشید آباد شریف جون پور میں اپنے والد گرامی کے ہی پائینتی میں مدفون ہیں - بچپن ہی میں والدین کریمین کا سایہ سر سے اٹھ گیا، پرورش و کفالت اور تعلیم و تربیت اپنے جد امجد حضرت قطب عالم کے زیر سایہ ہوئی، چناں چہ درسیات کی تعلیم جد امجد حضرت قطب عالم جون پوری اور حضرت مولانا محمد جمیل جون پوری سے حاصل کی - عقد مسنون استاذ گرامی حضرت مولانا محمد جمیل جون پوری کی صاحب زادی سے ہوا، جن سے صرف شافعہ بی بی پیدا ہوئیں - ۱۰۶۰ھ میں جد امجد حضرت قطب عالم جون پوری سے سلسلہ عالیہ چشتیہ میں مرید ہوئے اور ۱۱۱۲ھ میں اجازت و خلافت کی نعمت سے مشرف ہو کر اعلیٰ مقامات و مراتب تک پہنچے اور خانقاہ رشیدیہ جون پور کے تیسرے امین وسجادہ نشیں مقرر ہوئے - خلفا میں حضرت نور الحق شاہ حیدر بخش جون پوری، حضرت برہان الحق شاہ غلام شرف الدین مہندانوی منیری، حضرت اسیر الحق شاہ اسد اللہ مخلصؔ بناری، حضرت محبوب الحق شاہ فصیح الدین جون پوری، شیخ حضرت ضیاء الحق میر سید غلام جعفر پٹنوی، حضرت میر سید علی ابراہیم پٹنوی، حضرت میر سید محمد علی راج گیری، حضرت سید محمد موسیٰ راج گیری، حضرت ملا شیخ معین الدین منیری، حضرت شیخ محمد سلیم منیری، حضرت شیخ محمد باقر بہاری، حضرت شیخ احمد اللہ بہاری، حضرت شیخ افضل الزماں وحدتؔ بناری، حضرت شیخ قاضی نور اللہ مدنا پوری، حضرت شیخ ملا محمد نعیم پورنوی، حضرت شیخ میر سید نور الدین سادات پوری، حضرت شیخ فیض اللہ پنڈوی، حضرت شیخ عزیز اللہ بناری، حضرت شیخ میر سید احمد اللہ گورکھپوری، حضرت شیخ بدیع الدین ناصحیؔ جون پوری وغیرہ جیسے اصحاب فضل و کمال شامل ہیں - اپنے پیر و مرشد قطب عالم شیخ محمد ارشد عثمانی جون پوری کے ارشادات و ملفوظات مبارکہ کو ''گنج ارشدی'' کے نام سے مرتب کیا، اپنے نواسہ اور مرید و خلیفہ حضرت نور الحق شاہ حید بخش قدس سرہ کے لیے رسالہ ''درایۃ النحو'' کی بسیط شرح ''نحویہ حیدریہ'' کے نام سے رقم فرمائی - وصال مبارک بمقام کاڑھا گولہ، ضلع کٹیہار بہار میں ۵ر صفر المظفر ۱۱۶۷ھ کو ہوا - مزار مبارک رشید آباد شریف جون پور میں اپنے پیر و مرشد اور جد امجد شیخ محمد ارشد جون پوری کے پائینتی میں واقع ہے - عرس مبارک ۵ر صفر المظفر ہوتا ہے، قل شریف دو پہر ا بجے ہے -

نورالحق شیخ حیدر بخش رشیدی جون پوری

(چوتھے سجادہ نشیں: خانقاہ عالیہ رشیدیہ جون پور)

آپ کا اسم مبارک حیدر بخش اور لقب نورالحق ہے، پیدائش جون پور میں ہوئی، علوم ظاہری کی تحصیل مولانا عبدالقادر قلندر سوگھر پوری وغیرہ سے کی، اپنے نانا قمرالحق حضرت شیخ غلام رشید عثمانی جون پوری کے دست اقدس پر سلسلۂ چشتیہ احمدیہ میں مرید ہوکر خلافت و اجازت سے نوازے گئے۔ آپ کی دو شادیاں ہوئیں تھیں، پہلی شادی سے مولانا شاہ نجیب الدین قدس سرہ پیدا ہوئے اور دوسری شادی سے قیام الحق حضرت شیخ امیر الدین حیدری رشیدی جون پوری پیدا ہوئے جو آگے چل کر خانقاہ عالیہ رشیدیہ جون پور شریف کے پانچویں سجادہ نشیں منتخب و مقرر ہوئے۔ اپنے علمی و اخلاقی کمالات کی وجہ سے اپنے نانا اور پیر و مرشد حضرت قمرالحق جون پوری کے جانشیں اور خانقاہ رشیدیہ جون پور کے چوتھے سجادہ نشیں منتخب ہوئے، آپ نے تربیت و تزکیہ کا کام بڑے پیمانے پہ انجام دیا ہے۔ آپ کے خلفا میں میر سید غلام جیلانی سیوانی، شاہ غلام حسن سیوانی، شاہ محمد حمید راج گیری، میر سید عنایت کریم جعفری پٹنوی، میر سید سجاد علی جعفری پٹنوی، مولانا سید جعفر علی جعفری پٹنوی، سید معصوم علی سادات پوری، میر سید مخدوم علی سیوانی، شاہ رمضان علی مہندانوی، شاہ بشارت علی جون پوری، میر سید غلام غوث گورکھ پوری جیسے باکمال حضرات شامل ہیں۔ ۱۲۲۴ھ میں وصال ہوا، سیوان موضع بھمن برہ شریف میں مدفون ہوئے جو ''تکیۂ حیدری'' کے نام سے مشہور ہے۔ عرس مقدس ہر سال شوال کی ۲۵؍ویں تاریخ کو قبل صبح صادق ہوتا ہے۔

قیام الحق شیخ امیر الدین رشیدی جون پوری

(پانچویں سجادہ نشیں: خانقاہ عالیہ رشیدیہ جون پور)

آپ کا اسم گرامی امیر الدین اور لقب قیام الحق ہے، ولادت باسعادت جون پور میں ہوئی، تعلیم و تربیت اپنے حقیقی چچا حضرت مولانا شاہ حبیب الدین وغیرہ سے ہوئی، والد ماجد نورالحق حضرت شیخ حیدر بخش رشیدی جون پوری تھے، والد ماجد ہی سے سلسلۂ چشتیہ احمدیہ میں بیعت ہوکر تمام سلاسل کی خلافت و اجازت حاصل کی۔ تین شادیاں ہوئیں، پہلی شادی اپنے چچا حضرت مولانا شاہ حبیب الدین کی دختر نیک سے ہوئی، جن سے کوئی اولاد نہیں، دوسری شادی

منشی احمد علی رئیس جون پور (جو حضرت مخدوم عیسیٰ تاج جون پوری کی نسل سے تھے) کی صاحب زادی سے ہوئی، جس سے حضرت شاہ ولی بخش اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں، تیسری شادی اپنے حقیقی ماموں قاضی محمد رضا رئیس قصبہ نظام آباد کی دختر نیک سے ہوئی جن سے قطب الہند حضرت شیخ غلام معین الدین رشیدی جون پوری اور ایک صاحب زادی پیدا ہوئیں، اس طرح کل پانچ اولاد ہوئیں- خلفا میں شیخ غلام معین الدین جون پوری، شیخ قنبر حسین سکندر پوری، میر سید حسین علی جعفری پٹنوی، مولوی معشوق علی حنفی جون پوری، میر محمد قاسم راج گیری، مولانا شاہ واحد علی مہندانوی، میر سید مخدوم علی سادات پوری ہیں- وصال پاک ۱۲۶۵ھ میں ہوا، مزار مبارک رشید آباد شریف میں حضرت قطب عالم جون پوری کے پائینتی میں واقع ہے- عرس مبارک ۹ رمحرم الحرام کو ہوتا ہے اور قل شریف بعد نماز عشا ہے-

قطب الہند شیخ غلام معین الدین رشیدی جون پوری

(چھٹے سجادہ نشیں: خانقاہ عالیہ رشیدیہ جون پور شریف)

آپ کا اسم گرامی غلام معین الدین، کنیت ابوالخیر اور لقب قطب الہند، محرم راز ار عاشق پاک باز تھا- ولادت مبارکہ جون پور میں ہوئی، دینی علوم وفنون کی تحصیل حضرت مولانا محمد شکور مچھلی شہری (تلمیذ رشید حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی وعلامہ فضل امام خیر آبادی) اور حضرت مولانا معشوق علی حنفی رشیدی جون پوری جیسے نامور علما وفضلا سے کی- حسب دستورِ خاندان تاحیات درس دے کر طالبان علوم نبویہ کو مستفیض کرتے رہے- بیعت وخلافت اپنے والد ماجد قیام الحق حضرت شاہ امیر الدین رشیدی جون پوری سے حاصل تھی- سلسلہ رشیدیہ جون پور کے چھٹے امین، متولی اور سجادہ نشیں تھے- شادی اپنے حقیقی ماموں قاضی واجد علی نظام آبادی کی صاحب زادی سے ہوئی تھی جن سے کوئی اولاد نہ تھی، اپنے مشائخ کرام اور پیران سلاسل کے نقوش قدم پہ چلتے ہوئے عظیم علمی و دینی کارنامے انجام دیے- خلفا میں شاہ محمد عبد العلیم آسی غازی پوری، شاہ شاہد حسین راج گیری، سید شاہ محمد سجاد جعفری بہاری، سید شاہ واجد علی سبز پوش گورکھپوری، سید مردان شاہ، شاہ سراج الدین اعظمی، سید شاہ خورشید علی سبز پوش گورکھ پوری، سید شاہ عبد العلی سادات پوری، حافظ شاہ تصدق حسین سادات پوری، مولوی شاہ بندہ حسین شامل ہیں- وصال پاک ۱۳۰۷ھ میں ہوا، مزار مبارک خانقاہ

حیدری (تکیہ حیدری) بھمن برہ ضلع سیوان بہار میں حضرت نورالحق کے دائیں جانب واقع ہے۔ عرس مقدس ۱۶رذی الحجہ کو ہوتا ہے۔قل شریف بعد نماز مغرب ہے۔

امام العارفین شاہ سراج الدین رشیدی جون پوری

(ساتویں سجادہ نشیں: خانقاہ عالیہ رشیدیہ جون پور)

آپ کا نام سراج الدین اور عرف محمد حسن تھا، ولادت مبارک ۱۲۹۱ھ میں قصبہ نظام آباد ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی، والد گرامی حضرت مولانا حکیم قاضی محمد ناصر تھے، علوم ظاہری کی تحصیل مولانا شاہ عبدالعلیم آسی غازی پوری، مولوی عبدالحیٔ مونگیری، مولوی امجد علی بنگالی، سید مولوی محمد ہادی حسن شاہ پوری گورکھ پوری سے کی، بیعت وخلافت کا شرف قطب الہند حضرت شاہ غلام معین الدین رشیدی قدس سرہ سے حاصل تھا، حضرت قطب الہند کے بعد ۹رمحرم الحرام ۱۳۰۸ھ کو خانقاہ عالیہ رشیدیہ جون پور کے منصب تولیت وسجادگی کے لیے مامور ومنتخب ہوئے اور ساتویں سجادہ نشیں قرار پائے، شادی کی نسبت استاذ گرامی حضرت شاہ عبدالعلیم آسی سکندر پوری نے موضع سرسنیاں ضلع اعظم گڑھ میں مقرر فرمائی تھی؛ لیکن رشتۂ ازدواج سے منسلک ہونے سے پہلے ہی سفر رحلت فرمائے، کل ۷رسال خانقاہ رشیدیہ کی مسند سجادگی کو زینت بخشتے ہوئے رشد وہدایت اور خدمت خلق کے فرائض انجام دیئے۔ وصال ۷رذی قعدہ ۱۳۱۴ھ بروز سنیچر کو ہوا، مزار مبارک رشید آباد شریف ضلع جون پور میں قطب الاقطاب، شیخ محمد رشید مصطفیٰ عثمانی جون پوری کے روضۂ مبارکہ سے متصل مشرقی جانب واقع ہے۔

قطب العرفا شاہ عبدالعلیم رشیدی آسی غازی پوری

(آٹھویں سجادہ نشیں: خانقاہ عالیہ رشیدیہ جون پور)

آپ کا اسم گرامی محمد عبدالعلیم، تاریخی نام ظہورالحق، تخلص آسی، عرف حضرت مولانا وسرکار آسی اور لقب قطب عالم، بحرالاسرار قاسم الانوار قطب العرفا والعشاق ہے۔نسب نامہ نویں پشت میں حضرت شیخ احمد مبارک چشتی عدنی کے واسطے امیر المومنین سیدنا حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے۔ ولادت باسعادت سکندر پور ضلع بلیا میں ۱۹رشعبان المعظم ۱۲۵۰ھ میں ہوئی ۔ والد بزرگوار حضرت شیخ قنبر حسین رشیدی سکندر پوری تھے جو ایک درویش کامل اور

قطب العالمین شیخ امیر الدین رشیدی جون پوری کے مرید وخلیفہ تھے، مزار مبارک سکندر پور ضلع بلیا میں واقع ہے- عالم صغر سنی ہی میں والدۂ ماجدہ داغ مفارقت دے کر عالم جاودانی میں داخل ہوگئیں، نانی صاحبہ نے آپ کی پرورش وکفالت فرمائیں- ابتدائی تعلیم اپنے نانا حضرت مفتی احسان علی قاضی پوری سے حاصل کی، اس کے بعد خانقاہ رشیدیہ جون پور کے جامع کمالات بزرگ قطب الہند، شیخ غلام معین الدین رشیدی جون پوری سے تعلیم شریعت وطریقت حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ حنفیہ جون پور میں استاذ وقت مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی لکھنوی اور مفتی یوسف فرنگی محلی لکھنوی سے معقولات ومنقولات کی تمام کتابیں پڑھیں- علوم وفنون کی تحصیل کے بعد مدرسہ رشیدیہ جون پور میں درس وتدریس کے لیے مامور ہوئے- حلقۂ تلامذہ میں مولانا شاہ سراج الدین رشیدی، سید شاہ شاہد علی علیمی فانؔی گورکھپوری، مولانا عبدالمجید کاتبؔ مصطفیٰ آبادی، مولانا سید محمد شادؔ غازی پوری، مولانا علی گوہرؔ پھلواروی، مولانا عبدالاحد شمشادؔ لکھنوی، مولانا محمد صدیقؔ سکندر پوری، ، مولانا محمد احمد ایمنؔ سکندر پوری، مولانا عبدالصمد صمدؔ غازی پوری وغیرہ نامور علما و مشائخ اور با کمال شعرا ادبا قابل ذکر ہیں- شادی غازی پور کے محلہ نورالدین پورہ میں منشی راحت علی غازی پوری کی بڑی صاحب زادی سے ہوئی جن سے صرف تین صاحب زادیاں پیدا ہوئیں- خانقاہ عالیہ رشیدیہ جون پور کے چھٹویں سجادہ نشیں قطب الہند، شیخ غلام معین الدین رشیدی جون پوری کے دست مبارک پر سلسلۂ عالیہ قادریہ احمدیہ میں بیعت وارادت سے مشرف ہوکر جمیع سلاسل کی خلافت واجازت حاصل کی- ۱۳۱۴ھ میں خانقاہ رشیدیہ جون پور کے آٹھویں سجادہ نشیں منتخب ہوئے- خلفا میں سید شاہ شاہد علی سبز پوش علیمی فانؔی گورکھ پوری، حکیم سید شاہ عبدالعزیز بہاری، شاہ محمد اویس پھلواری، مولانا سید شاہ محمد فاخر بیخودؔ اجملی الہ آبادی، سید شاہ نذیر احمد بہاری، شاہ عبدالحق ظفر آبادی، مولانا شاہ عبدالسبحان گورکھپوری، شاہ ذاکر حسین قتال پوری، مولانا ولی الرحمٰن ولیؔ علیمی پوکھریروی ، مولانا عبد الرحیم سیوانی، شاہ الفت حسین غازی پوری وغیرہ ہیں- چودھویں صدی ہجری کے ایک فقید المثال اور ممتاز صوفی شاعر تھے، تخلص پہلے ''عاصیؔ'' تھا؛ بعد میں اپنے شیخ کے حکم سے ''آسیؔ'' کردیا- شاعری میں حضرت شاہ غلام اعظم افضلؔ الہ آبادی سے شرف تلمذ حاصل تھا- شعروادب میں کمال رکھنے کے ساتھ اس فن میں آپ نے بڑی یادگار

چیزیں بھی چھوڑیں ہیں- اشعار کا مجموعہ ''عین المعارف'' کے نام سے مشہور ہے- نحو، صرف، منطق، تصوف مختلف علوم وفنون پر مشتمل فوائد جوہریہ، سراج الصرف، فوائد محمدیہ، فوائد سراجیہ، رسالۂ فریدیہ، رسالۂ احمدیہ وغیرہ جیسی کتابیں تصنیف فرمائیں-۲/ رجمادی الاولی ۱۳۳۵ھ کو پچاسی برس کی عمر میں وابستگان سلسلۂ رشیدیہ سے ہمیشہ کو چھوڑ کر واصل بحق ہو گئے- مزار اقدس محلہ نورالدین پورہ، غازی پور، یوپی میں مرجع انام ہے-

شہودالحق سید شاہ شاہد علی سبز پوش رشیدی فانی گورکھپوری

(نویں سجادہ نشیں: خانقاہ عالیہ رشیدیہ جون پور)

آپ کا اسم مبارک سید شاہد علی، لقب شہودالحق، تخلص فانی تھا، عرف عام میں شاہ صاحب اور اہل عقیدت میں حضرت سبز پوش اور بڑے سرکار سے مشہور ہیں- مذہبا سنی، مسلکا حنفی، مشربا قادری اور وطنا گورکھ پوری ہیں- دار فانی گورکھپور میں ۲۷/ ربیع الاول ۱۳۰۷ھ میں پیدا ہوئے- والد سید عابد علی سبز پوش گورکھپوری تھے جن کا ۲۴/ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا تھا- چچیرے دادا حضرت سید شاہ ہدایت علی اور حضرت سید شاہ واجد علی سبز پوش گورکھ پوری (جو رشتے میں آپ کے چچا اور پھوپھا تھے) نے پرورش وکفالت اور تعلیم وتربیت کی ذمے داری نبھائی- قطب العرفا شاہ عبد العلیم آسی رشیدی غازی پوری کے دست حق پرست پر سلسلۂ عالیہ قادریہ میں بیعت ہوئے اور خلافت واجازت سے بہرہ ور ہوئے- چار اولاد تھیں: سید شاہ راشد علی، سید شاہ عارف علی، سید شاہ مصطفیٰ علی، سید شاہ ہاشم علی- آپ ایک زبردست اور بلند پایہ شاعر تھے، تخلص فانی تھا- ''دیوان فانی'' کے نام سے آپ کے اشعار کا مجموعہ ہے- پیرومرشد حضرت آسی غازی پوری نے خرقہ پوشی کر کے منصب سجادگی وتولیت آپ کو عطا فرمایا اور خانقاہ رشیدیہ، جون پور کا نویں امین وسجادہ نشیں مقرر کیا- سید شاہ راشد علی سبز پوش رشیدی، سید شاہ عارف علی سبز پوش رشیدی، سید شاہ مصطفیٰ علی سبز پوش شہید رشیدی آنی گورکھ پوری، سید شاہ ہاشم علی رشیدی جامی گورکھ پوری، شاہ حکیم لطیف الرحمٰن رشیدی کٹیہاری ثم پورنوی، سید شاہ عبد الشکور رشیدی سادات پوری، سید شاہ ایوب ابدالی رشیدی نیر اسلام پوری، سید شاہ سعید رشیدی سیوانی، شاہ غلام محمد یٰسین رشیدی پورنوی، شاہ غلام عبد القادر رشیدی پورنوی وغیرہ آپ کے خلفا میں ہیں- آپ ۶/ ذی قعدہ ۱۳۷۱ھ/ ۲۷/ جولائی ۱۹۵۲ء

کو مالک حقیقی سے جا ملے- مزار مبارک رشید آباد شریف ضلع جون پور میں حضرت شاہ سراج الدین رشیدی جون پوری کے مزار سے متصل پورب جانب واقع ہے-

منظور الحق سید شاہ مصطفیٰ علی سبز پوش شہید رشیدی آسی گورکھپوری

(دسویں سجادہ نشیں: خانقاہ عالیہ رشیدیہ جون پور)

آپ کا اسم مبارک سید مصطفیٰ علی، تخلص آسی اور لقب منظور الحق تھا، عرف عام میں حضرت شہید اور چھوٹے سرکار سے متعارف ہیں، والد ماجد حضرت سید شاہ شاہد علی سبز پوش رشیدی فانی گورکھپوری تھے- ولادت مبارکہ دار فانی گورکھ پور میں ۱۳۱۲ھ/۱۹۲۲ء میں ہوئی- مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ اور جامع الازہر، قاہرہ، مصر کے تعلیم یافتہ تھے، علاوہ ازیں قطب وقت مولانا شاہ سکندر علی رشیدی، جلالۃ العلم مفتی شاہ یوسف رشیدی پورنوی اور استاذ العلما مولانا شاہ اکرام الحق علیہم الرحمہ سے تعلیم حاصل کی- یوسف پور، غازی پور میں جناب اکرام الحق انصاری کی صاحبزادی سے آپ کا عقد ہوا، جن سے ایک صاحب زادے اور تین صاحبزادیاں تھیں: سید واصل علی، سیدہ آسیہ بی بی، سیدہ فوزیہ بی بی، سیدہ سیمابی بی- شیخ کامل، مریدین و معتقدین اور عمائدین شہر کے اتفاق رائے سے خانقاہ رشیدیہ جون پور کے سجادہ نشیں اور متولی مقرر ہوئے- شعر و شاعری کا ذوق ورثے میں ملا تھا، آسی تخلص اپنایا تھا- خلفا میں مولانا شاہ غلام محمد یٰسین شاہدی پورنوی، مولانا شاہ تاج الدین رشیدی پورنوی، میر سید شاہ زاہد سجاد جعفری پٹنوی، حافظ شاہ یٰسین سیوانی وغیرہ شامل ہیں- بے شمار لوگوں کو اپنے علمی و روحانی فیوض سے سرفراز کیا- مجمع البحرین، محقق اسلام، شیخ طریقت حضرت مفتی شاہ عبید الرحمٰن رشیدی صاحب قبلہ دامت برکاتہم القدسیہ (موجودہ سجادہ نشیں، خانقاہ رشیدیہ، جون پور) آپ ہی کے دامن رشد و ہدایت سے وابستہ ہیں اور آپ کے قابل فخر اور محبوب و چہیتے مرید اور علمی و روحانی جانشیں ہیں- ۱۸ر ذی قعدہ ۱۳۷۸ھ/ جون ۱۹۵۸ء کو جام شہادت نوش فرمائے- والد ماجد اور شیخ کامل کے پہلو میں سپرد خاک ہوئے-

مجمع البحرین، حضرت علامہ مفتی شاہ عبید الرحمٰن رشیدی ظلہ العالی

(موجودہ وگیارہویں سجادہ نشیں، خانقاہ رشیدیہ جون پور)

آپ کا اسم گرامی محمد عبید الرحمٰن ہے، علمی و روحانی دنیا میں آپ محقق اسلام، فقیہ عصر، مجمع

البحرین کے باوقار القاب سے متعارف ہیں- ولادت باسعادت ''بینی باڑی'' ضلع کٹیہار بہار کے ایک علمی وروحانی گھرانے میں ہوئی، والد ماجد امام العارفین مولانا حکیم شاہ لطیف الرحمٰن شاہدی رشیدی تھے جو شہود الحق حضرت سید شاہ شاہد علی سبز پوش گورکھپوری کے مرید خاص اور خلیفۂ اکمل تھے، جن کا مزار مبارک درگاہ شریف، چمنی بازار، پورنیہ سیٹی بہار میں واقع ہے- آپ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، باضابطہ تعلیم کا آغاز دار العلوم مصطفائیہ درگاہ شریف چمنی بازار پورنیہ سے کیا اور یہاں ''شرح جامی'' تک کی تعلیم حاصل فرمائی، اس کے بعد دار العلوم حنفیہ رضویہ بنارس اور مدرسہ مظہر اسلام مسجد بی بی جی بریلی شریف سے علوم وفنون حاصل کرتے ہوئے ہندوستان کی معروف اور مرکزی درس گاہ دار العلوم اشرفیہ مصباح العلوم مبارک پور اعظم گڑھ تشریف لائے اور جملہ علوم وفنون کی تکمیل فرمائی- مادر علمی (جامعہ اشرفیہ مبارک پور) میں دوران تعلیم ہی آپ کی علمی صلاحیت اور بالغ نظری سے متاثر ہو کر آپ کے نہایت مشفق استاذ، حافظ ملت مولانا شاہ عبد العزیز شیخ الحدیث دار العلوم اشرفیہ مصباح العلوم مبارک پور نے معین المدرسین کی حیثیت سے آپ کے سپرد فرمایا جسے آپ نے بحسن وخوبی انجام دیا- فراغت کے بعد پھر مستقل طور پر کارِ درس وتدریس میں مصروف ہوئے اور ملک کے کئی بڑے اور اہم ادارے میں ۲۰ رسال تک درس وتدریس اور فقہ وافتا اور قضا کے فرائض انجام دیے- اکابر علما و فقہا اور مشائخ ومحققین نے فتاوے کی تائید وتوثیق کر کے آپ کی علمی وفقہی تحقیق کی تحسین فرمائی- ہمہ جہت مصروفیات کے علاوہ اب تک آپ کے قلم جوہر رقم سے جو علمی، تحقیقی اور اصلاحی کتابیں منظر عام پر آئی ہیں، وہ یہ ہیں: اختیار نبوت، بیان حقیقت، جواہر الحدیث، آیات نافعہ، اذکار نافعہ، معمولات قطب الاقطاب- اس کے علاوہ کئی ضخیم جلدوں پر آپ کے فتاوے ہیں جو بلاشبہ آپ کا زبردست علمی وفقہی کارنامہ اور دینی احکام ومسائل کی رہنمائی کا ایک اہم ذخیرہ وسرمایہ ہے- عقد مسنون ''دِلال پور'' نامی گاؤں میں حضرت مولانا میر سید عبد الستار شاہدی رشیدی علیہ الرحمہ (مرید سید شاہ شاہد علی سبز پوش گورکھ پوری) کی دختر نیک اختر سیدہ شاہدہ خاتون شاہدی (مریدہ سید شاہ شاہد علی سبز پوش گورکھ پوری) سے ہوا، جن کے بطن مبارک سے ایک صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں تولد ہوئیں- منظور الحق سید شاہ مصطفیٰ علی شہید آسی رشیدی

(دسویں سجادہ نشیں، خانقاہ رشیدیہ، جون پور) کے دست اقدس پر ۱۹۵۶ء میں سلسلۂ عالیہ چشتیہ مصطفائیہ میں بیعت وارادت سے مشرف ہوئے۔ والد بزرگوار شاہ حکیم لطیف الرحمٰن رشیدی، مولانا شاہ غلام محمد یٰسین رشیدی اور سید شاہ زاہد سجاد جعفری پٹنوی دام ظلہ (خلیفۂ مطلق حضرت منظور الحق) سے تمام سلاسل کی اجازتیں اور خلافتیں حاصل ہیں۔ پیر و مرشد حضرت منظور الحق کے ۱۳۷۸ھ/ ۱۹۵۸ء میں جام شہادت نوش فرمانے کے بعد سلسلۂ رشیدیہ کے علما و مشائخ، عمائدین شہر اور دیگر ذمے داران کے اتفاق رائے سے ۱۹۸۶ء میں خانقاہ رشیدیہ، جون پور کے گیارہویں امین و سجادہ نشیں مقرر ہوئے۔ اپنے پیران کرام اور مشائخ عظام کے نقوش قدم اور خانقاہی اصول و معمولات انتہائی سادگی اور خاموش مزاجی کے ساتھ اپنی تمام تر علمی، فقہی، ذہنی، فکری، عملی، دینی اور روحانی توانائیوں کو بروئے کار لا کر شب و روز اخلاق و روحانیت، خدمات انسانیت، سالکین و طالبین کی تربیت و تزکیہ اور خانقاہ رشیدیہ کی ترویج و اشاعت میں مصروف عمل ہیں۔

☆☆☆

حضرت آسی کے مرشد کامل

مولانا صبغۃ اللہ رشیدی☆

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ پہاڑوں میں بے شمار پتھر ہوتے ہیں مگر کمال ہے اس جوہری کا جس نے ان تمام پتھروں سے عقیق کو نکالا اور تراش خراش کر کے اسے خوبصورت اور قیمتی نگینہ کی شکل دیا اور ایسے اوصاف وکمالات سے مزین ومرصع کر دیا کہ لوگ اس نگ اور انگوٹھی کی تعریف کیے بغیر خاموش نہیں رہ سکتے۔

یہی حال عارف باللہ بحر الاسرار قاسم الانوار، قطب العرفا والعشاق حضرت علامہ شاہ عبدالعلیم آسی سکندر پوری ثم غازی پوری کا ہے۔ آپ بے شمار اوصاف وکمالات سے مزین ہوکر معاصر علما، صوفیا اور شعرا میں ایک خوبصورت اور قیمتی نگینہ کے مانند ہیں جس کی تعریف کیے بغیر کوئی بھی صاحب علم وکمال خاموش نہیں رہ سکتا۔ آپ اسرار ومعرفت کے وہ بیش قیمت خزانہ ہیں جن کے حصول کی تمنا لیے ہوئے کج کلاہان زمانہ نے آپ کے در کی خوشہ چینی کی اور خوب بہرہ مند ہوئے۔

درحقیقت یہ ساری محنت وکاوش اس جوہری کی مانی جائے گی جس نے اس عظیم سرمایۂ

☆ پرنسپل دار العلوم مصطفائیہ، درگاہ شریف، چمنی بازار، پورنیہ بہار

اخروی کو دنیا کے بے شمار لوگوں سے چن کر گونا گوں خوبیوں سے مزین کیا۔ انہیں بارہ سال کی عمر ہی سے اپنے قرب خاص میں لے لیا۔ زیور علم سے آراستہ و پیراستہ کیا۔ ظاہر و باطن کو سنوارا نکھارا، زندگی کے ہر موڑ پر تراش و خراش کر کے ایک قیمتی انسان، سرمایۂ ملت کا نگہبان اور پھر بے پناہ علوم و معارف سے مالا مال فرما کر ہم غلامان خانقاہ رشیدیہ کو ایک عظیم مربی اور مرشد عطا فرمایا۔

وہ جوہری کس عروج وارتقا کا مالک ہوگا، کن فنون و کمالات کے مالک ہوں گے اور کیسی قابلیت و صلاحیت ہوگی؟ جس نے اپنے برادر طریقت شیخ قنبر حسین رشیدی سکندر پوری کے صاحبزادے محمد عبدالعلیم کو بحر الاسرار، قاسم الانوار، قطب العرفا والعشاق، عارف باللہ اور خانقاہ رشیدیہ کا سجادہ نشیں بنا دیا۔ خود عارف باللہ علامہ عبدالعلیم آسی لکھتے ہیں۔

جب بڑھائی دست بیعت شیخ نے
پھر گئی آنکھوں میں شکل اللہ کی

اس جوہری کی ذات کیسی ہوگی؟ اس کی ستودہ صفات اور مخفی اثرات کیا ہوں گے؟ اس کے فضائل و کمالات کیا ہیں؟ تو ملاحظہ فرمائیں کہ اس بافیض جوہری کو دنیا قطب الہند شیخ غلام معین الدین رشیدی جون پوری کے نام سے جانتی پہچانتی ہے۔

آپ کا نام غلام معین الدین، عرف امید علی، کنیت ابوالخیر اور لقب قطب الہند، محرم راز اور عاشق پاک باز ہے۔ آپ حسب و نسب دونوں اعتبار سے اعلیٰ خاندان، نامور علما اور اولیاء اللہ کے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کی ماں قاضی محمد رضا رئیس قصبۂ نظام آباد اعظم گڑھ کی بیٹی اور قاضی محمد جمیل کی پوتی تھی اور والد ماجد حضرت قیام الحق جون پوری، خانقاہ رشیدیہ، جون پور کے چوتھے سجادہ نشین تھے۔ آپ حضرت نور الحق کے پوتے اور حضرت قطب الاولیا ابو فیاض قمر الحق کے پرپوتے تھے۔ آپ نے علوم ظاہری کی تحصیل اپنے عہد کے ممتاز اور مایۂ ناز اساتذۂ کرام سے کی جن میں دو شخصیتوں کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں ایک شیخ المشائخ مولانا معشوق علی حنفی جون پوری (خلیفہ حضرت قیام الحق جون پوری، پانچویں سجادہ نشیں: خانقاہ رشیدیہ جون پور) ہیں جن کی درس گاہ اور جن کے فضل و کمال کی شہرت شرق سے غرب تک تھی۔ تشنگان علوم کی جماعتیں آکر آپ سے علم کی پیاس بجھاتیں۔ کافیہ جو فن نحو میں ایک معرکۃ الآرا

کتاب ہے، جس کی عبارتیں مبہم ومعنی خیز ہیں اور کاملان نحو اس کے مخفی سوالات میں کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں، اس پر حاشیہ نگاری فرما کر آپ نے شائقین علم نحو کی مشکلات کا حل فرمایا ہے۔ آپ مختلف فنون پر عبور وکمال کے ساتھ مسند طریقت کے عظیم شیخ بھی تھے۔ تعلیق کافیہ میں محشی کی مختصر شناخت کا ذکر اس طرح ہے:

''حتی اشتهر صيت تدريسه فی الآفاق شرقاً و غرباً ومال إليه جماعاة كثيرة من طلاب العلوم. وتلمذوا ليه و كسب عنه الفيوض والبركات وتحلو بحل المعلوم والمعارف وتطهرت قلوبهم وانفسهم عن الارجاس والادناس... اصبح بعضٌ من تلاميذه شيخ الطريقة فی بعض السلاسل الشيخ غلام معين الدين رشيدی قدس سره، ان قطب الهند الشيخ غلام معين الدين رشيدی احد الطلاب الذين تلمذ واعلیٰ الشيخ معشوق علی الجو نفوری''
[کافیہ، مطبع مجلس برکات، مبارک پور]

قطب الہند شیخ غلام معین الدین رشیدی جون پوری نے بھی آپ کی درس گاہ سے علمی فیوض وبرکات حاصل کیے ہیں۔

اور آپ کے دوسرے استاذ مولانا عبد الشکور مچھلی شہری ہیں جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ دین ودنیا دونوں میں عروج وکمال سے نوازا تھا۔ مرتبۂ منصبی سے صدر الصدوری تک پہنچ چکے تھے۔ جون پور شریف میں بحیثیت سب جج تھے۔ ان ہی ایام میں حضرت قطب الہند شاہ غلام معین الدین نے آپ سے کتابیں پڑھیں۔ آپ ۱۱۱۱ھ میں پیدا ہوئے اور دہلی جا کر مولوی رشید الدین خان سے علوم عربیہ کی تکمیل کی۔ اور کچھ کتابیں مولانا شاہ عبد العزیز دہلوی سے اور معقولات کی کتابیں مولانا فضل امام خیر آبادی سے پڑھیں۔ فقہ وحدیث وادب میں آپ کا کمال مشہور تھا۔ چالیس برس کے قریب آپ پنشن کے بعد زندہ رہے۔ دو سو روپے ماہوار علوفہ پاتے رہے۔ تین مرتبہ زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہو چکے تھے۔ خوش اوقات اور شب تہجد گزار تھے۔ ۸۹ر برس کی عمر میں ۱۲۰۰ھ میں رحلت فرما کر مچھلی شہر میں مدفون ہوئے۔ [سمات الاخیار، ص: ۲۰۰]

آپ اپنے والد حضرت قیام الحق سے سلسلہ چشتیہ احمدیہ میں مرید ہوئے اور خاندان

رشیدیہ میں رائج جملہ سلاسل کی اجازت وخلافت اوران کی جانشینی بھی حاصل ہوئی۔ لیکن سلسلۂ زاہدیہ کی اجازت وخلافت حضرت مخدوم شیخ بدر الدین بدر عالم زاہدی کی روح پرفتوح سے بطریق اویسیہ ملی۔

قطب الہند کا انکشاف

آپ کا لقب قطب الہند ہے۔ جس کا علم اس وقت ہوا کہ جب آپ پانی جہاز سے حج کے لیے تشریف لے جارہے تھے۔ اسی جہاز میں پیلی بھیت کے ایک بزرگ نیچے طبقے پر اپنے مریدین کے ہمراہ تھے۔ اہل جہاز نے ایک مقام پر دور سے تیز وتند آندھی کا آنا معلوم کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آندھی قریب سے قریب تر ہوتی جارہی تھی۔ جہاز پر موجود سبھی لوگ خوفزدہ ہوگئے۔ گھبراتے ہوئے لوگوں نے پیلی بھیت کے اس بزرگ سے عرض کیا کہ آپ دعا کریں کہ آندھی ٹل جائے۔ ورنہ اس طوفان سے بچنے کی ظاہری کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ہم سب یہیں غرقاب ہوجائیں گے۔ آپ نے جو لوگوں کا اصرار بسیار دیکھا تو ارشاد فرمایا کہ:

"اوپر منزل میں تشریف فرما ایک بزرگ ہیں جو قطب الہند ہیں۔ تم لوگ انہی کے پاس جاؤ وہ دعا کریں گے تو آندھی ٹل جائے گی۔" چناں چہ لوگوں نے ایسا ہی کیا اور آپ کی دعا سے آندھی ٹل گئی۔ [راوی مجمع البحرین، مفتی عبید الرحمٰن رشیدی زیب سجادہ، خانقاہ رشیدیہ جون پور]

سمات الاخیار اور تصوف اور مشائخ خانقاہ رشیدیہ میں ہے:

"آپ کی حیات میں ایک خاص طریقہ سے دریافت کیا گیا تھا کہ آپ کا مرتبہ اس وقت کیا ہے؟ معلوم ہوا کہ قطب الہند ہیں"

قطب الہند کا لقب آپ کی ذات پاک سے اس قدر متصف ہوا کہ بہت کم ایسے لوگ ہیں جنہیں آپ کے نام کا علم ہے بلکہ اسی نام سے زیادہ مشہور ہیں۔

محرم راز

آپ کا لقب محرم راز بھی ہے۔ آپ نے اسرار ومعرفت اور فضائل وکمالات کی ہر وقت پردہ پوشی کی، کبھی بھی اپنے کمالات پر آگہی کا کسی کو موقع نہیں دیا۔ صاحب سمات الاخیار لکھتے ہیں:

"خرق عادات اور اظہار کرامات کو بہت برا جانتے۔ اگر احیاناً اضطراری حالت میں کوئی

بات ظاہر ہو جاتی تو اس کے اخفا میں کوشش کرتے یا کوئی تاویل فرماتے۔ جس کے ساتھ کوئی معاملہ پڑتا، اسے چھپانے کی تاکید ہوتی۔ اگر کہیں راز فاش ہو جاتا تو اس کے سر کوئی آفت آجاتی۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ میرے شیخ کا مقولہ ہے کہ "درویشی کو اس طرح چھپانا چاہیے جس طرح عورتیں کرسف کو چھپاتی ہیں"۔ [سمات الاخیار، ص:۲۰۵]

حضرت شاہ مولوی عبد الغفور ابو العلائی یوسف پوری جو بڑے سیاح اور درویش کامل اور علما ومشائخ کی صحبت اٹھاتے ہوئے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ:

"ہند سے عرب تک اس جامعیت کا شیخ کہیں نہیں پایا"

اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ:

"اور جگہ خلائق کے عقیدہ بڑھانے کی فکر رہتی ہے اور یہاں رہے سہے عقیدے کے کھونے کی تدبیر کی جاتی ہے" [سمات الاخیار، ص:۲۰۶]

آپ ہر ممکن طور پر اپنی بزرگی وکمالات پر پردہ ڈالتے رہے۔ باوجود اس کے بعض اہل نظر نے جن اسرار وکمالات پر آگہی پائی ان میں سے چند بطور انشراح قلب یہاں ذکر کیے جارہے ہیں تاکہ محرم راز سے ملقب ہونے کا صحیح راز کھل جائے۔

حافظ محمد علی جون پوری خانقاہ کے ملازم تھے۔ ان کے والد حضرت شاہ نعمت اللہ پھلواروی کے مرید تھے۔ ان کی خواہش ہوئی کہ زاد راہ ہو تو میں بھی پھلواری جاکر مرید ہو آؤں۔ ایک رات وہ حضرت قطب الہند قدس سرہ العزیز کی کمر دبا رہے تھے آپ کو شاید کچھ غنودگی طاری ہوئی۔ اسی دوران حافظ محمد علی کے دل میں خیال آیا کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کمر سے پٹکا نکل جاتا تھا۔ اولیا اللہ کو یہ بات حاصل ہے یا نہیں۔ دل میں یہ خطرہ گزرتے ہی ان کا ایک ہاتھ کمر کے اس سرے اور دوسرا کمر کے اس سرے پر تھا، دبایا تو دونوں ہاتھ باہم مل گئے۔ آپ نے تنبیہ فرمائی کہ خبردار! کسی سے کہنا نہیں۔ حافظ جی صبح کو آپ سے مرید ہو گئے۔ اور حضرت کے وصال تک حضرت مولانا عبد العلیم آسیؔ کے سوا کسی سے اس کا ذکر بھی زبان پر نہ لائے اور حضرت مولانا نے بھی احتیاط کی۔ [سمات الاخیار، ص:۲۱۱]

نقل ہے کہ شیخ اکبر علی رئیس بھتری ضلع غازی پور سید احمد صاحب بریلوی کے مرید اور فقیر

دوست آدمی تھے۔ ایک درویش ان کی مسجد میں آئے اور رہتے رہتے کچھ دنوں تک رہ گئے۔ درویش کے مجاہدہ وریاضت سے ان کو ایک خوش عقیدگی پیدا ہوگئی۔ اور بہت گھبرا کر اس نے اس سے کہا کہ اپنے فیض ونعمت سے مجھے بھی بہرہ یاب کیجئے۔ درویش نے کہا کہ میں اتنا نہیں ہوں کہ کسی کو فیض پہنچا سکوں۔ عقیدت نے تو پہلے گھر کر لیا تھا؛ لیکن یہ کہنا اور بھی باعث اصرار ہوا۔ آخر درویش نے ان سے یہ کہا کہ:

''مجھ سے تم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا، ہاں! ایک شیخ کا پتہ دیتا ہوں وہاں جاؤ!، اگر تمہارے مقدر کا کچھ ہوگا تو کچھ نہ کچھ مل ہی جائے گا۔'' پوچھا: کون بزرگ ہیں؟ درویش نے کہا:

''یہاں سے اٹھارہ کوس پچھم جون پور ایک شہر ہے، وہاں ایک بزرگ ہیں جن کا نام شاہ غلام معین الدین ہے، میں وہیں سے آیا ہوں۔ ایسا بزرگ تو میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ میں جون پور جب پہنچا تو زیارت کی غرض سے حاضر خدمت ہوا۔ آپ عصر کی نماز پڑھنے کے لیے خانقاہ سے باہر تشریف لا چکے تھے کہ میں ملا اور عرض کیا کہ میں نے اکثر درویشوں سے '' لا الٰــہ الا اللہ '' کے معنی پوچھے، ہر ایک نے یہی بتایا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ مگر اس جواب سے میرے دل کو تشفی نہیں ہوئی۔ اگر آپ توجہ فرمائیں تو شاید مجھے تسکین ہو جائے۔ آپ نے فرمایا اس کے معنی وہی ہیں۔ اس کے سوا اور کیا بتاؤں۔ یہ فرما کر آپ مسجد میں تشریف لے گئے اور میں خانقاہ میں بیٹھ گیا۔ نماز پڑھ کے جب واپس آئے اور میں نے رخصت ہونا چاہا تو آپ نے روک لیا۔ رات کے وقت کھا پی کے جب آپ پلنگ پر تشریف لے گئے تو آواز دی بچو! جب کسی نے جواب نہیں دیا تو میں نے عرض کیا کہ فقیر حاضر ہے۔ کچھ ارشاد ہو۔ آپ نے فرمایا کہ میری کمر میں درد ہے۔ کمر دابنے کو بلا رہا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ میں حاضر ہوں۔ فرمایا کیا حرج ہے۔ میں نے کمر دبانا شروع کیا تھوڑی دیر بعد آپ نے فرمایا ذرا زور سے دباؤ۔ میں نے کچھ زور کیا، آپ نے فرمایا اور زور سے۔ میں نے بھر پور زور کیا۔ آپ نے فرمایا تم خوب زور نہیں کرتے ہو اچھا کلمہ طیبہ پڑھتے جاؤ۔ شاید اس کی برکت سے درد مٹ جائے۔ میں کلمہ طیبہ پڑھتا ہوا دباتا جاتا تھا، تھوڑی دیر بعد یہ دیکھا کہ جب میں '' لا الٰــہ '' کہتا تھا تو ہاتھ سے جسم مبارک غائب ہو جاتا اور جب '' الا اللہ '' کہتا تو موجود ہو جاتا تھا۔ پانچ دس مرتبہ کے بعد میرا

ذہن اپنے جواب کی طرف مائل ہوا اور اسی وجد کی حالت میں بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا کہ میں جواب پا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا پایا۔ میں نے کہا جب میں ''لا الـہ'' کہتا ہوں، جسم نہیں رہتا اور جب ''الا اللـہ'' کہتا ہوں، جسم موجود ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا، چلو چلو خوب سمجھا۔ اس وقت تم کو غنودگی ہے۔ جب ہاتھ جسم سے الگ ہو جاتا ہے تو سمجھتے ہو کہ جسم ہی نہیں ہے اور جب ہاتھ جسم پر پہنچتا ہے تو سمجھتے ہو کہ جسم موجود ہے۔ [سمات الاخیار، ص: ۲۱۵]

اللہ اللہ حکمت وکمال کا یہ عالم کہ کمر دبانے کے بہانے کلمہ طیبہ کا تشفی بخش جواب دے رہے ہیں اور رازداری کا یہ عالم کہ تاویل کر کے اپنی بزرگی پر پردہ ڈال رہے ہیں۔

شیخ نجابت سکندر پوری تجرد کی وجہ سے زیادہ تر خانقاہ میں رہا کرتے تھے۔ لقوے کی وجہ سے ان کی زبان میں لکنت تھی۔ دقت سے بولی نکلتی تھی۔ ایک دن انہوں نے حضرت سے عرض کی آپ نے فرمایا کہ رشید آباد جاؤ۔ حضرت دیوان جی کے مزار کی خاک لے کر چاٹ جاؤ مگر کسی سے کہنا نہیں، وہ جا کر خاک چاٹ آئے۔ زبان میں گویائی آگئی۔ ذرا وہ سادہ لوح آدمی تھے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، خوشی میں آکر سب سے کہتے پھرے، جب دو روز میں اس معاملہ کا افشا ہو گیا پھر وہی اصلی حالت ہو گئی۔ [سمات الاخیار، ص: ۲۲۱]

آپ ایک زمانہ تک روزانہ نماز مغرب کے بعد خانقاہ سے تقریباً ۳ رکلومیٹر مسافت طے کر کے رشید آباد بزرگوں کے آستانہ پر تشریف لے جاتے اور پھر خصوصی اذکار و وظائف عرض و معروض واستغاثہ کے بعد عشا کے وقت واپس خانقاہ تشریف لاتے۔ لوگ یہ سمجھتے کہ آپ نماز مغرب کے بعد خانقاہ میں تشریف فرما ہیں جب کہ آپ خانقاہ کی کھڑکی سے نکل کر رشید آباد تشریف لے جاتے اور کھڑکی ہی سے واپس آتے۔ [ملخص از سمات الاخیار: ۲۰۶]

آپ بخلاف اور درویشوں کے لوگوں کے سامنے دنیا کی باتیں زیادہ کرتے۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ دنیاوی غرض والے بدعقیدہ ہو کر کنارہ کش رہیں۔ الغرض آپ جن افضال وکمالات کے مالک اور مرتبۂ علیا پر فائز تھے۔ اپنی درویشی اور شخصیت پر سب سے پردہ ڈالتے رہے۔ بظاہر اعمال واذکار بھی ایسا کرتے کہ آپ کے مخفی اعمال واذکار کی کسی کو بھنک تک نہ لگ پائی۔ بظاہر عام نکوکاروں کی طرح پنج وقتی نماز اور نوافل، کچھ وظیفہ اور قرآن و دلائل الخیرات کی

تلاوت کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ رات میں عام لوگوں کی طرح وقت پر سو جایا کرتے پھر جب عوام سو جاتی تو آپ کی عبادت و ریاضت کا وقت ہوتا اور اسی میں سحر فرما دیتے۔ بھیڑ بھاڑ عوام میں بزرگی و برتری آپ کو قطعاً ناپسند تھی۔ آپ کی تعلیم کا وقت وہی رات کا پچھلا پہر تھا تنہا تنہا تعلیم ہوتی جن پر نظر عنایت ہو جاتی ان کی قسمت کا ستارہ بلند ہو جاتا۔ انہیں قرب خاص میں جگہ دیتے اور صفائے قلب و اسرار و رموز کی خصوصی تعلیمات سے نوازتے۔ دل ہمیشہ یاد خدا میں مستغرق رہتا، باوجود غلبۂ حال آپ کا راز نہ کھلتا۔ انہیں وجوہات کے پیش نظر اہل نظر نے آپ کو محرم راز کے لقب سے ملقب کیا۔

عاشق پاک باز

محرم راز کی طرح آپ کا لقب "عاشق پاک باز" بھی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ مشائخ و اولیا کرام کے مزارات مقدسہ پر حاضری کا بڑا شوق رکھتے۔ پاک بازوں سے خاص لگاؤ اور عشق تھا۔ انہیں پاک بازوں سے عشق و محبت کا نتیجہ تھا کہ بہت سی روحانی و باطنی نعمتوں سے سرفراز بھی ہوئے۔

چناں چہ سلسلۂ زاہدیہ جو پہلے سے آپ کی خانقاہ میں نہیں تھا۔ آپ ہی کے توسل سے اس خانقاہ میں آیا۔ قصہ یوں ہے کہ

آپ بہار شریف میں سلطان المحققین حضرت مخدوم شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کے مزار اقدس پر حاضری کے بعد چھوٹی درگاہ حضرت مخدوم شاہ بدر الدین بدر عالم زاہدی کے مزار اقدس پر حاضر ہوئے۔ چھوٹی درگاہ کے خادم حضرت محبوب شاہ نے آکر عرض کی کہ حضرت مخدوم نے مجھ کو سلسلۂ زاہدیہ میں مرید ہونے کے لیے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر مرید کرنے کو فرمایا ہے تو اس میں کچھ بحث نہیں مگر سلسلۂ زاہدیہ میرے یہاں کہاں ہے؟ شاہ صاحب (محبوب شاہ) نے کہا کہ مخدوم نے ایسا ہی فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم سے فرمایا ہے، مجھ سے نہیں۔ جب فرمائیں گے، دیکھ لیا جائے گا۔ خادم رخصت ہو گئے۔

رات میں حضرت مخدوم پاک نے آپ کو کن کن باطنی و روحانی نعمتوں سے سرفراز فرمایا، وہ راز کی بات راز ہی میں رہی۔ صبح کو آپ نے نماز سے پہلے ہی اپنے خادم سے ارشاد فرمایا کہ جاؤ محبوب شاہ کو بیعت کے سامان کے ساتھ بلا لاؤ۔ محبوب شاہ حاضر ہوئے تو آپ نے سلسلۂ

زاہدیہ میں بیعت لی۔

شجرہ میں آپ کو اپنے نام کے بعد حضرت مخدوم شاہ بدر الدین بدر عالم زاہدی کا نام لکھا تھا۔ اس لیے کہ بہت سے بزرگوں کو اولیا اللہ کی ارواح سے نعمت و اجازت ملی اور انہوں نے بلا واسطہ شجرہ میں اپنے نام کے بعد اسی بزرگ کا نام لکھا ہے۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا تا کہ روحانی اجازت وخلافت اور انعام واکرام کا یہ راز کھل نہ جائے۔ بنظر اخفائے معاملہ آپ نے اپنے پیر ومرشد شیخ المشائخ قیام الحق شاہ امیر الدین رشیدی جون پوری کے خلیفہ رشید الحق شاہ میر سید حسین علی جعفری بہاری سے اجازت نامہ لکھوا کر شجرہ دیا۔ (جب کہ حضرت میر سید حسین علی جعفری آپ ہی کے خلیفہ ہیں مگر ان کو سلسلۂ زاہدیہ کی اجازت وسجادہ نشینی اپنے حقیقی چچا فیاض الحق حضرت میر سید سجاد علی سے تھی۔ آپ حضرت سید جعفر علی کے بیٹے اور مستجاب الدعوات تھے۔ زبان سے جو نکلتی تھی، ہو جاتی۔

یوں تو آپ پہلے ہی سے ان بارگاہوں میں بغرض زیارت کثرت سے تشریف لائے مگر اس واقعہ کے بعد زاہدیوں سے آپ کی محبت اور بڑھ گئی۔ حد یہ کہ چھوٹی درگاہ کے قریب ایک مکان بنوانے کا ارادہ فرمالیا تا کہ جب اس خطہ میں آنا ہو تو یہاں سکون سے ٹھہرا جائے۔ آپ بہمن برہ نور الحق حضرت شیخ حیدر بخش رشیدی جون پوری کے آستانہ پر جاتے تو چوکی قتال پور حضرت شیخ شہاب الدین زاہدی کی مزار پر بھی ضرور جاتے اور شیخ پورہ قاضی پور جاتے تو حضرت مخدوم شاہ بدر الدین بدر عالم زاہدی کے پوتے حضرت رکن الدین شاہ رکن عالم زاہدی کے مزار فیض رساں پر ضرور جاتے۔

آپ نے رودولی، اجودھیا، سکلائی، جھونسی، بہار شریف، منیر شریف، جٹھلی شریف، ساتار، سکندر پور، ماہ پور، مصطفیٰ آباد، شیخ پورہ، قاضی پور، فیروز پور، حسن پورہ، سیوان، بہمن برہ اور چوکی قتال پور وغیرہ مقدس مقامات کا سفر کر کے پیران سلاسل کے مزاروں کی زیارت کی اور ''سیروا فی الارض'' کے بمصداق مختلف مقامات پر طرح طرح کی عنایتوں سے سرفراز ہوئے۔ اجمیر شریف دیورنیہ کا بھی قصد فرمایا مگر عوارض کے پیش نظر پہنچنے سے قاصر رہے۔

الغرض پاکبازوں سے آپ کو بے حد عشق تھا۔ نہ یہ کہ صرف اصحاب مزار سے فیوض

وبرکات حاصل کرتے بلکہ حیات ظاہری میں رہنے والے مشائخ سے بھی ملتے۔ جن کو اپنے سے کم پاتے نواز دیتے اور جن کو زیادہ پاتے ان سے حاصل کر لیتے۔ جیسا کہ ۱۲۹۸ھ میں زیارت حرمین شریفین کے موقع پر حاجی شاہ امداد اللہ چشتی صابری مہاجر مکی سے آپ کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے آپ سے فیض وبرکات حاصل کرتے ہوئے اپنے مقدر کی بہت سی نعمتیں لی اور دوسرے دن جب وہ دوبارہ حاضر خدمت ہوئے تو اپنا ایک رسالہ اجازت نامہ کے ساتھ دے گئے جس رسالہ کی اجازت آپ نے سید شاہ محمد سجاد جعفری کو ۱۳۰۰ھ میں اجازت وخلافت اور اذکار واشغال خاندانی دیتے وقت عطا فرمائے۔

یوں تو آپ مقبولان بارگاہ الٰہی میں سے ہیں جن کی دعا کو اللہ رب العزت رد نہیں فرماتا ہے۔ مگر آپ کے بعض اوقات ایسے ہیں جن میں جس نے جیسی عرضی پیش کی ان کا کام ہو گیا۔ جیسا کہ عارف باللہ حضرت علامہ شاہ عبد العلیم آسی فرماتے ہیں کہ ایک بار میرے ہاتھ میں ایک دانہ نکل آیا اس کی سوزش کی وجہ سے میں بے چین تھا۔ آپ کی تاثیر کے اوقات میں حاضر ہو کر عرض کی کہ مجھے یہ دانہ نکل آیا ہے۔ آپ نے اس پر ہاتھ پھیر کر فرمایا کہ جاؤ اس پر گوگل لگا دو۔ تھوڑی دیر کے بعد بغیر کچھ لگائے اچھا ہو گیا۔

درش حاجت روائی عاجز و مسکین محتاجاں
رحیم درد منداں ابر دریا دل معین الدین

یعنی آپ کے آستانہ سے عاجز و مسکین محتاجوں کی حاجت پوری ہوتی اور دردمندوں پر آپ کی رحمت ونور اور فیوض وبرکات کی بارش ہوتی ہے۔

عموماً آپ اپنی بزرگی پر پردہ ڈالتے ہوئے کسی کو دعا بھی دیتے تو کسی ظاہری سبب کے پردہ میں دیتے تاکہ دنیا والے یہ سمجھیں کہ یہ اس ظاہری سبب کا اثر ہے جب کہ ابھی اس ظاہری سبب کا استعمال بھی نہ ہوتا کہ اس سے پہلے ہی آپ کی دعا کا اثر کارفرما ہو جاتا جیسا کہ واقعۂ مذکورہ سے آپ کو معلوم ہوا کہ آپ نے اپنی بزرگی وکمال پر پردہ ڈالتے ہوئے گوگل لگانے کا حکم فرمایا۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں اچھا ہو گیا۔ گوگل لگانے کی حاجت بھی نہ ہوئی۔

آپ کی تاثیر کے اوقات کیا ہیں اس سلسلے میں صاحب ''سمات الاخیار'' ایک مقام کی تعیین

کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تلاوت کے بعد آپ کے تاثیر کا وقت ہوتا تھا جس نے اس وقت عرضی پیش کی اس کا کام نکل گیا'' [سمات الاخیار، ص:۲۰۹]

مریدین کی دست گیری

خانقاہ عالیہ رشیدیہ کے جملہ سجادگان کی طرح آپ میں بھی مریدین کی تعداد بڑھانے کی کبھی حرص نہ رہی بلکہ جو لوگ بصدق و اخلاص آپ سے رجوع کرتے انہیں سلسلہ میں داخل فرماتے مگر جن کو سلسلہ میں داخل فرماتے ان کے دین و دنیا کے فلاح کی تدبیر کرتے رہتے۔ ایسی بیعت آپ کو ناپسند تھی کہ بعد بیعت مرید پر بیعت کا اثر نہ ہو۔ آپ فرماتے ہیں۔

زباں سے پیر کہنا دل میں ایک خس بھی نہیں گننا
کہو حضرت یہ بیعت کیسی، ہے یہ کون ہیں صاحب

آپ کے مریدین کم ہوتے مگر جتنے بھی ہوتے ان میں درویشی کا رنگ اور خدا ترسی کا ڈھنگ ہوتا۔ مبادا کوئی مرید دنیاوی رنگینیوں میں پھنس کر غلط روی اختیار کرتا تو ہر وقت روحانی نصرت فرما کر ان کی اصلاح حال فرماتے جس سے وہ اپنے ارادۂ غلط سے باز آجاتا۔ اس طرح آپ قریب و بعید تمام مریدوں سے باخبر رہتے اور ہر ایک کی اصلاح حال کا خیال فرماتے۔

روشن ضمیری

اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کے قلب کو آئینہ کی طرح منور و روشن کر دیا تھا کہ ملاقاتیوں کے دلوں کے خطرات سے بھی واقف ہوتے اور ان کے احوال کے مطابق اطلاع فرما کر ان کی اصلاح حال فرماتے۔ مخفی سوالات کے مطابق ان کے مقاصد پورا فرما کر اصلاح حال سے نوازتے۔ آپ کی حیات طیبہ سے ایسی بہت سی روایات وابستہ ہیں جن سے آپ کی روشن ضمیری کا بخوبی اندازہ اندازہ ہوتا ہے۔

خلفا

(۱) شاہ سراج الدین رشیدی جون پوری

آپ کا نام سراج الدین اور عرف محمد حسن تھا۔ قاضی باسط علی (جو حضرت امیر الدین قیام

الحق کے نواسے تھے) کے پوتے اور حکیم مولوی قاضی محمد ناصر کے بیٹے تھے۔ قصبہ نظام آباد اعظم گڑھ وطن تھا۔ غالباً ۱۲۹۱ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۳۰۷ھ سترہویں سال میں سجادہ نشین ہوئے۔ ۱۷رذی قعدہ ۱۳۱۴ھ کو جلد ہی اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔

(۲) شاہ عبد العلیم آسی غازی پوری

آپ خدا رسیدہ بزرگ، شیخ کامل اور معاصر علما میں ممتاز عالم وشاعر تھے۔ جملہ علوم وفنون پر آپ کو کمال دسترس حاصل تھا۔ جس نے جس فن کی حیثیت سے آپ کو جانچا اور پرکھا، اس میں آپ کو امام وپیشوا پایا اور اپنا ہادی ورہنما بنایا اور معاصرین میں ممتاز قرار دیا۔

ڈاکٹر ڈی این چترویدی کی تصنیف ''تصوف اور مشائخ خانقاہ رشیدیہ'' کے اجرا کے موقع پر جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے ہال میں استاذ گرامی، محدث کبیر علامہ ضیاء المصطفیٰ قادری مدظلہ نے فرمایا تھا کہ:

''حضرت آسی علیہ الرحمہ، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا سے ۲۲ رسال کے بڑے تھے اور بعض مسائل کی تصدیق کے لیے آپ کے پاس تشریف لاتے۔''

ایک بار آپ کے پاس امام احمد رضا کا فتویٰ آیا تو آپ نے بغیر پڑھے دستخط فرما دی۔ لوگوں نے عرض کیا کہ آپ بغیر مضمون پڑھے کسی کے فتویٰ کی تصدیق نہیں فرماتے ہیں مگر آج معمول کے خلاف تو آپ نے فرمایا مولوی احمد رضا کی تحقیق پر مجھے اعتماد ہے، صرف تصدیق چاہیے۔''

ہمہ جہتی فنون وکمالات کے باوجود آپ کی زندگی شیخ طریقت کی حیثیت سے گزری اور مسند سجادگی پر فائز ہونے کے بعد مشائخ رشیدیہ کی ذمے داریاں نبھاتے ہوئے دار فانی سے کوچ کر گئے۔ آپ کا مرقد انور غازی پور محلہ نور الدین پورہ میں منبع فیض وبرکات ہے۔

(۳) شاہ شاہد حسین راج گیری

آپ کا وطن مبارک راج گیر ہے اور حضرت میر سید اعلیٰ راج گیری کی اولاد اور ان کی خانقاہ کے سجادہ نشین تھے۔ نہایت منکسر المزاج، فرشتہ صفت اور ذاکر ومشاغل تھے۔ آپ کو خاندانی نعمتوں کے علاوہ قطب الہند شاہ غلام معین الدین جون پوری سے بھی تعلیم وتلقین اور نعمتیں حاصل تھیں بلکہ آپ قطب الہند کے تمام خلفا میں اجل واکمل تھے۔ آپ کے پیشتر

مریدین صوبۂ بہار میں تھے۔

(۴) میر سید شاہ محمد سجاد جعفری بہاری

آپ اپنے جدامجد رشید الحق میر سید حسین علی جعفری سے مرید تھے اور اجازت وخلافت حسب اصول خاندانی حضرت قطب الہند سے تھی۔ آپ ذی علم، خوش اخلاق، متواضع، ذاکر ومشاغل اور پابند اوراد تھے۔ غالباً ۱۳۴۰ھ میں آپ کا وصال ہوا ہے۔

(۵) میر سید واجد علی شاہ سبز پوش گورکھپوری

آپ حضرت سید اصغر علی کے بیٹے حضرت میر سید قیام الدین گورکھپوری کی نسل سے ہیں۔ حضرت قطب الہند سے بیعت واجازت وخلافت تھی۔ خوش اوقات، پابند وظائف واوراد تھے۔ شب وروز وظائف ونوافل میں مشغول رہتے۔ رات میں مشکل سے دوتین گھنٹے آرام کرتے وہ بھی پلنگ پر نہیں۔ خلق خدا سے ملنے کا وقت دن میں صرف ۹/ بجے سے ۱۱/ بجے تک ہوتا۔ دولت ومروت کے باوجود درویشانہ شان تھی۔ مخفی طور پر خیرات وایثار کرتے، راحت رسانی جو فقیروں کا مشرب ہے، ہر وقت مدنظر رہتی، حتی کہ رات میں عبادت کے لیے بیدار ہوتے تو خدام وملازمین کے باوجود کسی کو زحمت نہ دیتے۔ خود اپنے ہاتھ سے وضو کے پانی کا انتظام کرتے۔ بیعت وہدایت کی اہلیت کے باوجود فقط کسر نفسی سے کسی کو مرید نہیں کیا۔

(۶) سید مردان شاہ تونسوی

آپ حضرت شاہ سلیمان تونسوی کے مرید تھے۔ اپنے شیخ کے بھیجے ہوئے حضرت قطب الہند کی خدمت بابرکت میں آئے اور چند ساعت کی تعلیم وتلقین میں آپ کا تکملہ ہوا اور بنگال کی طرف بھیجے گئے۔ (۷) سید شاہ خورشید علی سبز پوش گورکھپوری، آپ کے احوال معلوم نہ ہوسکے۔ آپ کی وفات ۱۳۴۰ھ میں ہوئی (۸) سید شاہ علی سادات پوری، (۹) حافظ شاہ تصدق حسین سادات پوری (۱۰) مولوی شاہ بندہ حسن پیچی چھپروی، [ملخص از سمات الاخیار]

وصال پاک

آپ کو اپنے دادا نور الحق حضرت شیخ حیدر بخش جون پوری کے آستانہ سے بڑا لگاؤ تھا۔ آپ بھمن برہ تشریف لے جاتے تو وہاں مہینوں قیام فرماتے۔ انہیں کی الفت کے نتیجے میں آپ

کو دائیں پہلو میں جگہ بھی ملی۔

آپ بہمن برہ خانقاہ حیدریہ میں تشریف فرما تھے کہ ۱۳۰۷ھ رمضان المبارک میں آپ پر فالج کا اثر ہوا۔ حکیم شاہ میر حسن سیوانی اور علامہ شاہ عبدالعلیم آسی دونوں کے باہم مشورہ سے تین مہینے تک علاج چلتا رہا مگر کبھی افاقہ اور کبھی گرانی ہو جاتی۔ مشیت ایزدی کچھ اور ہی تھی۔ طبیعت پھر نہ سنبھلی، روز بروز حالت نازک تر ہوتی گئی۔ آخر اوقات میں اکثر غشی طاری رہتی۔ ذی الحجہ کی سولہویں تاریخ کو ظہر کے بعد سے حالت متغیر ہونے لگی۔ تکلیف بڑھ گئی۔ حضرت حافظ تصدق حسین نے کہا کہ اس وقت بے چینی کچھ زیادہ ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ بے چینی نہیں بلکہ بے قراری زیادہ ہے۔ اس وقت اہل دل کے سمجھ میں آیا کہ آپ جمال جہاں آرا کی دیدار کے لیے مشتاق و بے قرار ہیں۔

وعدہ وصل چوں شود نزدیک
آتش شوق تیز تر گردد

حضرت آسی اس شوق کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

آج پھولے نہ سمائیں گے کفن میں آسی
ہے شب گور بھی اس گل سے ملاقات کی رات

مغرب کے وقت فرض اور سنت کے درمیان عاشق بے قرار کو وصال معشوق سے قرار ملا۔
انا للہ وانا الیہ راجعون.

جس مکان میں شب بھر جنازہ رکھا رہا۔ اس کی قسمت چمک اٹھی۔ ہر چہار طرف دیکھنے والوں کی نظر میں نور ہی نور تھا۔ صبح کو حضرت آسی نے غسل دلانے میں تیل وغیرہ کا اثر چھڑانے کے لیے خوب مبالغہ کیا اور کفنایا اور معتقدین نے بصد شوق واحترام اندرون درگاہ دادا کے پہلو میں دفن کیا۔

دوسرے دن ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ آپ فرماتے ہیں۔ اس غسل سے میں بہت خوش ہوا۔ وصال کے بعد آپ کا دہن مبارک کھلا رہ گیا تھا۔ اس کے بند کرنے کی بہت کوشش کی گئی مگر بند نہ ہو سکا۔ غسل کے وقت حضرت آسی نے روبرو ہو کر عرض کیا کہ حضرت! یہ دنیا ہے لوگ کیا کیا خیال کریں گے۔ آپ منہ بند کر لیجئے، فوراً بند ہو گیا۔

☆☆☆

سلسلۂ رشیدیہ جون پور اور حضرت آسی

مفتی شہاب الدین اشرفی ★

اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے لوگ کفر، جہالت اور گمراہی میں مبتلا تھے۔ آسمانی کتابوں کو نازل ہوئے ایک طویل عرصہ گذر چکا تھا جس کے سبب یہود و نصاریٰ آسمانی کتابوں میں شدید اختلاف میں مبتلا ہو چکے تھے۔ ہر فرقہ و جماعت کے پاس ایک ہی کتاب کے جداگانہ مختلف نسخے موجود تھے۔ حق کے متلاشی کے لیے کوئی رہنمائی کرنے والا نہ تھا، ہر طرف حسرت و مایوسی کی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ ایمان کے آثار مٹ چکے تھے، اس کے انوار بجھ چکے تھے، اس کے ارکان منعدم ہو چکے تھے۔ ایسے عالم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا اور دین حق کو تمام ادیان باطلہ پر غالب فرما دیا۔ یہ دین حق شریعت، طریقت اور حقیقت سب کو جامع ہے۔ شریعت وہ ہے جو مجتہدین کے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اقوال وافعال سے ظاہر ہوئی اور طریقت وہ ہے جو سالکین کے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اخلاق واحوال سے ظاہر ہوئی اور حقیقت وہ ہے جو اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے معاملات میں مکاشفہ سے واصلین کے لیے ظاہر ہوئی اور ان

★ شیخ الحدیث وصدر شعبۂ افتا، جامع اشرف درگاہ کچھوچھہ شریف ضلع امبیڈکر نگر یوپی

کے دل میں اس کا انجلا ہوا۔ شریعت محمدی کے چند فقہا ہیں اور ان کی کتابیں شریعت میں ترتیب دی ہوئی ہیں، طریقت کے چند فضلا ہیں اور ان کی کتابیں ان میں تصنیف کی ہوئی ہیں اور حقیقت کے چند علما ہیں ان کی کتابیں اس کی طرف مشیر ہیں۔ طریقت وحقیقت کے لیے علم شریعت لازم ہے اور علم شریعت طریقت کے بغیر نافع نہیں، جیسا کہ خواجہ حسن بصری کا قول ہے:

"العلم علمان فعلم فی القلب فذالک العلم النافع وعلم علی اللسان وذالک حجة الله عزوجل علی بنی آدم" رواه الدارمی

[مشکوۃ شریف]

یعنی علم دو طرح کا ہے، ایک علم وہ ہے جو دل میں ہے۔ پس یہ نفع دینے والا علم ہے اور ایک علم زبان پر پس یہ ابن آدم کے خلاف اللہ تعالی کی حجت ہے۔

اس حدیث کو امام دارمی نے روایت کیا، ملا علی قاری نے مرقاۃ المفاتیح میں خواجہ حسن بصری کی مذکورہ عبارت کے تحت لکھا ہے:

"قد یحمل الاول علی علم الباطن والثانی علی علم الظاهر لکن فیه انه لا یتحقق شیء من علم الباطن الا بعد التحقق باصلاح الظاهر کما ان علم الظاهر لایتم الا باصلاح الباطن ولذاقال الامام مالک من تفقه ولم یتصوف فقد تفسق ومن تصوف ولم یتفقه فقد تزندق ومن جمع بینهما فقد تحقق وقال ابو طالب المکی هما علمان اصلیان لا یستغنی احدهما عن الآخر بمنزلة الاسلام والایمان مرتبط کل منهما بالآخر کالجسم والقلب لاینفک احد عن صاحبه."

ترجمہ: بعض لوگ پہلے کو علم باطن پر اور دوسرے کو علم ظاہر پر محمول کرتے ہیں؛ لیکن علم باطن ظاہر کے درست ہونے کے بعد ہی پایا جاتا ہے جیسا کہ علم ظاہر، باطن کے درست ہوئے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر امام مالک نے فرمایا کہ "جس نے علم فقہ سیکھا اور علم تصوف حاصل نہیں کیا، وہ فاسق ہو گیا اور جس نے علم تصوف سیکھا اور علم فقہ حاصل نہیں کیا، وہ بے دین ہو گیا جس نے دونوں کو حاصل کیا، وہ حقیقت تک پہنچا"، اور ابو طالب مکی کا قول ہے "علم ظاہر اور علم باطن دونوں

اصلی علم ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتا جیسا کہ اسلام اور ایمان میں سے ہر ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے اور جیسا کہ جسم اور دل میں سے کوئی دوسرے سے الگ نہیں ہوتا ہے۔''

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ موجودہ دور جس میں مذہبی اور اخلاقی قدروں سے بغاوت کی تحریک جاری ہے آج بھی اس پر آشوب دور میں چند ایسی خانقاہیں موجود ہیں جو روحانیت کے متلاشی کے لیے منزل مقصود بنی ہوئی ہیں۔ طالبان ارادت مختلف راہوں کی سیر کرتے ہوئے ان خانقاہوں میں پہنچتے ہیں۔ فکر ونظر کی اصلاح، قلب وذہن کی صفائی، روح کی پاکیزگی اور اسرار ورموز کی معرفت ان ہی خانقاہوں سے حاصل کرتے ہیں۔

اس الحاد و بے دینی کے دور میں شریعت وطریقت کی پاسداری کرنے والی خانقاہوں میں خانقاہ عالیہ رشیدیہ جون پور کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس خانقاہ میں متعدد سلاسل: چشتیہ مصطفائیہ، چشتیہ احمدیہ، چشتیہ طیبیہ، چشتیہ اشرفیہ، قادریہ مصطفائیہ، قادریہ شمسیہ، قادریہ طیبیہ، سہروردیہ، فردوسیہ، مداریہ، جنیدیہ، اور زاہدیہ آج تک جاری ہیں۔ کیوں کہ ہند وپاک میں ایک سے زیادہ سلسلۂ طریقت سے منسلک ہونے کا رواج رہا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ وہ بیعت لیتے وقت چاروں سلاسل طریقت کے بزرگوں کے نام لیتے تھے تاکہ طالب کو تمام سلاسل کے بزرگوں کا فیض حاصل ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ مختلف سلاسل سے منسلک لوگوں کے درمیان دوری باقی نہ رہی۔ خانقاہ عالیہ رشیدیہ جون پور کے سجادہ نشینان کا رجحان بھی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے طرز عمل کے مطابق نظر آتا ہے۔

اگر ایام ماضیہ میں سلسلۂ عالیہ رشیدیہ کی تاریخ معلوم کرنا چاہیں تو سیکڑوں سے زائد صفحات پلٹنے پڑیں گے اور گیارہویں صدی ہجری کے واقعات آجائیں گے۔ جب شیخ مصطفیٰ جمال الحق کے گھر میں ولایت کا نور چمکا۔ اس علم ومعرفت کے نور سے بے شمار لوگوں کے قلوب روشن ومجلی ہوئے، ذہن وفکر کو پاکیزگی ملی، عبادت میں ذوق اور عمل میں خلوص پیدا ہوا۔ بغض وحسد وکینہ سے دل صاف ستھرا ہوا۔ اہل علم وعرفان کے فکر ونظر کو شادابی ملی، اہل طریقت کو منزل آشنا کیا گیا اور ریاضت ومجاہدہ کے ذریعے وصال کی روحانی لذتوں سے آشنا کیا گیا۔ لوگوں کو علم ومعرفت کا جام پلانے والی وہ شخصیت قطب الاقطاب، حضرت شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

سلسلۂ رشیدیہ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس سلسلے کے تمام سجادگان اپنے وقت کے جید عالم اور درویش کامل رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سلسلہ میں سجادگی وراثت کے طور پر نہیں ملتی ہے بلکہ علمی لیاقت اور فقیرانہ مزاج کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سلسلہ کے اولوالعزم علما، مشائخ وصالحین سجادہ نشین کا انتخاب کرتے ہیں۔

سجادہ نشین کی تقرری کا مذکورہ ضابطہ مقرر کرنے کا ثمرہ یہ ظاہر ہوا کہ بانی سلسلہ شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری نے آج سے چار سو سال پہلے اللہ تعالیٰ و رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رضا کے مطابق دعوت و تبلیغ اور علم و عرفان کا جو نظام قائم کیا تھا، وہ آج بھی جاری ہے اور آپ کے خلفا اور سلسلے کے افراد اپنے اسلاف کے طریقے کے مطابق دعوت و تبلیغ اور رشد و ہدایت کا فریضہ انجام دینے میں مصروف ہیں۔ بانی سلسلہ نے جو دعوتی نظام برپا کیا تھا وہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ آج بھی جاری ہے۔ اس سلسلے کی مختلف خانقاہیں خدمت خلق میں آج بھی مصروف ہیں اور مخلوق خدا کے علمی و روحانی سیرابی کا سامان فراہم کر رہے ہیں۔ ان برگزیدہ ہستیوں میں سلسلۂ رشیدیہ کے آٹھویں سجادہ نشین قطب العارفین عمدۃ الواصلین، زبدۃ العاشقین حضرت مولانا شاہ محمد عبد العلیم آسی غازی پوری کی ذات مبارک نمایاں ہے۔

سلسلۂ رشیدیہ کے تمام مشائخ و سجادہ کے علمی و ادبی و دعوتی خدمات نے خلق کثیر کو فائدہ پہنچایا ہے؛ لیکن جن مشائخ کے علمی، ادبی اور دعوتی خدمات کو امتیازی حیثیت حاصل ہے، ان میں حضرت آسی غازی پوری نمایاں نظر آتے ہیں۔ آپ نے خانقاہ رشیدیہ اور اس کے تحت چلنے والی خانقاہوں کی تعمیر و ترقی، رفاہ عام، خدمت خلق، درس و تدریس، تصنیف و تالیف، ارشاد و ہدایت اور دعوت و تبلیغ کے سارے میدانوں میں اپنی امتیازی حیثیت کا احساس دلایا اور وہ کارہائے نمایاں انجام دیا جو آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ ایک طرف علمی و روحانی میدان میں لوگوں کی تربیت فرما کر عالم باعمل، صوفی باصفا افراد تیار کیے تو دوسری طرف صوفیانہ و عارفانہ شعر گوئی اور غزل گوئی کے ذریعے فکر و نظر کو شادابی اور روح کو بالیدگی بخشی۔ چناں چہ آپ نے سراج الصرف، فوائد صدیقیہ اور فوائد جوہر یہ تصنیف فرمائی جو آپ کی علمی کمالات کی بولتی ہوئی تصویریں ہیں۔ علم ظاہری کے ساتھ علم باطنی میں بھی آپ کمالات کے درجے تک پہنچے

ہوئے تھے۔ قادریت، چشتیت اور اشرفیت کے روحانی چشموں سے خود فیض یاب ہوئے اور دوسروں کو بھی فیض یاب فرمایا۔ سلسلہ رُشیدیہ جو اصلاً چشتی سلسلہ ہے اس کا اثر آپ پر غالب رہا۔ بلا مزامیر سماع سنتے تھے اس کی صورت یہ تھی کہ قاضی عبد البصیر معصوم پوری اور حافظ فرید الدین احمد غازی پوری آپ کی غزلیں شب کو سوتے وقت خوش الحانی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ ہاں منڈواڈیہہ کے عرس میں گاگر اٹھتے تھے جو باقاعدہ قوالی ہوتی تھی اس میں شریک ہوتے تھے۔ آپ کی طبیعت میں تحمل اور ضبط کا مادہ اتنا تھا کہ مجال نہ تھی کہ کسی حالت میں کوئی راز کھل جائے۔ وجد کی حالت میں صرف آنکھیں سرخ ہوتی تھیں۔ [سمات الاخیار]

حضرت آسی غازی پوری، سلسلۂ رشیدیہ کے ان مشائخ کبار میں سے ہیں جو اخلاق محمدی کے مجسم تصویر تھے۔ آپ کا ظاہر شریعت کے مطابق اور باطن مشکوۃ نبوت کی روشنی سے منور و مجلی تھا۔ غربا اور مساکین سے قلبی لگاؤ تھا، ان لوگوں کی امداد اور خبر گیری کو سب پر مقدم رکھتے تھے، کیوں کہ ایثار نفس آپ کی ذات میں رچا بسا تھا۔ بلند حوصلہ اور عالی ہمت کے باوجود عجز و انکسار کے مجسمہ نظر آتے تھے۔ چھوٹے بڑے، امیر و غریب، مرید و غیر مرید سب کے ساتھ یکساں طور پر محبت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اسی بنا پر ہر کس و ناکس آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کو ذریعۂ سعادت سمجھتا تھا، غرض کہ دعوت و تبلیغ اور علم و عرفان کا جو نظام بانی سلسلہ حضرت شیخ محمد رشید جون پوری نے قائم کیا تھا اس کو جاری و ساری رکھنے میں پوری زندگی مصروف رہے اور اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مخلوق خدا کو علمی و روحانی طور پر سیراب کرتے رہے۔

دعوت و تبلیغ کی راہ میں اگر کوئی رکاوٹیں یا مشکلات درپیش آئیں تو خندہ روئی اور استقامت و صبر و تحمل کے ساتھ اس کو دور کرنے کی سعیٔ بلیغ فرمائی۔ غرض کہ بزرگان دین خصوصاً سلسلۂ رشیدیہ کے اکابرین کے جادہ سے سرمو انحراف نہیں فرمایا، سلسلۂ رشیدیہ کے سجادہ نشینوں کی جو امتیازی شان تھی وہ آپ کی ذات میں کامل طور پر نمایاں تھی۔ [سمات الاخیار ملخصاً]

حضرت آسی غازی پوری، سلسلہ رُشیدیہ کے دیگر سجادہ نشینان کی طرح کشف و کرامت کے اظہار کو برا سمجھتے تھے جیسا کہ سمات الاخیار میں مذکور ہے ''آپ کتمان اسرار اور اخفائے واردات میں پیر کے قدم بقدم تھے کبھی کبھی آپ فرمایا بھی کرتے تھے کہ:

''حضرت قیام الحق کی ہدایت ہے کہ درویشی کو ایسا چھپاؤ جیسا کہ مستورات کرسف کو۔''

حضرت قیام الحق کا قول مذکور عارفین کے اس قول کی ترجمانی ہے کہ کرامات کا ظہور مردوں کے لیے اسی طرح عیب ہے جس طرح عورتوں کے لیے حیض کا آنا عیب ہے۔ اس کی تائید سلطان العارفین حضرت بایزید بسطامی کے اس قول سے ہوتی ہے:

الطریقۃ المحمدیہ میں ہے:

"قال لو نظر تم الی رجل اعطی الکرامات حتی تربع فی الھواء فلا تغتروا بہ حتی تنظروا کیف تجدونہ فیہ عند الامر والنھی وحفظ الحدود واداء الشریعۃ."

ترجمہ: حضرت بایزید بسطامی نے فرمایا: اگر کسی ایسے شخص کو دیکھو جس کو کرامتیں عطا کی گئی ہیں یہاں تک کہ وہ ہوا میں چارزانو بیٹھتا ہے تو تم اس سے دھوکے میں مت پڑنا یہاں تک کہ تم دیکھ لو کہ اس کو امر ونہی، حدود شرعیہ کی حفاظت اور احکام شرعیہ کی ادائیگی میں کیسا پاتے ہو۔

امام عبدالغنی نابلسی نے ''الطریقۃ المحمدیہ'' کی مذکورہ عبارت '' **فلا تغتروا بہ**'' کے تحت ''الحدیقۃ الندیۃ'' میں لکھا ہے:

"ای لا تستدلوا علی ولایتہ ورفع درجاتہ عند اللہ تعالی بما رأیتموہ من ذالک لاحتمال ان یکون مکرا من اللہ تعالی بہ من حیث لا یعلم ھو ولا تعلمون انتم ایضا واستدراجا لہ من اللہ تعالی کما قال اللہ تعالی سنستدرجھم من حیث لا یعلمون واستھزاء بہ من الحق تعالی کما قال اللہ تعالی یستھزئ بھم"

ترجمہ: یعنی کسی شخص کی کرامت (مثلاً پانی پر چلنا، مردہ کو زندہ کرنا، مسافات بعیدہ کو تھوڑی مدت میں طے کرنا وغیرہ) کے دیکھنے کو اس کی ولایت اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کے بلند مرتبہ ہونے کی دلیل مت سمجھو؟ کیوں کہ یہ اللہ تعالی کی جانب سے اس کے ساتھ ایسا مکر ہو سکتا ہے جس کو وہ شخص نہیں جانتا ہے اور نہ تم جانتے ہو اور یہ اللہ کی جانب سے استدراج ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کا قول ہے: '' **سنستدرجھم من حیث لا یعلمون** '' اور یہ اللہ تعالی کی جانب سے اس کا ایسا

استہزا کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''یستھزیٔ بھم''
الطریقۃ المحمدیہ اور الحدیقۃ الندیہ کی مذکورہ عبارت سے ان باباؤں کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے جو طرح طرح کے چمتکار دکھا کر بھولے بھالے عوام کو گمراہ کر رہے ہیں یہ لوگ شریعت محمدیہ کی کسی قسم کی پابندی نہیں کرتے ہیں بلکہ طریقت کا بہانہ بنا کر شریعت محمدیہ کا مذاق اڑاتے ہیں اور اس کو معمولی سمجھ کر اس پر عمل کرنا گوارہ نہیں کرتے ہیں۔ ایسے پیر اور بابا لوگ خود گمراہ ہیں اور دوسروں کو گمراہ کر رہے ہیں؛ لیکن عوام خلاف عادت امور کو دیکھ کر اس کی زیارت کو ٹوٹ پڑتی ہے۔ الطریقۃ المحمدیہ میں ایسے پیر اور صوفی اور بابا کی حقیقت کو واضح کیا گیا۔
الطریقۃ المحمدیہ کے مصنف لکھتے ہیں:

''جب ہمارے زمانے کے صوفی کہلانے والے بعض لوگوں کے ان امور کا انکار کیا جاتا ہے جو شریعت مطہرہ کے خلاف ہیں تو وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان امور کا حرام ہونا علم ظاہر میں ہے اور ہم علم باطن والے ہیں اور یہ علم باطن میں حلال ہے، تم لوگ احکام کو کتاب سے سیکھتے ہو اور ہم صاحب کتاب محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سیکھتے ہیں۔ جب ہم کو کسی مسئلہ میں اشکال پیدا ہوتا ہے تو ہم اس کو محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پوچھ لیتے ہیں اگر ہم کو تسلی ہو جاتی ہے تو ہم اس سے راضی ہو جاتے ہیں ورنہ بذات خود اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس سے احکام کو لیتے ہیں، ہم خلوت اور شیخ کی ہمت وتوجہ سے اللہ تعالیٰ تک پہنچ جاتے ہیں تو ہمارے لیے تمام علوم ظاہر ہو جاتے ہیں پھر ہم کو کتاب پڑھنے، مطالعہ کرنے اور استاذ سے سیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی ہے۔ نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنا علم ظاہر اور شریعت کو چھوڑ دینے سے میسر ہوتا ہے۔ اگر ہم باطل پر ہوتے تو ہم کو روشن حالت، بلند مرتبہ اور کرامت حاصل نہیں ہوتی جو انوار کا مشاہدہ کرنا اور انبیائے کبار کو دیکھنا ہے جب ہم سے کوئی مکروہ یا حرام فعل صادر ہوتا ہے تو ہم کو نیند کی حالت میں خواب کے ذریعے تنبیہ کر دی جاتی ہے پس ہم اس سے حلال وحرام کے درمیان امتیاز کر لیتے ہیں جس فعل کے بارے میں تم کہتے ہو حرام ہے ہم کو اس فعل سے خواب میں نہیں روکا گیا ہے پس ہم نے جان لیا کہ یہ ہمارے لیے حلال ہے۔

اس طرح کی توہم آمیز، باطل باتیں بے دینی اور گمراہی ہیں اس لیے کہ ان میں شریعت

مطہرہ کو حقیر جاننا، کتاب اللہ و سنت رسول کو ہلکا جاننا، ان پر اعتماد نہ کرنا اور ان میں غلطی اور بطلان کو جائز ٹھہرانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی پناہ۔ پس اس طرح کی باطل باتوں کے سننے والوں پر اس کے قائل کا ردو انکار کرنا اور تردد و شک و شبہ کے بغیر ان کی باتوں کے باطل ہونے کا یقین کرنا واجب ہے ورنہ وہ لوگ بھی ان لوگوں میں شمار ہوں گے پھر ان پر بے دین ہونے کا حکم لگایا جائے گا۔

الطریقۃ المحمدیہ کی مذکورہ عبارت سے ان باباؤں اور جاہل پیروں کا گمراہ اور بے دین ہونا ظاہر ہو جاتا ہے جو اپنے جاہل مریدوں کی مجلس میں شریعت مطہرہ کا مذاق اڑاتے ہیں اور کرامات کے نام پر طرح طرح کے چمتکار دکھا کر لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ ہندوستان کی ذمہ دار خانقاہوں کی طرح خانقاہ رشیدیہ جون پور کے سجادہ نشین کے لیے عالم ہونا شرط اولین ہے۔ اسی طرح خانقاہ سلسلۂ اشرفیہ حسنیہ کچھوچھہ شریف کا سجادہ نشین ہونے کے لیے عالم ہونا لازم ہے۔

شیخ المشائخ سید مختار اشرف اشرفی جیلانی [سجادہ نشین آستانہ عالیہ اشرفیہ سرکار کلاں] سے ایک شخص نے پوچھا کہ حضور لوگ کہتے ہیں کہ اس خانقاہ کا سجادہ نشین کو منصب سجادگی پر فائز ہونے سے پہلے ہی ولایت مل جاتی ہے تو سرکار کلاں نے فرمایا: مجھ سے پہلے تک تو یہی ہوتا آیا ہے۔

جب خانقاہ رشیدیہ جون پور کے سجادہ نشین کو سلسلہ کے اہل رائے علما و مریدین منتخب کرتے ہیں اور انتخاب کے وقت علم و عمل اور تقوی و پرہیز گاری کو ملحوظ رکھا جاتا ہے تو خانقاہ رشیدیہ کے سجادہ نشین بھی ولایت کے منصب پر فائز ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ جس شخص کو لوگ اچھا سمجھتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھا ہوتا ہے۔ پس حضرت آسی غازی پوری کا سلسلہ رُشیدیہ کا سجادہ نشین منتخب ہونا ہی ان کے علم و تقوی، پرہیز گاری اور اخلاق حسنہ کے کامل طور پر متصف ہونے کی روشن دلیل ہے۔

حضرت آسی غازی پوری کے دل میں سلسلۂ رشیدیہ کے دیگر بزرگوں کی طرح اللہ عزوجل اور رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبت ہر رگ و ریشہ میں رچی بسی تھی، یہ محبت اپنے کمال کے درجے کو پہنچ گئی تھی۔ چوں کہ محبت دل کی ایک کیفیت کا نام ہے جس پر حقیقتاً کوئی اطلاع نہیں پا سکتا ہے؛ لیکن محبت کی علامتیں ہوتی ہیں، محبت کی علامتیں حضرت آسی غازی پوری کے اقوال، حرکات و سکنات اور ان کے اشعار سے ظاہر ہوتی تھیں۔

حضرت ملا علی قاری نے حضرت یحییٰ بن معاذ رازی کے قول کو ''مرقاۃ المفاتیح'' میں نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

'' ولتلک المحبة علامات من اظهرها ما اشار اليه يحيىٰ ابن معاذالرازی بقوله حقيقة المحبة ان لا يزيد بالعطاولا تنقص بالجفاولا يتم لهذا الا لصديق جذبته ازمة العناية حتی او قفته علی عتبة الولاية واحلته فی رياض الشهود المطلق فریٰ انه ان محبو به هو الحق وما سواه باطل محقق''

ترجمہ: اس محبت کی چند علامتیں ہیں ان علامتوں میں سب سے زیادہ ظاہر وہ علامت ہے جس کی طرف یحییٰ بن معاذ رازی نے اپنے اس قول سے اشارہ کیا ہے کہ محبت کی حقیقت عطا سے بڑھتی نہیں ہے اور نہ جفا سے کم ہوتی ہے کامل محبت اس دوست کی ہوتی ہے جس کو عنایت ازلی کے لگام نے کھینچ کر ولایت کی چوکھٹ پر کھڑا کر دیا اور اس کے لیے شہود مطلق کا دروازہ کھول دیا پھر اس نے دیکھا کہ اس کا محبوب ہی حق ہے اور اس کے علاوہ سب باطل ہے۔ حضرت یحییٰ بن معاذ رازی نے محبت کی جو نمایاں علامتیں بیان کی ہیں وہ حضرت آسی غازی پوری میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ جس کا رنگ حضرت آسی کے ان اشعار میں نظر آتا ہے۔

فریب عالم صورت سے بچنا
نہیں کوئی کسی کا جز خدا دوست
جو تو نے دیا تری راہ میں سب کھو بیٹھے
ہاں اگر شکر نہیں تو شکایت بھی نہیں
کوئی دشمن ہو یا آسی مرا دوست
میں سب کا دوست کیا دشمن ہو کیا دوست

حضرت آسی غازی پوری کے کمال عشق کا مقام یہ تھا کہ وہ ہر گنہ گار کے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ادنیٰ محبت رکھنے کو بھی دنیا کی کامیابی اور آخرت کے عذاب سے نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ کسی گنہ گار مسلمان کا دل بھی اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی

محبت سے خالی نہیں ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عظمت وتقدس پر جان قربان کرنے کا معاملہ درپیش ہوتا ہے تو امت محمدیہ کا گنہ گار شخص بھی اپنی جان پر کھیل جاتا ہے۔گنہ گاروں کی بھی محبت آخرت میں ان کے نجات کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

حضرت ملاعلی قاری نے ''مرقاۃ المفاتیح''میں محبت رسول کے متعلق امام قرطبی کے قول کو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ہر وہ شخص جس کا اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ایمان درست ہے وہ اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اس محبت سے خالی نہیں ہوسکتا ہے جو دوسری تمام چیزوں پر آپ کی محبت کو ترجیح دینے والی ہے اگر چہ وہ شخص شہوت وخواہشات میں غرق ہے اور اکثر اوقات میں غفلت کے سبب حجاب میں ہے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ ہم ان میں سے اکثر لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ جب اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ذکر کیا جاتا ہے تو وہ آپ کے دیدار کا مشتاق ہو جاتا ہے اور آپ کے دیدار کو اپنی بیوی مال ،لڑکے اور والدین پر ترجیح دیتا ہے اور اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیتا ہے۔ ہلاکت کے خوف کے باوجود اس کا دل پوری طرح بغیر تردد کے مطمئن رہتا ہے۔خارج میں اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ بہت سے لوگ اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے روضۂ انور کی زیارت کرنے اور آپ کے آثار کے دیکھنے کو ان تمام چیزوں (بیوی، مال، لڑکے اور والدین) پر ترجیح دیتے ہیں جو مذکور ہوا۔کیوں کہ ان کے دل میں اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبت جاگزیں ہوچکی ہے اگر چہ ان کے دل پر لگاتار غفلت کا پردہ پڑا ہوتا ہے اور اکثر وہ نفس اور خواہشات میں مبتلا رہتے ہیں اور ان کے اوقات اکثر لہو ولعب میں گذرتے ہیں اور ان چیزوں سے انجان وبے خبر رہتے ہیں جو ان کے لیے نفع بخش ہیں۔اس کے باوجود اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اس قسم کی محبت بھی ان کے لیے باعث برکت ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ ان کے لیے ہر طرح کے خیر کی امید ہے۔

حضرت آسی غازی پوری نے گنہ گاروں کی اس محبت کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھا ہے:

حشر میں منہ پھیر کر کہنا کسی کا ہائے ہائے
آسی گستاخ کا ہر جرم نا بخشیدہ ہے

عجب حسرت سے آسی کہہ رہا تھا کل مدینے میں
شفاعت ہوگی پہلے حشر میں یا مصطفیٰ کس کی

ہے فخر جہاں آسی ان کی غلامی
اسی میں کمالات کی ہے تمامی
نہ جنت کی خواہش نہ دوزخ کا ڈر
رہے آپ کا جلوہ پیش نظر

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ حضرت آسی غازی پوری کو سلسلۂ رشیدیہ میں جو عارفانہ حیثیت حاصل ہے، اس کا اعتراف ہم عصر علما و صوفیہ نے بھی کیا ہے، ان کی علمی و ادبی شہ پارے اہل علم و دانش میں مقبول ہیں۔ ان کے تبحر علمی کا قصیدہ آج تک عوام میں پڑھا جاتا ہے۔ غرض کہ سلسلۂ رشیدیہ کے اکابر و سجادگان کی علمی، ادبی، دعوتی کارناموں کا تذکرہ حضرت آسی غازی پوری کے تذکرہ کے بغیر تام نہیں ہوتا۔

☆☆☆

باب چہارم

عہد و پس منظر

حضرت آسی کے عہد میں ملکی و مذہبی حالات

ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی

قدوۃ الاصفیا، زبدۃ الاتقیا حضرت علامہ شاہ محمد عبدالعلیم آسی سکندر پوری علیہ الرحمہ کا عہد ۱۸۳۲ء تا ۱۹۱۷ء برصغیر ہند کی تاریخ میں شکست و ریخت کا عہد ہے، جس کی ہر ایک دہائی اپنے دامن میں گوناگوں ملکی و سیاسی تبدیلیوں اور سماجی و مذہبی تحریکوں کے آثار و نقوش رکھتی ہے، اس دور انقلاب کی رفتار نے صدیوں کے سیاسی و تہذیبی اقدار کو پامال کر دیا۔

علامہ آسی نے مغلیہ دور کے زوال کی داستان اپنے بزرگوں سے سنی اور اس کے ایوان اقتدار کو زمین بوس ہوتے ہوئے ماتھے کی آنکھوں سے دیکھا، پھر فرنگی سامراج کے اقتدار کی عمارت مغلیہ حکومت کے کھنڈرات پر تعمیر ہوتے ہوئے اور برطانوی اقتدار کے استعمار اور ان کے پنجۂ استبداد کی گرفت کو ہندوستانیوں پر سخت ہوتے ہوئے دیکھا، ہر انگریزوں کے جبر و تشدد اور ان کی شہہ پر برادران وطن کی جانب سے اسلام اور پیغمبر اسلام پر ہونے والے دل خراش حملوں کو دیکھا، عیسائی مشنریوں کی اسلام کش سرگرمیوں، آریہ سماج کی اسلام دشمن کارروائیوں

★ سابق استاد جامعہ شمس العلوم، گھوسی، مئو

اور سوادِ اعظم سے مسلمان کو ہٹانے والے مسلم فرقوں کی چیرہ دستیوں کا صبر آزما مناظر ان کی نگاہوں کے سامنے رہے۔ ذیل میں انہیں اہم ملکی، سماجی اور مذہبی واقعات و حادثات کا اجمالی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مغلیہ حکومت کا زوال

سولہویں صدی عیسوی میں ظہیر الدین بابر جیسے اولوالعزم فاتح نے جس عظیم مغلیہ سلطنت کو ہندوستان میں قائم کیا اور شہنشاہ اکبر جیسے مدبر حکمراں نے اپنی سیاسی حکمت عملی سے اس کی بنیادوں کو وسیع اور مستحکم کیا تھا جو شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد میں اپنے اس انتہائی عروج پر پہنچ گئی، جس کی نظیر اس سے پہلے نہیں ملتی۔ اس دور میں تقریباً پورا ہندوستان مغل حکومت کے زیر نگیں آ گیا تھا، اسی دور میں اسلامی حکومت ہوئی، جیسی نہ اس سے پہلے کبھی قائم ہوئی تھی اور نہ بعد میں۔ چناں چہ غیر مسلم مورخین کی طرف سے شہنشاہ اورنگ زیب کو خصوصیت سے اپنی جارحانہ تنقید کا ہدف بنانے کی بنیادی اور اصل وجہ یہی ہے۔

یہ بات قابل افسوس ہے کہ مغل شہنشاہوں میں حضرت اورنگ زیب آخری طاقت ور حکمراں تھے، ان کے بعد جو بادشاہ بھی برسر اقتدار آئے، وہ سب کے سب کمزور تھے، نہ ان کی طرح قوی اور پرعزم تھے اور نہ ان میں اس قدر تدبر ہی تھا، جس کا لازمی نتیجہ سامنے آیا۔ مسلم حکومت روز بروز بلندی کے آخری نقطے سے پستی کی گہرائیوں کی جانب گرتی چلی گئی اور اس کا رقبہ رفتہ رفتہ سکڑتا چلا گیا، امرا جابجا اپنی خودمختاری کا اعلان کرنے لگے اور بعض طالع آزما ہندو اور سکھ امرا کو بھی فوجیں اکٹھا کر کے مرکزی حکومت کے خلاف بغاوت کے ذریعے اپنے لیے ہندوستان کے وسیع رقبے میں سے تھوڑے بہت حصے پر قبضہ کا موقع مل گیا اور بعض علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد ان پر حکومت بھی کرنے لگے۔ دوسری جانب دہلی کے مسلم حکمراں رفتہ رفتہ کمزور تر ہوتے چلے گئے اور ان کا اثر و رسوخ گھٹتا اور سمٹتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ان کی قوت اور ان کا اثر و نفوذ ایسا ختم ہوا کہ پھر واپس نہ ہو سکا۔

بعض مورخین شاہ جہاں کے آخری دورِ حکومت میں تخت و تاج کے لیے ان کے بیٹوں کی باہمی کشمکش کو اس زوال کا پیش خیمہ تصور کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس دور کے ناساز گار

حالات پر اورنگ زیب کی حکمت عملی نے قابو پا کر مغلیہ حکومت کی بلند و بالا عمارت کو گرنے سے بچالیا تھا۔ مگر ان کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد اس عظیم عمارت کی بنیادیں اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ سکیں، بقول جادوناتھ سرکار:

''مغل حکومت کا زوال اورنگ زیب کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا، لیکن اس نے حکمت عملی اور تدبیر سے کام لے کر نمایاں نہیں ہونے دیا اورنگ زیب کی وفات کے بعد دس سال کے عرصے میں تخت کی وراثت پر سات بار لڑائی ہوئی جس سے زوال کی رفتار تیز ہو گئی۔''

اورنگ زیب کے بعد دہلی کے تخت پر جو حکمراں متمکن ہوئے، وہ سیاسی سوجھ بوجھ سے بے بہرہ تھے، چناں چہ اورنگ زیب کی جانشینی کے سوال پر ہی خوں ریز جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں معظم شاہ کو حکومت ملی۔ جو بہادر شاہ کے نام سے تخت نشیں ہوا۔ اس کے بعد جہاں دار شاہ کے حصے میں تاج و تخت آیا، جب کہ حکومت کا اہل عظیم الشان تھا، جہاں دار شاہ طبعاً بہت عیاش اور ظالم تھا۔ اس نے اپنے خاندان کے تمام شہزادوں کو قتل کرادیا، اس کی عیاشیوں کا خاتمہ عظیم الشان کے بیٹے فرخ سیر کے ہاتھوں ہوا، مگر ظلم و ستم کا بازار فرخ سیر کے زمانے میں بھی گرم رہا، اس نے بعض مغل شہزادوں کو قتل کیا، بعض کو اندھا کیا، جس سے حکومت کی رہی سہی ساکھ بھی جاتی رہی، شرفا پر خوف و ہراس کے بادل منڈلانے لگے، فرخ سیر کو قدرت نے اس طرح سزا دی کہ بارہہ کے سیدوں نے پہلے تو اسے اندھا کیا پھر ۱۱۳۰ھ میں اس کو قتل کر دیا۔ یہ ایسا وقت تھا کہ دہلی کے تخت کا کوئی معتبر وارث نہیں دکھائی دیتا تھا، حکومت کے جس اندرونی انتشار پر اورنگ زیب کی بارعب شخصیت نے پردہ ڈال رکھا تھا، اب کھل کر سامنے آ گیا۔ ایسے میں مغربی قوتوں نے سر اٹھایا، شاہی تخت سیدوں کے ہاتھ کا کھلونا بن گیا، حرم سرا میں دادِ عیش پانے والے شہزادے تخت نشین ہوئے۔ سب سے پہلے رفیع الدرجات کو تخت پر بٹھایا گیا، اس کے بعد رفیع الدولہ پھر روشن اختر تخت نشین ہوا، جسے ''محمد شاہ رنگیلا'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ محمد شاہ رنگیلا کو مغلوں کے انحطاط کا نمائندہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اس کی عیاشیاں مشہور زمانہ تھیں، حقیقتاً وہ سلطنت ہند کی باگ ڈور سنبھالنے کے لائق نہیں تھا، ملک کی تباہ حالی سے بے خبر اپنی عیاشیوں میں کھویا رہتا تھا۔

حکومت کی اس کمزوری سے مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں سبھی نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی

اور معاشرہ کی اجتماعیت کے لیے خطرہ بنتے گئے، یہاں تک کہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ حملہ آور ہوا اور اس کی ظالمانہ لوٹ کھسوٹ تاریخ ہند کا ایک خونی باب بن گئی۔ یہاں کی دولت سمیٹنا اس کا مقصد تھا، چلتے چلتے تختِ طاؤس کے ساتھ کروڑوں روپے کے زیورات بھی لے گیا، خزانہ خالی ہو گیا، پھر بھی ''رنگیلا شاہ'' کا رنگ نہیں بدلا، ابتری بڑھتی گئی، ۱۷۴۱ء میں احمد شاہ ابدالی کی نگاہِ قہر ہندوستان کی طرف اٹھی اور پانچ چھ سال تک دہلی کے اجاڑنے میں اس کی ہوس کارفرما رہی، نادر شاہ اور احمد شاہ کے حملوں نے دہلی کی شان و شوکت کو بالکل مٹی میں ملا دیا۔ چناں چہ ہندوستان کے اس خلفشار کے نتیجے میں روہیلوں، سکھوں، مرہٹوں کے ظلم و ستم عام ہو گئے، نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی دہلی کو ویران کر ہی چکے تھے۔ سکھوں اور مرہٹوں کی خانہ جنگیوں نے دہلی کی رہی سہی آبرو بھی خاک میں ملا دی۔ مرہٹوں کی درندگی اور وحشیانہ روش عروج پر تھی، احمد شاہ کو عماد الملک کے اشارے پر اندھا کیا گیا، شاہ عالم کی آنکھیں غلام قادر روہیلہ کی چیرہ دستیوں کے ہاتھوں چھن گئیں، ملک انقلابی آندھیوں کی زد میں تھا، مرکز کی سلطنت ''از دلی تا پالم'' محدود تھی، بہت سے صوبے خود مختار بن گئے، دکن، اودھ، اور بنگال کے صوبہ دار بادشاہ بن بیٹھے، پنجاب سکھوں کے قبضہ میں آ گیا۔ باقی ملک مرہٹوں اور کمپنی کے اربابِ حل و عقد میں بٹ گیا۔ شاہانِ مغلیہ اندرونی انتشار و خلفشار کی وجہ سے اس لائق نہ تھے کہ بیرونی حملوں کا مقابلہ کر سکیں، کمپنی کے اہلِ اقتدار نے حکومت کی اس کمزوری سے پورا فائدہ اٹھایا، اور کمپنی ایک ایسی قوت بن گئی جو ایک طرف خود کو مضبوط کرتی رہی، دوسری طرف ہندوستان کی سیاسی اتار چڑھاؤ کا سنجیدگی سے جائزہ لیتی رہی۔ دکن میں فرانسیسیوں کے زوال اور انگریزوں کے اقتدار کے بعد انگریزوں کی ملک گیر ہوس نے سازشوں کا جال بچھا کر ہندوستانیوں پر اپنی گرفت مضبوط کرنے لگی تو غیرت مند مسلمان اس کوشش میں گئے کہ کسی طور پر اس سرطان کو ختم کر دیا جائے جو ملک کی رگ و پے میں سرایت کر رہا ہے۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ کے محبِ وطن صوبہ دار علی سردار خان کو خیال پیدا ہوا کہ وہ ہندوستان سے انگریزوں کا خاتمہ کر دے۔ چناں چہ اس نے اپنی موت ۱۷۵۶ء سے پہلے اپنے جانشیں سراج الدولہ کو وصیت کرتے ہوئے کہا:

''مغربی قوموں کی اس طاقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا جو انہیں ہندوستان میں حاصل ہو چکی

ہے۔ اگر عمر میری کا پیمانہ لبریز نہ ہو چکا ہوتا اس خطرہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتا۔ اب اس کام کی تکمیل تمہارے ذمے ہے۔ میرے سراج، دکن میں ان کی سیاسی سرگرمیوں سے سبق حاصل کرو، ذاتی جنگوں میں الجھا کر انہوں نے مغل اعظم کے رعایا کے اموال واملاک پر قبضہ کر لیا ہے" [انگریزوں کا شرمناک دور حکومت، ص: ۴۸]

سراج الدولہ نے اقتدار سنبھالنے کے بعد محسوس کر لیا کہ انگریز دکن کے بعد بنگال و بہار اور اڑیسہ کو اپنا لقمۂ تر بنانا چاہتے ہیں ادھر انگریزوں نے سراج الدولہ کی حکومت کا خاتمہ کرنے کے لیے سازشوں کا جال بچھانا شروع کر دیا۔ اس کے ارکان سلطنت کو غداری پر آمادہ کیا۔ چناں چہ ۱۸۵۶ء میں معرکہ میں انگریز پسپا ہو گئے؛ لیکن سراج الدولہ کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ انگریزوں نے اس کے امرا اور فوجی سربراہوں کی ایک جماعت کو توڑ دیا ہے۔ شکست کے باوجود انگریز سازشی عمل میں منہمک رہے اور سراج الدولہ کے سپہ سالار میر جعفر کو نوابی کا لالچ دے کر عین موقع جنگ پر غداری کے لیے آمادہ کر لیا۔ چناں چہ جون ۱۸۵۷ء میں فوج لے کر مرشد آباد کی طرف آگے بڑھا۔ پلاسی کے میدان میں پہنچ کر میر جعفر اور اس کے ہمنواؤں نے نواب کا ساتھ چھوڑ دیا۔ محبّ وطن سراج الدولہ مٹھی بھر فوج سپاہیوں کے ساتھ انگریزوں سے نبرد آزما ہوا اور شکست کا سامنا کرنا پڑا، انگریزوں نے اسے گرفتار کر کے قتل کر ڈالا۔ بنگال پر انگریزوں کے تسلط کے بعد ان کا اثر ونفوذ بنگال میں پورے طور پر قائم ہو گیا اور انگریز مالا مال ہو گئے۔ اور اسی جنگ سے انہوں نے وہ گر بھی حاصل کر لیا جس کی مدد سے پورے ملک میں ان کا قبضہ ہو سکے۔ اس فتح نے انگریزوں کے حوصلے بڑھا دیے، وہ اپنی اقتصادی اور فوجی طاقت بڑھانے کے ساتھ ساتھ ہندوستان حکمرانوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے اور سازشوں کا جال بچھانے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ نظام دکن اور مرہٹوں سے صلح کے بعد انگریزوں نے پسیور کو اپنا ہدف بنایا۔ چناں چہ جنوبی ہند میں مسلمان حیدر علی انگریزوں کے اقتدار کو ختم کرنے کے لیے ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۱ء میں میدان میں اترے، فرانسیسیوں اور انگریزوں کے درمیان جو عداوت ورقابت تھی، انہوں نے اس سے بھی فائدہ اٹھانا چاہا، سلطان حیدر علی کے بعد ان کے صاحبزادے سلطان ٹیپو سر برآرائے تخت ہوئے، اور انہوں نے اپنے والد کے منصوبہ کو پورا

کرنے کی ذمے داری قبول کی، چناں چہ سلطان اور انگریزوں کے درمیان متعدد جنگیں ہوئیں، ایسی کہ انگریزوں کا چراغ بجھ ہی چلا تھا، اور جنوبی ہندوستان مسلمان کے ہاتھوں انگریزوں سے گلوخلاصی حاصل کرنے والا ہی تھا۔ مگر یہاں بھی بعض امرا کی غداریاں آڑے آئیں، اس کے علاوہ بعض دوسرے صوبوں کے ان امرا کی کمزوری بھی اس سلسلہ میں معاون ثابت ہوئی، جنہیں انگریزوں نے اپنا طرفدار اور بہی خواہ بنالیا تھا، اس لیے سلطان ٹیپو کو شکست سے دوچار ہونا پڑا، اور میدان کارزار ہی میں انہوں نے جام شہادت نوش فرمایا، انگریزوں نے اطمینان کا سانس لیا، اور انہیں اپنے ہندوستانی دشمنوں میں سب سے زیادہ طاقتور دشمن کی جانب سے اطمینان حاصل ہوگیا، جوان کی آرزوں اور خواہشات کا جنازہ نکالنے والا ہی تھا، اس کے بعد انگریز نے ان خطوط پر کام کرنا شروع کردیا جس کا منصوبہ پہلے سے مرتب کرلیا گیا تھا، فضا صاف ہوچکی تھی اور من مانی کرنے کے مواقع پوری طرح ہاتھ آگئے تو باقاعدگی انہوں نے ملکی معاملات میں مداخلت شروع کردی۔ انہیں ہندوستان حاصل کرنے کے لیے کوئی بڑی جنگ نہیں لڑنا پڑی بلکہ نا اہل حاکموں کی کمزوریاں ان کے لیے وجہ کامرانی بن گئیں، انگریز کا انتظامی شعور و تدبر ہندوستانیوں کو محکومیت کے قریب لاتا رہا، اور ان کو انگریزوں کے حلقہ بگوش ہونے پر مجبور کرتا گیا، اس سلسلے میں سیزرینی کا یہ تجزیہ ملاحظہ کیجئے:

> ”ہندوستان کو انگلستان نے اپنی تلوار سے فتح نہیں کیا بلکہ خود ہندوستانیوں کی تلوار سے، رشوت، سازش اور حددرجہ کی دوزخی پالیسی پر عمل کرکے ایک جماعت کو دوسری سے لڑا کر انہوں نے یہ ملک حاصل کیا۔“ [جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ص:۳۴]

انگریزوں نے ہندوستانی امرا کو آپس میں ٹکرانا شروع کیا، اس غرض کے لیے اس نے بعض امرا کی فوجی اور مالی امداد بھی کی، تاکہ ان کی آڑ میں اپنا مقام اور رسوخ پیدا کرسکے، امرا کے ساتھ تعاون کا یہ معاملہ بدلتا رہتا تھا، اور کمپنی ہمدردیاں ایک حاکم سے دوسرے حاکم کی طرف منتقل ہوتی رہتی تھیں، رفتہ رفتہ ایسٹ انڈیا کمپنی صوبوں کے نظم ونسق میں بھی دخل اندازی کرنے لگی اور صوبوں پر اپنے غلبہ کو فروغ دینے لگی، اور پھر آہستہ آہستہ اس کا اثر ونفوذ بڑھ کر مرکز یعنی شہنشاہ تک پہنچ گیا۔ جس کی حکومت اب بڑی حد تک صرف لال قلعہ تک محدود ہوکر رہ گئی تھی

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء اور اس کے اثرات

انگریزوں کی سیاسی چال اور مکاری کے نتیجے میں پورا ملک غلام بن چکا تھا۔ برائے نام ریاستیں انگریزوں کے بنائے ہوئے خطوط پر حکمراں تھیں۔ اسی بنا پر حسرت پسندوں نے انگریزوں کے خلاف نفرت وحقارت کے جذبات مشتعل ہو رہے تھے۔ فوجی سپاہی خصوصیت کے ساتھ انگریزوں کی زیادتیوں سے تنگ آکر بغاوت پر آمادہ تھے۔ اس طرح پورا ملک غیض وغضب سے بھر گیا اور اس استعماری طاقت کی خباثت کھل کر سامنے آگئی جو مغرب سے آئی تھی، تاکہ وہ اس ملک کی تمام معنوی خوبیوں اور ترقیوں کے امکانات کو تہس نہس کردے۔ چناں چہ ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۷ء میں ملک کو اس بربادی سے نکالنے کے لیے عظیم جنگ آزادی لڑی گئی، جس کی قیادت مسلمان اور کچھ وہ ہندو کر رہے تھے، جنہیں انگریزوں کے ہاتھوں شدائد ومصائب سے دوچار ہونا پڑا تھا، لیکن اب بہت دیر ہوچکی تھی، انگریزوں کا اثر ونفوذ تقریباً پورے ملک پر چھا چکا تھا، اس لیے یہ کوشش طاقتور اور قوی دشمن کے مقابلے میں ناکام رہی، اس کوشش کی ناکامی کے برے اثرات بہت بڑی حد تک صرف مسلمانوں پر پڑے، انگریزوں نے ان کے ساتھ نہایت برا رویہ اپنایا، مسلم زعما کو ذلیل کیا گیا، انہیں جلاوطنی اور پھانسی جیسی شدید ترین اور بدترین سزائیں دی گئیں۔ اس کے بعد ملکہ وکٹوریہ نے ہندوستان کے سامراجی تخت وتاج سے الحاق کا اعلان کردیا اور مسلمانوں کے ساتھ خصوصی طور پر کینہ رکھنے والا دشمن پوری طرح برسراقتدار آگیا۔ ہندوستانی مسلمان یک وتنہا رہ گیا جو پچھلی حکومت کا مالک تھا، وہ مسلمانوں کے ساتھ وہی برتاؤ کرنے لگے، جو ان کی کینہ پرور فطرت وطبیعت کا خاصہ تھا۔ اس طرح ایک ایسے ملک پر جس کے چپہ چپہ پر اسلامی تہذیب وتمدن کی چھاپ لگی ہوئی تھی، انگریزوں نے قبضہ کرلیا تاکہ اسے اپنی تہذیب و ثقافت میں رنگ دیں۔ اور ہر اس نقش کو مٹادیں جو سابق اسلامی حکومت کی یادگار ہو اور اس طرح وہ اپنی تہذیب، اپنے اثر ونفوذ اور دائمی اقتدار کے لیے راہ ہموار کرلیں۔ لارڈ ایلن برڈ۔ گورنر جنرل ہندوستان ۱۸۶۳ء لکھتا ہے:

"اس عظیم اور بدیہی حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ صرف مسلمان طبعی اور فطری طور پر ہمارے دشمن ہیں ہمارا اصل ہدف یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کی خوشنودی حاصل کریں۔"

ہندوستان پر حکومت کرنے کی یہی وہ بنیادی حکمت عملی تھی، جسے انگریزوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں اپنایا تھا اور جب انہوں نے ۱۸۵۷ء میں انقلاب کی کوشش کو ناکام بنا دیا تو زیادہ شدت کے ساتھ اس پر کاربند ہو گئے۔ اپنی سیاسی حکمت کی نئے تحت مرتب کردہ اسکیم اور قوانین کو نافذ کرنا شروع کر دیا۔

اس سیاست کی آخری منزل مسلمانوں کو بے دست و پا کرنا تھی جو ان سے پہلے حکمراں تھے، ان کے وقار اور اہمیت کو ختم کرنا تھا، اور ہر اس چیز کا قلع قمع کرنا تھا جو ان کے ماضی کو واپس لانے کے سلسلے میں معاون بن سکتی تھی، چناں چہ انگریزوں نے اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر اس طریقہ کو اپنایا جو اس سلسلے میں کچھ بھی معاون ہو سکتا تھا۔

انگریزوں نے مسلمانوں کو اقتصادی حیثیت سے بھی کمزور کرنے کی کوشش کی اور انہیں مفلس بنا کر چھوڑا۔ ان پر قرضوں کا بوجھ لاد دیا۔ ان پر تمام چھوٹی بڑی ملازمتوں کے دروازے بند کر دیے گئے، جن میں سے اکثر پر انگریزوں سے پہلے فائز ہوا کرتے تھے، جو مسلمان تاجر پیشہ تھے، ان کے لیے طرح طرح کی مالی دشواریاں پیدا کی گئیں، ان باتوں کی وجہ سے زمین اپنی وسعت و کشادگی کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی۔

اسی کے ساتھ ساتھ انگریزوں نے مسلمانوں کو خصوصیت سے جہالت کا شکار بنایا۔ حالاں کہ یہی لوگ انگریزوں کے ہندوستان پر قابض ہونے سے پہلے دوسری تمام قوموں کے مقابلے میں علم و دانش کے لحاظ سے ممتاز اور ترقی یافتہ تھے۔ اس طرح مسلمان زندگی کے ہر شعبہ میں پس ماندگی کے شکار بنائے گئے۔

پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو

ہندوستان میں صدیوں کے میل ملاپ اور باہمی اتفاق کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک مخصوص قسم کا ربط ہو گیا تھا اور مذہبی منافرت کم ہو گئی تھی، مغل بادشاہ ہندوؤں کے لیے غیر ملکی نہیں رہ گئے تھے، ہندو ہوں یا مسلمان دونوں شاہی حکومت کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے، سیاسی انحطاط اور تمدنی بدحالی کے باوجود ملک کی سماجی زندگی، جذباتی اعتبار سے ایک اکائی بنی ہوئی تھیں، جس کو ہندوستانی تہذیب کا ارتقا کہنا بے جا نہ ہوگا۔ ہندوستانیوں میں زبان،

نسل اور طرز معاشرت کے اختلافات کے باوجود ایک ہی ریاست کے شہری ہونے کے احساس نے عام مذہبی رواداری و تہذیبی اتحاد اور یک جہتی کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔

ہندوستانی عوام کا مذہب و ملت سماج و معاشرت، رنگ و نسل کے اختلافات کے باوجود اتفاق، باہمی ربط و ارتباط کے رشتے میں مضبوطی کے ساتھ منسلک رہنا فرنگی اقتدار کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ تھا۔ وہ اس رشتۂ ارتباط کو کاٹ کر ہندوستانیوں کو منتشر کر دینے میں ہی اپنے اقتدار و حکومت کی مضبوطی خیال کرتے تھے، چناں چہ انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑانے کی بھرپور کوشش کی اور اپنی عیاری اور مکاری سے اس میدان میں کامیاب بھی رہے۔ انہوں نے ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف ورغلا کر ہندوستانیوں میں خانہ جنگی کا ماحول پیدا کر دیا۔

ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت مسلمانوں پر زمانہ غالب آچکا تھا اور وہ انگریزوں کے ظلم و تشدد کے ہاتھوں بدحال ہو رہے تھے، انگریزوں نے ان کے خلاف ہندوؤں کے جذبات کو تاریخ کی ان کتابوں کے ذریعے ابھارنا شروع کر دیا، جنہیں اسکولوں اور اکثریتی طبقہ کے لیے خاص طور پر تیار کیا گیا تھا، اور جنہیں مسلم دور حکومت کے مسلم حکام کو ہندو اکثریت کے مقابلے میں متعصب اور سنگ دل قصائی کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا، اس طرح انہوں نے پتوار کو گھما دیا۔ ہندوستانیوں میں منافرت کے جذبات بھڑکا کر اپنے وجود کی بقاو سا لمیت کے لیے انہوں نے جو اقدام کیے وہ پوشیدہ نہیں۔ سر جان میلکم لکھتا ہے:

''اس بڑے ملک (ہندوستان) میں ہماری حکومت کی بقا ان بڑی طاقتور جماعتوں کے درمیان اختلاف و انتشار پیدا کرنے اور پھر ہر جماعت کو متعدد ٹولیوں میں تقسیم کر دینے پر موقوف ہے۔'' [تاریخ ہند]

چناں چہ انہوں نے ہندوؤں کو سینے سے لگایا اور مسلمانوں کے خلاف ان کے جذبات کو مختلف ذرائع و وسائل سے اس وقت ابھارا جب کہ مسلمانوں پر وہ غالب آچکے تھے۔ اور مسلمانوں کو اپنی پوری طاقت سے دبا کر انہیں کمزوری اور ذلت کی آخری سرحدوں تک پہنچا چکے تھے۔ صرف اس خوف سے کہ کہیں وہ پھر نہ سر اٹھائیں اور اپنے چھینے ہوئے ملک کو واپس نہ لے لیں۔ اس لیے کہ یہی لوگ ہندوستان کے سابق حکمراں تھے۔ اس طرز عمل نے ہندوؤں کے

لیے اس کا موقع بہم پہنچایا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جس قسم کی بھی بدسلوکی کرنا چاہیں۔ اپنے ظالم و غاصب حکمراں کی اتباع کرتے ہوئے اسی کی زیرِ سرپرستی کریں، حالاں کہ اس وقت مسلمانوں نے ہندوؤں کے خلاف خود کو تمام عداوتوں سے بچا رکھا تھا۔ بہر حال ان ہی وجوہ و اسباب کی بنا پر دونوں قوموں کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے اور دوسری طرح اس صورت حال سے خوش ہو کر انگریز بغلیں بجانے لگے۔ گورنر پنجاب کی برطانوی کونسل کے ممبر مسٹر جان منیورڈ کا بیان ہے کہ: ''ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات عام طور پر برطانوی عہد حکومت میں شروع ہوئے۔''

یہ گھر کے بھیدی کی شہادت ہے جس کے بعد مزید کسی اور شہادت کی ضرورت نہیں رہتی، انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تفرقہ پیدا کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے اس کے ساتھ ساتھ خود مسلمانوں کو متعدد فرقوں اور جماعتوں میں تقسیم کر دینے کی کامیاب کوشش بھی کی جیسی کہ ان کی عادت اور روش رہی ہے۔

عیسائی مشنریاں

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کے بڑے حصے پر قابو پا چکی تھی، اور انگریزوں کا اقتدار مستحکم ہو چکا تھا، اسی وقت سے یہ پالیسی بن چکی تھی کہ اس ''سونے کی چڑیا'' کو اگر قبضہ میں رکھنا ہے تو اس کی شرط اولین یہ ہے کہ ہندوستان میں عیسائیت کو فروغ دیا جائے، اور ہندوستانیوں کو ترغیب و تحریص اور ضرورت پڑے تو طاقت و جبر سے عیسائی بنا دیا جائے۔ اور اسی نقطۂ نگاہ سے عملی اقدامات کا آغاز بھی ہو چکا تھا، لندن میں باقاعدہ ایک مرکز علمی صرف اس لیے قائم کیا گیا تھا کہ عیسائی مشنریوں کو اردو، فارسی اور عربی کی مکمل تعلیم دی جائے اور وہ مرکز برسوں سے ایسے ایسے پادریوں کی ایک فوج تیار کرنے میں مصروف تھا جو علوم اسلامی اور مسلمانوں کی مذہبی کتابوں سے پوری طرح واقف ہوں اور مسلمانوں کے مجمع میں فراٹے سے اردو میں تقریر کر سکیں۔

غدر ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے کچھ پہلے ان تربیت یافتہ پادریوں کی فوج آنا شروع ہو گئیں تھی اور انگریزی حکومت ان کو ہندوستان کے اہم اور مرکزی مقامات پر متعین کر چکی تھی اور ان کی

سرگرمیاں زور شور سے جاری تھیں، کیوں کہ ان کو یقین تھا کہ اگر مسلمانوں کی اکثریت کو عیسائی بنالیا گیا تو اس کی وجہ سے انگریزی سلطنت کے استحکام میں بہت بڑی مدد ملے گی اور ملک کے بت پرستوں اور دوسرے باشندوں کو عیسائی بنالینا بہت آسان ہو جائے گا۔ عیسائیوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف زہرافشانی کے لیے لٹریچر بھی تیار کیے۔

چناں چہ سر ولیم میور جو اعلیٰ درجے کا پادری اور مشنری تھا اسے اسی کام کے لیے ممالک متحدہ آگرہ اودھ کا گورنر بنایا گیا اور اس نے اپنی ملازمت کے دوران لائف آف محمد، کتاب خلافت، شہادتِ قرآنی بر کتب ربانی اور اسی طرز کی اور دوسری کتابیں لکھیں، اور اسلام کے خلاف پادریوں اور عیسائی منادوں کی ایک پوری فوج کھڑی کردی۔ اسی کے ساتھ یورپ کی ایک انجمن متحدہ مذہبی مجلس نے اسلام پر شدید حملہ کرنے کے لیے مناظر پادریوں کا ایک زبردست جتھہ تیار کر کے ہندوستان بھیج دیا جس کے سر خیل P.FANDAR پی فنڈر قرار پائے پادری لیفرائے، پادری مفسل اور دوسرے بڑے بڑے پادری جو عربی و فارسی میں کامل اور اردو زبان پر عبور رکھتے تھے پادری فنڈر کے معاون بنائے گئے۔ خود فنڈر بھی عربی اور فارسی میں کامل دستگاہ رکھتا تھا اور اردو زبان پر پوری طرح قادر تھا، پادری فنڈر نے ہندوستان آکر اسلام کے قلعہ پر پہلا گولہ اپنی کتاب ''میزان الحق'' کی شکل میں پھینکا اور پھر طریق الحیات، حل الاشکال، طلوع آفتاب صداقت اور دوسری کتابیں لکھ کر شائع کیں، خلاصہ یہ ہے کہ اس زمانے میں اسلام کے خلاف یورپ کی یہ متحدہ یورش تھی جو مذہب کے رنگ میں کی گئی اور جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور لندن پارلیمنٹ دونوں کو کامیابی کی پوری توقع تھی۔

چوں کہ سلطنت مغلیہ اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی اور اس میں کوئی دم نہیں تھا اس لیے پادریوں کی دریدہ دہنی حد سے متجاوز ہو چکی تھی۔ پادری فنڈر روزانہ دہلی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر عصر و مغرب کے دوران ناواقف عوام کے سامنے عیسائیت کے مناقب و فضائل پر تقریریں کرتا تھا اور اسلامی تعلیمات میں کیڑے نکالتا تھا۔ ایک طرف انگریزی حکومت کا رعب داب و ہیبت تھی، دوسری طرف پادریوں کی ایک طرفہ تقریریں تھیں اور کسی کو ان کے سامنے لب کھولنے کی ہمت نہ تھی، اس لیے ان کی تقریروں کا عوام پر کچھ نہ کچھ اثر بھی ہوتا تھا، کچھ لوگ

اسلام ترک کر کے عیسائیت قبول کر چکے تھے۔

مبلغین عیسائیت کا جواب دینے کی کسی میں ہمت نہیں تھی کیوں کہ ابھی ابھی مسلمانوں پر ۱۸۵۷ء کا واقعہ ایک قیامت بن کر نازل ہو چکا تھا۔ ہر مسلمان یہ سمجھتا تھا کہ پادریوں کی زبان میں حکومت بول رہی ہے اور یوں بھی ہر پادری کے ساتھ پولس کا ایک دستہ بھی رکھا جاتا تھا اور ہر ضلع کلکٹر کی ذمہ داری تھی کہ پادریوں کی ہر طرح مدد کی جائے اس لیے فضا میں ہر طرف ایک مہیب سناٹا چھپا ہوا تھا۔ اس ڈراونے سناٹے میں صرف پادریوں کی آواز اور زہریلی تقریریں ہی سنائی دیتی تھیں، اخبارات روزانہ عیسائی ہو جانے والے خاندانوں کی چیزیں شائع کر رہے تھے۔ عیسائیت کی اشاعت کے سلسلے میں سرگرمیوں کی کامیابی پر اظہار مسرت کرتے ہوئے گارسان دتاسی اپنے تیرہویں لیکچر میں جو اس نے دسمبر ۱۸۶۲ء کو دیا تھا، کہتا ہے:

"انگریزی مشن جو ہندوستان میں کام کر رہے ہیں انہیں خوب کامیابی ہو رہی ہے، ہر روز اینگلو انڈین کلب کے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۸۶۲ء میں بنگال، صوبہائے شمالی و مغربی صوبہ بمبئی اور صوبہ مدراس میں دیسی عیسائیوں کی تعداد ایک لاکھ اٹھارہ ہزار آٹھ سو ترانوے (۱۱۸۸۹۳) تھی۔ مشنریوں کی تعداد جو تبلیغی کام کر رہے تھے ۴۱۸ تھی اور کل ۸۹۰ کلیسا اور گرجا تھے۔ [خطبات گارسان دتاسی ج:۱، ص:۳۷۹]

گارسان دتاسی نے اپنے اس لیکچر میں جو اس نے ۷/دسمبر ۱۸۶۳ء کو دیا ہے، اس میں وہ مشنریوں کی کامیابی پر اظہار مسرت کرتے ہوئے کہتا ہے:

"ہندوستانیوں میں یورپین علوم کا جس قدر چرچا بڑھتا جاتا ہے اسی قدر وہ ہماری تہذیب ہمارے تمدن اور ہمارے مذہبی ماحول سے قریب ہوتے جاتے ہیں یہ مذہبی اصول مسیحیت ہماری تہذیب و تمدن کا ماخذ ہیں ہندوستان میں تبلیغ عیسائیت کو جو کامیابی حاصل ہو رہی ہے اس میں شبہ کی گنجائش نہیں اور اس سے ہر عیسائی کو خوش ہونا چاہیے۔" [خطبات گارسن دتاسی ج:۱، ص:۳۷۸]

آریہ سماج

آریہ سماج انیسویں صدی کے نصف آخر میں وجود پذیر ہوا۔ ہندو دھرم میں وقتاً فوقتاً ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے اپنے دھرم کی تعلیمات و روایات اور اعتقادات میں

تبدیلیوں کی دعوت دی، بعد میں یہی دعوت ہندو دھرم میں ایک نئے فرقہ کا اضافہ کر دیتی ہے۔

اسی طرح انیسویں صدی کے نصف آخر میں پنڈت دیانند سرسوتی پیدا ہوئے اور انہوں نے ہندو دھرم میں اصلاح کا پیغام پہنچایا۔ انہوں نے اپنے اصول اور اپنے نقطۂ نگاہ کی وضاحت کے لیے سنسکرت زبان میں ایک کتاب لکھی جس کا نام ''ستیارتھ پرکاش'' ہے۔ یہ فرقہ مورتی پوجا کے خلاف ہے اور ہندوؤں اور آریہ سماجیوں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا ہے۔

پنڈت دیانند سرسوتی نے اپنی مذہبی اصلاح کی جو مہم چلائی اس کا کسی طرح سے مسلمانوں کے عقیدہ و مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے تھا، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ''ستیارتھ پرکاش'' کا ایک مقصد اسلام پر جارحانہ تنقید بھی ہے۔ چناں چہ کتاب کا ایک طویل باب اسلام اور پیغمبر اسلام پر سخت جارحانہ تنقید پر مشتمل ہے اور خود پنڈت جی نے زندگی کے اخیر لمحہ تک اسلام اور مسلمانوں کے خلاف محاذ آرائی کی اور ایک عرصہ تک علمائے اسلام کی مدافعت کے سلسلے میں اپنی توانائیاں صرف کرنی پڑیں۔

پنڈت جی کی تحریک اصلاح اور اس دھرم کے پرچار کا زمانہ وہ ہے کہ جب ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کو پوری طاقت سے کچل دینے کی مہم شروع کر رکھی تھی اور وہ اپنی مہم اس منزل تک لے جانا چاہتے تھے کہ مسلمان ہر طرف سے مجبور و مقہور ہو کر احساس کمتری میں مبتلا ہو جائے اور اس کی غیرت و خودداری کو فنا کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

اسی زمانے میں شری دیانند سرسوتی نے آریہ سماج کی بنیاد ڈالی اور ہندوؤں میں ایک مصلح کی حیثیت اختیار کرلی۔ انہوں نے ''ستیارتھ پرکاش'' نامی کتاب لکھی اور اپنے کو ہندو دھرم کا مجدد ثابت کیا اور مورتی کھنڈن کو اپنا پروگرام قرار دیا اور وہ بہت جلد ہندوؤں کے ایک بڑے طبقہ کو متاثر کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ہر قابل ذکر شہر میں اس فرقہ کی تنظیم ''آریہ سماج'' کے نام سے قائم ہو گئی۔ یہ مرکز شری دیانند سرسوتی کے خیالات و عقائد کے پرچار میں مصروف ہو گئے۔ ''ستیارتھ پرکاش'' کے چودھویں باب میں انہوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف زہر اُگلا ہے۔ وہ اس کتاب کا سب سے اہم حصہ ہے اور اسی کی بنیاد پر آریہ سماج کی توپوں کا رخ اسلام اور مسلمانوں کی طرف ہو گیا۔ وہ ہر جگہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تقریر کرتے اور

مناظرہ کا چیلنج کرتے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات مقدس پر ناپاک الزامات عائد کرتے اور مسلمانوں کو مشتعل کرتے رہتے تھے۔ ان کی ہمت اس لیے بڑھی ہوئی تھی کہ حکومت کی پشت پناہی ان کو حاصل تھی، عیسائیوں اور پادریوں کا تعاون ان کو ملتا تھا۔

عیسائی مشنریوں کا سیلاب جس طرح پورے ملک میں مسلمانوں کے لیے عذابِ جان بنا ہوا تھا۔ اسی طرح ملک کے بہت سے حصوں میں آریہ سماجیوں کی ہرزہ سرائیاں بھی جاری تھیں، ملک کے بیشتر حصوں میں جو آریہ سماج کا وجود ہے یہ اسی زمانہ کی یادگار ہے۔ آریہ سماج کے مقررین قرآنی آیات کو مسلمانوں کے لب ولہجہ میں اپنی تقریروں میں پڑھتے، ترجمہ کرتے اور اس پر تنقیدیں کرتے اس کی سرگرمیاں بیسویں صدی کے شروع کی چوتھائی تک بہت زور وشور سے جاری رہیں۔ ان تمام تگ ودو اور ہنگامہ آرائیوں کے باوجود کسی کو وہ اسلام سے منحرف کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے؛ لیکن اتنا ضرور تھا کہ وہ دلوں میں شکوک وشبہات پیدا کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے تھے۔ سناتن دھرمی ہندو جو اس طرح کے ہنگاموں سے ہمیشہ دور رہے اب ان میں بھی نئی زندگی آئی اور ہر طرف سے اسلام دشمنی میں دونوں ایک محاذ پر تھے۔ منشی اندرمن مرادآبادی نے اسلام پر اعتراضات کرنے کے لیے کئی کتابیں لکھیں اور شائع کیں۔ آریہ سماج کی کوکھ سے شدھی سنگٹھن نے جنم لیا جس نے سادہ لوح مسلمانوں کو مرتد بنانے کی مہم شروع کی جس کی تباہ کاریاں راجپوتانہ کے دیہاتوں میں خصوصیت کے ساتھ عام ہوئیں اور ہزاروں مسلمان انتہا پسند آریوں کی زد میں آکر ایمان واسلام سے محروم ہو گئے۔

وہابیت

وہابی مکتب فکر کی بنیاد تقی الدین احمد بن تیمیہ حرانی ۶۶۱ھ/۱۲۶۳ء تا ۷۲۸ھ/۱۳۲۸ء نے رکھی، اس کی تعلیم دمشق میں ہوئی اور وہیں درس دینے لگا۔ دمشق ہی اس کے فکر وعمل کا میدان تھا جہاں بیٹھ کر سواد اعظم کے معتقدات کے خلاف اپنے خود ساختہ نظریات پیش کیے۔ جب اس کے باطل نظریات سامنے آئے تو علمائے حق نے اس کی گرفت اور سرکوبی کی چند صدیوں بعد سرزمین نجد میں پیدا ہونے والے شخص محمد بن عبدالوہاب نجدی ۱۱۱۱ھ/۱۶۹۹ء تا ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۲ء ایک علمی گھرانے میں آنکھ کھولی مگر اس کی طبیعت میں انحراف اور تمرد کے جراثیم ابتدا ہی سے پروان چڑھ رہے تھے۔

چناں چہ اس نے اپنے باپ دادا اور علمائے عرب کے مسلمہ عقائد کے خلاف گل افشانیوں کا آغاز کیا اور اس کی آزاد پسند طبیعت شہروں شہروں تجارت کی غرض سے پھرا کی۔ بصرہ میں اس کی ملاقات ایک برتانوی جاسوس ہمفرے سے ہوئی جو ممالک عرب میں مسلمانوں کے درمیان افتراق وانتشار پیدا کر کے انگریزی اقتدار کی بساط کے لیے زمین ہموار کرنے پر مامور تھا اسے ایسے عرب کی تلاش تھی جو اپنے ہم قوموں میں آزادیٔ رائے اور روشن خیالی کے نام پر مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کر دے، چناں چہ اس کی ملاقات بصرہ کے اندر محمد بن عبدالوہاب سے ہوئی اور اسے اپنے شیشے میں اتار کر انگریزوں کی تفرقہ انگیز پالیسی کا علم بردار بنا دیا۔ ہمفرے لکھتا ہے:

''وہ ایک آزاد خیال انسان تھا، اس کے نزدیک حنفی، شافعی، حنبلی اور مالکی مکاتب فکر میں سے کسی مکتب فکر کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ وہ کہتا تھا کہ خدا نے جو کچھ قرآن میں فرمادیا ہے بس وہی ہمارے لیے کافی ہے.......... چند ملاقاتوں کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ برطانوی حکومت کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے یہ شخص بہت مناسب ہے۔''

ہمفرے نے ابن عبدالوہاب کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی کج روی کو مزید تقویت دینے کے لیے کہا کرتا تھا۔

''میں یہی چاہتا ہوں کہ اسلام میں جس انقلاب ''وہابیت'' کو رونما ہونا ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں سے انجام پذیر ہو، اس لیے کہ صرف تمہیں وہ شخص ہو جو اسلام کو زوال سے بچا سکتے ہو''

[ہمفرے کے اعترافات، ص: ۱۳۰]

محمد بن عبدالوہاب نے ہمفرے کی ترغیب پر ابن تیمیہ کی کتابوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور اس کے فکری ہیولیٰ کو صورت بخشی اور اس طرح وہابیت کا پیکر تیار ہوا جس کی تبلیغ واشاعت پورے زور و شور کے ساتھ جزیرہ نمائے عرب میں ہوئی۔ نواب صدیق حسن خان لکھتے ہیں:

''محمد بن عبدالوہاب نے شیخ ابوالعباس بن تیمیہ اور ان کے شاگرد ابن القیم الجوزیہ کی بعض تالیفات کا مطالعہ کیا اور صحیح طور پر سمجھے بغیر ان دونوں کی تقلید کی حالاں کہ یہ دونوں تقلید کو ناجائز سمجھتے ہیں [ابجد العلوم بحوالہ مولانا اسمٰعیل تقویۃ الایمان، ص: ۱۸]

محمد بن عبدالوہاب نے اثر و رسوخ حاصل کرنے کے بعد اپنے متبعین کے علاوہ تمام

مسلمانوں کو کافر بتایا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے زمانے سے لے کر چھ سو سال پہلے تک کہ تمام مسلمان کافر و مشرک تھے، علامہ صدقی عراقی لکھتے ہیں:

''جو شخص اس کے ہاتھ پر بیعت کرتا اس سے اس بات کو اقرار کرالیتا کہ تم کہو میری گذشتہ زندگی حالت کفر میں گذری اور کہو کہ میرے والدین کی موت کفر پر ہوئی اور اکابر علماے امت کے نام لے کر کہتا کہ گواہی دو وہ سب مشرک تھے اگر یہ شخص اس بات کی گواہی دیتا تو ٹھیک ورنہ اس کو قتل کرادیتا اور شیخ صاف صریح طور پر کہتا کہ چھ سو سال سے تمام امت کے تمام لوگ کافر گذرے جو شخص اس کی اتباع نہیں کرتا اس کو یہ کافر کہتا۔'' [الفجر الصادق ص:۱۸]

محمد بن عبدالوہاب نجدی کے افکار و خیالات باطلہ جو وہابیت کی اساس اور بنیاد ہیں اور جن کی وجہ سے امت میں افتراق و شقاق پیدا ہوا اور اسلامی وحدت پارہ پارہ ہوگئی اور اسلام کے اندر خوارج و معتزلہ اور شیعیت کے بعد وہابیت کے نام سے ایک اور نئے فرقے اور فتنے نے جنم لیا جو اس کی کتابوں میں آج بھی موجود ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں نے ابجد العلوم میں اس کی بارہ کتابوں کا ذکر کیا ہے جن میں خصوصیت کے ساتھ کتاب التوحید، رد الاشراک، رسالہ فی تحریم التقلید، کشف الشبہات مشہور ہیں جو آج تک اس کے باطل نظریات کی اشاعت کررہی ہیں۔

ہندوستان میں وہابی تحریک

مولوی اسمٰعیل دہلوی ۱۷۷۹ء تا ۱۸۳۱ء خانوادہ ولی اللہ کے فرد ہیں جس نے اپنے اسلاف کے علی الرغم محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تحریک وہابیت کو ہندوستان میں پھیلانے کا بیڑا اٹھایا اور انگریزوں کی شہ پر اسلامیان ہند میں افتراق و انتشار کا بیج بویا جس کے برے ثمرات آج تک شدت کے ساتھ پائے جاتے ہیں تمام اہل قلم محققین اس بات پر متفق ہیں کہ اسمٰعیل دہلوی کی تحریک نجد کی تحریک وہابیت سے ماخوذ ہے اور انہیں خطوط پر اسمٰعیل دہلوی اور ان کے متبعین کاربند ہیں۔

غیر مقلد عالم نواب وحید الزماں حیدرآبادی لکھتے ہیں:

''وہ شیخ عبدالوہاب ہیں جنہوں نیان امور (مکروہ حرام) کو شرک قرار دیا اور مولانا اسمٰعیل شہیر نے تقویۃ الایمان میں اکثر امور میں اس کی پیروی کی ہے۔'' [ہدایۃ المہدی، ص:۲۶]

شاہ ابوالحسن زید فاورقی دہلوی لکھتے ہیں:

''مجھ کو تقویۃ الایمان میں وہابیت کے اثرات نظر آئے لہٰذا میں نے مختصر طور پر محمد بن عبدالوہاب کے حالات کا مطالعہ کیا اور ان کے رسالہ ''ردالاشراک'' کا دقیق نظر سے مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ مولانا اسمٰعیل نے جو کچھ اس رسالہ میں لکھا ہے نجدی رسالہ ''ردالاشراک'' سے لیا ہے[مولانا اسمٰعیل دہلوی اور تقویۃ الایمان ص:۱۳-۱۴]

مولانا اسمٰعیل دہلوی ابن تیمیہ اور محمد بن عبدالوہاب نجدی کے جن نئے عقائد ونظریات کو ان کی کتابوں سے حاصل کر کے اپنی کتاب ''تقویۃ الایمان'' میں لکھا اور اپنے خاندانی بزرگوں کے عقائد ونظریات سے بغاوت کی جس کے ذریعے ہندوستان میں وہابیت برگ و بار لائی اور تقریباً نو سو سالہ ہندوستانی مسلمانوں کی متحدہ قوت پارہ پارہ ہوگئی اور انگریزی سامراج کو ہندوستان پر بے روک ٹوک حکومت کرنے کا سنہری موقع ہاتھ آ گیا یہ سب کچھ انگریزوں کی شہ پر ہوا۔ کیوں کہ ان کے مقاصد کی تکمیل کے لیے یہ کتاب بہت اہم تھی چناں چہ انہوں نے ''تقویۃ الایمان'' کا انگریزی ترجمہ منشی شہاست علی سے کرا کر ۱۸۲۵ء میں لندن سے شائع کیا اس کتاب کے نتائج واثرات کے بارے میں مولوی احمد رضا بجنوری لکھتے ہیں:

افسوس ہے کہ اس کتاب (تقویۃ الایمان) کی وجہ سے مسلمانانِ ہندو پاک جن کی تعداد ۲۰ کروڑ سے زیادہ ہے اور تقریباً ۹۰ فیصد حنفی المسلک ہیں دو گروہ میں بٹ گئے ہیں ایسے اختلافات کی نظیر دنیائے اسلام کے کسی خطے میں بھی ایک امام ایک مسلک کے ماننے والوں میں موجود نہیں ہے[انوار الباری جلد نمبر ۱۱، ص:۱۰۷]

تقویۃ الایمان طبع ہونے کے بعد مفت تقسیم کی گئی، اس کے سامنے آتے ہی دہلی میں آگ لگ گئی اور علمائے حق اس کے ردوابطال پر کمربستہ ہوئے اور اس کی گمراہی اور کفر کو واضح کیا۔

مسند الوقت علامہ فضل حق خیر آبادی نے لکھا ہے:

''اس (اسمٰعیل دہلوی) کا کلام بلاشبہ بارگاہ الٰہی کے مقربین کے سردار، انبیا، ملائکہ، اصفیا، مشائخ، اور اولیا کی تنقیص شان پر مستعمل ہے اور استخفاف پر دلالت کرتا ہے۔ اس بے ہودہ کلام کا قائل از روئے شریعت کافر اور بے دین ہے اور ہر گز مسلمان نہیں ہے اور شرعاً اس کا حکم قتل اور تکفیر ہے'' [تحقیق الفتویٰ، ص:۲۴۳]

اس فتویٰ کی تصدیق دہلی کے صف اول کے سترہ علمائے کرام نے کی جن میں حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کے دونوں صاحبزادے حضرت مولانا مخصوص اللہ صاحب اور حضرت مولانا محمد موسیٰ صاحب، حضرت مفتی صدرالدین صاحب اور حضرت مولانا شاہ احمد سعید مجددی صاحب نے اس کی تصدیق کی۔ سواد اعظم اہل سنت سے ہٹ کر برصغیر ہندوستان میں ہی وہ پہلی آواز تھی جسے محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تحریک وہابیت کی صدائے بازگشت کہنا چاہیے جس کا تعلق فکر ولی اللہ سے جوڑنے کی ناپاک و نامراد کوشش کی جاتی رہی ہے۔ جامع مسجد دہلی کے مناظرے میں شکست کے بعد کچھ دنوں خاموشی رہی پھر اسمٰعیل دہلوی نے اپنے مرشد سید احمد بریلوی کی قیادت میں سکھوں سے جہاد کا علم بلند کیا جب کہ پورے ہندوستان پر سفید نام انگریزوں کا پنجہ استبداد گڑ چکا تھا۔ مولوی اسمٰعیل سے پوچھا گیا کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کے لیے تقریر کیوں نہیں کرتے تو انہوں نے کہا:

''انگریزوں کے عہد میں مسلمانوں کو کچھ اذیت نہیں ہوتی اور چوں کہ ہم انگریزوں کی رعایا ہیں اس لیے ہم پر اپنے مذہب کی رو سے یہ بات فرض ہے کہ انگریزوں پر جہاد کرنے میں ہم بھی شریک نہ ہوں'' [مقالات سرسید ص:۱۴۲]

یہ توحید پرستوں کی تثلیث پرستوں کے ساتھ سانٹھ گانٹھ اپنے رعایا ہونے کا کس نیاز مندی سے ثبوت دیا جا رہا ہے ایسا کیوں نہ ہوتا کہ ہندوستان کی وہابیت انگریزوں ہی کا خود کاشت پودا ہے جس کی گواہی پروفیسر محمد ایوب قادری مشہور دیوبندی مورخ ان الفاظ میں دیتے ہیں۔

''تقسیم ہند تک مسلمانان ہند کا اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ فرقۂ وہابیت انگریز کا کاشت کردہ پودا ہے جس کی آبیاری اس نے نہایت ہی ہوشیاری سے کی اور اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔''

[مقدمۂ حیات سید احمد:۲۶]

قادیانیت

۱۸۳۵ء میں پنجاب میں ایک شخص پیدا ہوا جو مہدی موعود اور مسیح موعود بنتے بنتے نبوت کا مدعی ہو گیا۔ اس کے دعویٰ نبوت کے وقت ہندوستان پر انگریزوں کی حکمرانی تھی اور یہ انگریزی حکومت کا خود کاشت پودا تھا۔ اس لیے ہندوستان کی آب و ہوا اس کے پنپنے اور بڑھنے کے لیے

سازگار ثابت ہوئی۔ اس خود ساختہ نبی کا نام مرزا غلام احمد تھا جو قادیان ضلع گورداس پور میں پیدا ہوا اور ۱۸۷۵ء کے آس پاس اس نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ مرکز قادیان سے مرزا غلام احمد کی سوانح حیات شائع ہوئی ہے۔ سوانح نگاران ان کے دعویٰ مسیحیت کے سلسلے میں لکھا:

"جب آپ کی عمر چالیس سال کی ہوئی تو آپ کو الہام ہوا کہ تم ہی وہ مسیح اور مہدی ہو جس کے آنے کا مسیحیوں اور مسلمانوں سے وعدہ تھا جب یہ الہام ہوا تو آپ نے ایک مدت اس کو ظاہر پر محمول کیا۔ لیکن بار بار الہام ہونے کے بعد آپ نے مسیح و مہدی ہونے کا اعلان کیا۔"

مرکز قادیان کی شائع کردہ سوانح کے مطابق انہوں نے چالیس سال کی عمر میں مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا؛ لیکن ان کے اندر استقلال اور یکسانیت نہیں رہی بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کی زود اشتعال فطرت و مزاج کو پیش نظر رکھ کر بتدریج اپنے دعووں کی نوعیت بدلتے رہے۔ مہدی موعود کے پہلے دعویٰ کے بعد انہوں نے اپنی کتاب "اربعین" کے صفحہ نمبر ۳۴ ر پر لکھا کہ: "خدا وہ خدا ہے کہ جس نے اپنے رسول کو یعنی اس عاجز کو ہدایت اور دین حق اور تہذیب واخلاق کے ساتھ بھیجا۔"

یعنی اس کے بعد انہوں نے صراحتاً نبی و رسول ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ اپنے اوپر معاذ اللہ نزول وحی کی کیفیت یہ کذاب اس طرح بیان کرتا ہے کہ وحی آسمان سے دل پر ایسی گرتی ہے جیسے کہ آفتاب کی شعاع، میں روز دیکھتا ہوں جب مکالمہ مخاطبہ کا وقت آتا ہے تو اول دل پر ایک ربودگی طاری ہو جاتی ہے تب میں ایک تبدیل یافتہ کے مانند ہو جاتا ہوں اور میری حس اور میرا ادراک و ہوش گو بہ گفتن باقی ہوتے ہیں مگر اس وقت میں یوں پاتا ہوں کہ گویا ایک وجود شدید الطاقت نے میرے تمام وجود کو اپنی ہستی میں لے لیا ہے اور میں اس وقت محسوس کرتا ہوں کہ میری ہستی کی تمام رگیں اس کے ہاتھ ہیں اور جو کچھ میرا ہے اب وہ میرا نہیں بلکہ اس کا ہے جب یہ حالت ہو جاتی ہے تو سب سے پہلے خدا تعالیٰ دل کے ان خیالات کو میری نظر کے سامنے پیش کرتا ہے جن پر اپنے کلام کی شعاع ڈالنا اس کو منظور ہوتا ہے اور ایسا ہوتا ہے کہ جب ایک خیال دل کے سامنے آیا تو جھٹک اس پر ایک ٹکڑا احکام الٰہی کا شعاع کی طرح گرتا ہے اور بسا اوقات اس کے گرنے کے ساتھ ہی تمام بدن ہل جاتا ہے۔

مرزا صاحب بزعم خود مہدی سے نبی ہوئے الہام سے وحی تک پہنچے اور ان کے حلقہ بگوشوں

کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ تو انہوں نے اور بھی ہاتھ پاؤں نکالے، اب تک اپنے کو مسلمان بھی کہتے تھے اور مسلمانوں کے سواد اعظم کے عقائد پر قائم رہنے کا اعلان بھی کرتے تھے؛ لیکن جب نبی بن کر اپنی شریعت خاص کا اجرا کیا تو اپنے متبعین کے سوا سارے مسلمانوں کو خارج از ایمان ہونے کا اعلان کر دیا اور کہا کہ:

جو لوگ میری تکذیب کریں گے ان کو الحمد سے والناس تک پورا قرآن چھوڑنا پڑے گا پھر سوچو کیا میری تکذیب کوئی آسان امر ہے۔ یہ میں از خود نہیں کہتا، خدائے تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ حق یہی ہے کہ جو مجھ کو چھوڑے گا اور میری تکذیب کرے گا گو زبان سے نہ سہی مگر اپنے عمل سے اس نے سارے قرآن کی تکذیب کر دی اور خدا کو چھوڑ دیا، اس کی طرف میرے ایک الہام میں بھی اشارہ ہے۔ ''انت منی وانا منک'' بے شک میری تکذیب سے خدا کی تکذیب لازم آتی ہے۔ پھر میری تکذیب، میری تکذیب نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب ہے۔

چوں کہ مرزا غلام احمد مسلمان خاندان میں پیدا ہوا، مسلمانوں جیسا نام پایا اس لیے اس کے دعوائے نبوت کا عذاب امت مسلمہ کو بھگتنا پڑا۔ غیر مسلموں کو قادیانی بنانا تو اس کے بس کی بات نہیں تھی اس لیے اس نے مسلمان خاندانوں کے افراد کو مذہب حق سے منحرف کر کے ان کو مرتد بنانے کا کام شروع کر دیا اور بتدریج اس کی پھیلائی ہوئی گمراہی کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا اور پنجاب کے کئی شہروں میں اس کے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اور مرزا غلام احمد نے پہلے ہی مرحلے پر نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تھا اس لیے مسلمان حلقوں میں اس کی باتیں سنی جاتی تھیں۔ کیوں کہ وہ عیسائیوں اور آریوں سے مسلمان بن کر مناظرے کرتا رہا اور لوگ اس کو ایک پر جوش مسلمان عالم سمجھتے رہے اور اسلام کی ہمدردی میں لوگ اس کے ساتھ اس طرح جب اس کے گرد و پیش کچھ افراد جمع ہو گئے تو وہ اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہوا اور پورے طور پر پرپرزے نکالے اور اپنے عقائد کا اظہار کیا تب لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور معلوم ہوا کہ فریب کا جو جال بچھایا جا رہا تھا اس کی حقیقت یہ تھی کہ دعویٰ نبوت کے لیے زمین ہموار کی جا رہی تھی۔

علمائے اسلام نے اس کے ہر لحہ بدلتے ہوئے دعووں کا تجزیہ کیا اور فیصلہ کیا کہ مرزا غلام احمد کے متبعین کا شمار مسلمانوں کے ایک فرقہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ وہ غیر مسلموں کا ایک فرقہ ہے جس

کا اسلام کے مسلمہ اور بنیادی اصولوں سے کوئی تعلق نہیں بلکہ غیر مسلموں سے کہیں زیادہ یہ گروہ اسلام دشمن ہے۔ لیکن یہ فرقہ آہستہ آہستہ طاقت پکڑتا رہا اور تیرہویں صدی ہجری کے آخر میں شباب پر پہنچ گیا، سیرت وسوانح مرزا غلام احمد قادیانی کا مصنف لکھتا ہے کہ: "۱۸۹۱ء میں آپ نے دعویٰ کیا تھا ۱۸۹۷ء میں سات سال بعد کل ہندوستان میں آپ کی جماعت پانچ چھ سو زن ومرد تک پہنچ گئی اس کے بعد یک لخت لوگوں کو آپ کے دعویٰ کی طرف توجہ ہوئی اور جماعت کی ترقی کی رفتار بہت بڑھ گئی اور ۱۹۰۱ء سے تو اس کثرت سے لوگ سلسلہ میں دال ہونے شروع ہوئے کہ چند اس سال میں تمام ہندوستان میں آپ کی جماعت پھیل گئی حتی کہ ان کی تعداد کئی لاکھ تک پہنچ گئی۔

بیسویں صدی کے آغاز یعنی ۱۹۰۸ء میں اس کا انتقال ہوگیا اور اس کی جماعت اس وقت مضبوط بنیادوں پر قائم ہوچکی تھی اور اس کے مبلغین ہندوستان سے باہر قادیانیت کی تبلیغ کرنے تھے۔ وہ مرگیا اور اس کے ناپاک وجود سے یہ سرزمین تو پاک ہوئی لیکن اس کے شر نے اسلامی دنیا میں ایمان واسلام کی جو تباہی وبربادی پھیلائی وہ علیٰ حالہ قائم ہے اور قادیانیت جسد اسلام کا ایک رستا ہوا ناسور بن گئی ہے۔ آج یہ فرقہ دنیا کا مالدار ترین فرقہ ہے۔ اس کا نظام کارکردگی عیسائی مشنریوں جیسا ہے وہ پوری دنیا میں قادیانیت کے فروغ کے لیے اس نہج پر کام کرتے ہیں جس نہج پر ہندوستان میں عیسائی مشنریوں نے آج سے سوڈیڑھ سو سال پہلے کام شروع کیا تھا اور اس کے تھوڑے بہت آثار آج بھی ہندوستان کے مختلف گوشوں میں پائے جاتے ہیں۔

نیشنل کانگریس کا قیام

ایک طرف انگریز ہندوستان میں اپنے قدم مضبوط کرنے کے لیے جوڑ توڑ میں لگا ہوا تھا، دوسری جانب ہندوستان کے باشندے بھی غافل نہ تھے۔ خصوصیت کے ساتھ غیر مسلم باشندوں میں کافی بیداری پیدا ہوچکی تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے آپ کو جدید حالات کے سانچے میں ڈھال دیا تھا اور جدید علوم کے حصول میں بڑی سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا تھا اور ان کے لیے سہولتیں بھی تھی کیوں کہ انگریز ان سے بدظن نہ تھا بلکہ سیاسی اغراض کی خاطر تعلیم اور بیداری نے غیر مسلموں میں کافی سیاسی رجحان پیدا کردیا تھا، ان کی متعدد سیاسی انجمنیں بنگال، مہاراشٹر اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں قائم ہوچکی تھیں۔ لیکن ان انجمنوں کا

چوں کہ مشترکہ پروگرام نہ تھا، اس لیے ۱۸۸۵ء میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ ہندوستان میں ایک وسیع انجمن کی بنیاد ڈالی جائے۔ جس پر تمام چھوٹی سیاسی انجمنوں کو مدغم کر کے ایک پلیٹ فارم پر لایا جا سکے۔ چناں چہ ۱۸۸۵ء میں چند تعلیم یافتہ انگریزوں اور ہندوستانیوں نے مل کر انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھ دی۔ انڈین نیشنل کانگریس کا اصل بانی ایک ریٹائرڈ انگریز افسر مسٹر اے او ہیوم تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس کی ابتدا میں حالت یہ تھی کہ اس کے جلسوں میں یونین جیک لہرایا جاتا تھا اور اس کے ریزولیشنوں کے ذریعے انگریزوں کے ساتھ وفاداری کا اظہار کیا جاتا تھا اور یہ ہی واقعات اور حالات کا تقاضا بھی تھا۔ اس وقت کسی کو یہ تصور بھی نہیں تھا کہ یہی انڈین نیشنل کانگریس ایک روز ہندوستان کی حکمراں طاقت بن جائے گی۔

مسلم لیگ کا قیام

نیشنل کانگریس اگرچہ تمام ہندوستانیوں کے مفاد میں کام کرنے کا دعویٰ کرتی تھیں اور مسلمان بھی اس جماعت کے رکن تھے؛ لیکن اکثریتی طبقے کی تنگ نظری کے سبب مسلم مسائل پر کھلے ذہن سے کارروائی نہیں کی جاتی تھی۔ جس کہ ردِ عمل میں مسلمانوں کا پڑھا لکھا طبقہ کانگریس سے بیزار تھا اور وہ اپنے مطالبات اور مفادات کے لیے علیحدہ فلیٹ فارم بنانا چاہتا تھا۔ چناں چہ ۱۹۰۶ء میں نواب محسن الملک کی سربراہی میں مسلمانوں کا ایک وفد وائسرائے ہند لارڈ منٹو سے شملہ میں ملا۔ اور اس وفد نے وائسرائے ہند کو بتایا کہ چوں کہ ہندوستان میں جدید اصلاحات نافذ ہونے والی ہیں۔ اس لیے مسلمان چاہتے ہیں کہ ان کے لیے جداگانہ انتخاب کا حق تسلیم کرلیا جائے۔ کونسلوں میں ان کے لیے نشستیں مخصوص کردی جائیں اور سابق حکمراں قوم ہونے کی بناء پر مسلمانوں کے حقوق کے خاص طور پر لحاظ رکھا جائے، وائسرائے ہند نے مسلمانوں کے مطالبات پر ہمدردانہ طور پر غور کرنے کا وعدہ کیا۔

اس واقعہ کے بعد ایسے سیاسی معاملات سامنے آئے جس کی وجہ سے مسلم لیڈروں نے طے کیا کہ مسلمانوں کے لیے ایک ایسی جدید سیاسی انجمن کی بنیاد رکھی جائے جو ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کو ایک مرکز پر اور جھنڈے تلے جمع کر سکے۔ چناں چہ اس مقصد کے پیش نظر نواب ڈھاکہ کی دعوت پر دسمبر ۱۹۰۶ء میں نواب وقار الملک کی زیر صدارت ڈھاکہ میں ہندوستان کے تمام مقتدر مسلمانوں کا ایک نہایت ہی اہم جلسہ منعقد ہوا۔ اور اس جلسہ میں آل

انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھ دی گئی۔ لیگ کے قیام کے سب سے بڑے محرک نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک نواب ڈھاکہ اور مولانا محمد علی تھے۔ سر آغا خان لیگ کے مستقل صدر چن لیے گئے۔ نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک سکریٹری بنے۔ لیگ کے قیام کے بعد ۲۹ر دسمبر ۱۹۰۷ء کو کراچی میں لیگ کا پہلا سالانہ اجلاس ہوا۔ اس اجلاس کے صدر آدم جی پیر بھائی تھے، اجلاس میں ہندوستان کے تقریباً تمام مقتدر مسلمانوں نے شرکت کی۔

کراچی کے اجلاس کے بعد لیگ کا ایک خاص اجلاس ۱۹۰۸ء میں علی گڑھ میں ہوا۔ اس اجلاس کے صدر محمد شاہ دین بیرسٹر لاہور تھے۔ پھر ۱۹۰۸ء میں جب لیگ کا اجلاس امرتسر میں ہوا تو سر سی امام اجلاس کے صدر تھے۔ اس اجلاس میں منٹو مارلے اصلاحات پر غور کیا گیا اور مخلوط انتخاب کو مسلم مفاد کے خلاف قرار دیتے ہوئے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا گیا۔ نیز حکومت سے کہا گیا کہ کونسلوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپل کمیٹیوں میں مسلمانوں کی نشستیں مخصوص کی جائیں۔

حضرت علامہ آسی غازی پوری نے اپنے زمانے کے بدلتے ہوئے ملکی و سیاسی حالات، اندرونی و بیرونی مذہبی تحریکوں اور ان کی ایمان شکن کوششوں کا بغور مطالعہ کیا، اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کی شکستہ دلی، زبوں حالی کا علاج اور ان کے ایمان و عمل اور مذہبی اقدار کی سالمیت کے لیے خانقاہی نظام فکر و عمل کی مدد حاصل کی جانی ناگزیر ہے۔ صوفیہ و مشائخ کے عقیدہ و عمل کے سانچے میں برصغیر ہند کے مسلمانوں کو ڈھالا جائے تاکہ وہ صبر و استقامت کی ایسی مضبوط چٹان بن جائیں جن سے سامراجی قوتوں کا طوفان سر ٹکرا کر خود ہی پاش پاش ہو جائے اور الحادی قوتوں کا سیلاب مسلمانوں کے پائے ثبات کو جنبش نہ دے سکے۔ عقیدۂ توحید و رسالت، عشق رسول اور آئمۂ مجتہدین، علما و محدثین، سلف صالحین کی اتباع کے ساتھ محبت و ارادت کے چراغ دلوں میں ہمیشہ روشن رہیں تاکہ طاغوتی قوتیں اور یقین شکن ظلمتیں انہیں جادۂ حق سے منحرف نہ کر سکیں۔ آپ نے ہندوستان کے بدلتے ہوئے افق پر عشق و آگہی، صبر و استقامت، محبت و ارادت اور صلح و آشتی کی ایسی زریں کہکشاں کھینچ دیں جو تاریک سینوں کے لیے نور، شکستہ دلوں کے لیے مرہم اور شکوک و شبہات کی فضا میں یقین و اذعان کا اجالا پھیلا دے۔

☆☆☆

حضرت آسی کا وطن عزیز

مولانا عبدالغفار نوری ★

سکندر پور، ضلع بلیا ایک قدیم اور مشہور گل و یاسمن کی بستی اور صنعت و حرفت کے لحاظ سے ایک تاریخ ساز اور اہم قصبہ ہے۔ یہ اپنے دامن میں بے شمار تاریخی نشانیاں اور علمی وادبی اور سماجی و سیاسی شخصیات کو سمیٹے ہوئے ہے۔

اس قصبہ کو اس بات کا فخر حاصل ہے اور رہے گا کہ اس سرزمین پر دنیا کی عظیم ہستیوں میں سے ایک عظیم، مایۂ ناز، تاریخ ساز، شیخ طریقت، راز دار شریعت، غواص بحر معرفت، آشنائے رموز طریقت، تاج ولایت، داعی رشد و ہدایت، منبع کشف و کرامت، وارث خیر الوریٰ، نور چشم بصیرت، دلیل حق و صداقت، بہار قادریت، گل گلزار رشیدیت، زبدۃ السالکین، معین التارکین، صاحب اوصاف کثیرہ، منبع الطاف کبیرہ، صاحب دیوان، آقائے نعمت، دریائے رحمت، صاحب سلاسل عالیہ، بحرالاسرار، قاسم الانوار، قطب العرفا والعشاق، شہزادۂ حضور قطب العارفین شاہ قنبر حسین رشیدی سکندر پوری، حضرت مولانا شاہ محمد عبدالعلیم متخلص بہ آسی قدس سرہ العزیز سکندر پوری سجادہ نشین خانقاہ رشیدیہ، جون پور جیسی ہستی ہیں۔ یہ سرزمین حضرت کا مولد

★ استاذ: دارالعلوم سرکار آسی، سکندر پور، بلیا

وسکن ہے۔

آپ کو اپنے وطن اور جائے پیدائش سے کس قدر لگاؤ اور تعلق تھا اور آپ کی نظر میں اس کی کتنی اہمیت تھی کہ اس کا اظہار آپ یوں کرتے ہیں۔

پرتو عارض ہے دریا نور کا
زلف صحرا ہے سکندر پور کا

صحرائے ختن کی مشک بوئی کی تعریف تمام شعرا نے کی ہے۔ صحرا کی مشک بوئی محض خیالی ہے۔ اس لیے کہ جب تک مشک زندہ غزال کے نافہ میں رہتا ہے اور خوشبو باہر نہیں پھیلتی۔ مگر حضرت آسی نے صحرائے سکندر پور کی تعریف جس خوبی سے کی ہے، وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ سکندر پور اور اس کے اطراف میں گلاب، جوہی، چنبیلی اور بیلے کی کاشت ہوتی ہے اور گھاگھرہ بھی قریب ہے۔ اس اعتبار سے حضرت کا شعر انتہائی موزوں ہے۔

مگر حالات نے کروٹ لی اور مرشد کامل کی سجادگی سات ہی سال پر ختم ہوگئی اور ضرورت نے سجادہ نشینی کا سہرا آپ کے سر باندھا جس کی وجہ سے ذمے داریاں بڑھ گئیں۔ مریدین و معتقدین کی تربیت و دل جوئی اور خانقاہ کے فرائض کی ادائیگی نے اس رنگا رنگ و پر بہار سرزمین پر زیادہ دنوں تک زندگی بسر کرنے کے مواقع فراہم نہ کی اور پوری زندگی باہر ہی رہ کر گزاری۔ اس کا اظہار آپ کس حسرت سے کرتے ہیں کہ۔

کبھی جی بھر کے وطن میں نہ رہے ہم آسی
روز میلاد سے تقدیر میں غربت آئی

جس وقت آپ نے اس سرزمین پر قدم رکھا، وہ سامراجیت اور بدحالی کا دور تھا۔ ہنود کے رسم و رواج مسلمانوں کے ہر شعبۂ زندگی پر محیط تھے۔ بادشاہت کا دور طوائف الملوکی کے گہرے نقوش چھوڑ کر ختم ہو رہے تھے۔ انگریزی حکومت مستحکم ہو چکی تھی۔ آپ جیسے عالم بے بدل پر حکومت کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ایسے پر آشوب ماحول میں اوائل عمر سے تادم آخر شب و روز دین متین کی تبلیغ و اشاعت میں صرف کیے اور مغربی سامراجی اور طاغوتی طاقتوں کا مقابلہ کیا۔ دین کی تبلیغ کے مقدس فریضے کی ادائیگی کے راستے میں اگر ارباب علم و فضل اور اہل دولت

وثروت کے مسند نشیں حضرات مدمقابل آئے تو ان سے مقابلہ کیا۔ اس طرح دن میں تبلیغ اسلام اور خلق اللہ کی خدمت اور راتیں عبادت الٰہی، اوراد و وظائف، تلاوت قرآن اور دعا و مناجات میں گزاری۔ آپ فرماتے ہیں۔

رات ہے رات تو بس مرد خوش اوقات کی رات

گریۂ شوق کی یا ذوق مناجات کی رات

اس کے علاوہ آپ کے مورث اعلیٰ قطب الاقطاب، شیخ المشائخ حضرت بندگی شیخ احمد مبارک چشتی عدنی [متوفی ۱۰۱۶ھ]، ۹۶۶ھ میں عدن سے آکر یہاں آباد ہوئے۔ اس وقت یہ قصبہ غیر معروف تھا، نہ یہ کبھی پایۂ تخت رہا نہ تجارتی منڈی، نہ راجہ و مہاراجہ کا مقام۔ سارا علاقہ کفر والحاد میں مبتلا تھا۔ آپ نے دور اکبری کی مروجہ بدعتوں کے خلاف جہاد میں عملی طور پر حصہ لیا۔

تاریخی نقطۂ نظر سے دستیاب شدہ شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عظیم قصبہ جو صوفیوں اور سنتوں کا مرکز اور ان کی آماجگاہ رہا ہے، اس میں سب سے پہلی ذات جنہوں نے ۵۹۰ھ کو اپنے قدوم میمنت سے نوازا اور اسلام کی تشہیر و اشاعت میں اپنی زندگی گزاری، وہ حضرت سید شاہ مخدوم جمال ابن سید شاہ یحییٰ قادری عرف مخدوم چراغ ہند ہے۔ علاوہ ازیں بے شمار جلیل القدر صوفیائے کرام مثلاً حضرت چندن بندی چھور، حضرت ہاشم چہار ضرب، حضرت چک بھیک، حضرت مخدوم دھوبہا، حضرت تھانے کے شہید رحمہم اللہ اور ذی علم شخصیتیں مثلاً مولانا بندگی محمد وسیم، حضرت مولانا بندگی قنبر حسین، مولانا وکیل احمد عاجزؔ، مولانا عبد الاحد، مولانا ولی الحسنین، مولانا محمد احمد ایمن رحمہم اللہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

گنگا و گھاگھرہ کے درمیان بسنے والا یہ قصبہ فوجی نقل و حرکت اور صنعت و حرفت کے لحاظ سے بہت موزوں اور مناسب تھا اور شمالی ہندوستان میں تجارت کرنے کا ایک عمدہ راستہ دریائی راستہ سے گھاگھرہ ندی ہی سے تھا۔ شرقیوں اور لودھیوں نے فوجی ضروریات کے پیش نظر سکندر پور اور اس کے مضافات کو بڑے ہی قرینے سے بسایا تھا۔

سکندر پور شاہان شرقی دور حکومت میں یہ ایک چھوٹی بستی کی شکل میں تھا اور شاید اس کا نام بھی کچھ اور تھا، مگر سکندر لودھی کے ورود اور فتح و نصرت کے بعد اس کا نام ''سکندر پور'' پڑا۔

مضافات کے ناموں سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سرزمین معرض وجود میں آنے کے بعد ہی سے ایک نامی و مقتدر سرزمین تھی اور سکندر لودھی کے زمانۂ شہنشاہیت کے آغاز سے کچھ ہی دنوں میں ایک قصبہ کی شکل میں ترقی پذیر ہوئی۔

قصبہ سکندر پور، پہلے ضلع اعظم گڑھ میں تھا، لیکن غازی پور ضلع بننے کے بعد اس میں شامل کرلیا گیا؛ لیکن جب ۱۸۸۰ء میں بلیا ضلع کے وجود میں آیا تو اس قصبہ کو اس سے منسلک کردیا گیا اور اس وقت یہ اسی ضلع کا مشہور و معروف ترقی پذیر قصبہ ہے۔

قصبہ سکندر پور کو یہ بھی نمایاں حیثیت حاصل ہے کہ کئی سلاطین و حکمراں کا گذر بھی یہاں سے ہوا ہے۔

چناں چہ ۱۵۲۵ء میں جب سکندر لودھی، شاہان مشرق ''جونپور'' کو فتح کر کے اسے اپنی حکومت میں شامل کرلیا پھر اس کی طرف توجہ کی اور دریائے گھاگھرہ کے بائیں کنارے پر آباد ایک مشہور شہر ''شہر خرید'' جس کا اسلامی نام ''اسلام آباد'' تھا، اسے خوب لوٹا اور برباد کیا۔ آج کل یہ موضع خرید ایک معمولی ٹولہ کی حیثیت سے آباد ہے۔ اس کے شمال و مشرق میں دریائے گھاگھرہ اور جنوب و مشرق میں دریائے گنگاہ اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ رواں دواں ہے اور ان دونوں دریاؤں کا سنگم بھی اسی ضلع کا مشرقی حصہ ہے جسے 'دوآبہ' کہا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ غلام خاندان کا مورث اعلیٰ ''قطب الدین ایبک'' بادشاہ بھی اپنے دور حکومت میں ان اطراف سے ہو کر گزرا ہے۔ اس وقت دریائے گھاگھرہ میں سیلاب جوش پر تھا اور اسے دریا عبور کرنا ضروری تھا۔ لہٰذا اس نے فوراً ایک گھاٹ بنوایا جس کا نام ''قطب گنج گھاٹ'' رکھا گیا، یہ گھاٹ آج بھی اسی نام سے مشہور ہے۔

قطب الدین ایبک سکندر پور کے پاس ہی ''کٹھونڑا'' گاؤں میں دریائے گھاگھرہ کے کنارے خیمہ زن بھی ہوا تھا۔

پانی پت کی لڑائی کے بعد بایزید کی بغاوت پر بابر کو گھاگھرہ کی لڑائی لڑنی پڑی جو گنگا گھاگھرہ اور ''سون بھدر'' کے سنگم پر ہوئی۔ اس لڑائی میں بابر نے اپنے دو سردار ''چقماق'' اور ''تیمور قباچہ'' کو گھاگھرہ کے کنارے بھیجا اور خود گنگا کے کنارے سے سنگم پر پہنچا۔ فتح کے بعد شمالی

راستے سے دریائے گھاگھرہ کے کنارے مشرق سے دریا پار کیا اور سکندر پور "چتر مکھ پوکھرہ" کے راستے سے دس کوس چل کر "کڑہڑاپور" گاؤں میں قیام کیا۔ ہمایوں اور شیر شاہ سوری کی فوجیں بھی سکندر پور کے علاقے سے گزری ہیں۔

آثار قدیمہ کے اعتبار سے یہ قصبہ اپنے دامن میں بے شمار نشانیاں چھپا رکھا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ سکندر لودھی نے یہاں ایک قلعہ تعمیر کرایا اور تقریباً چالیس پچاس فٹ اونچا ایک مضبوط مینارہ بھی۔ اس مینارہ پر شاہی دور میں محافظوں کی ڈیوٹی رہا کرتی تھی جو دریائے گھاگھرہ پر نظر رکھتے تھے، تاکہ دریا پار کر کے آنے والے حملہ آوروں کا بآسانی پتہ چل سکے۔ اس سے متصل ایک پختہ تالاب ہے، جسے "قلعہ کا پوکھرہ" کہا جاتا ہے اور متصل جملہ اراضیات کو "قلعہ کہنہ" کہا جاتا ہے۔ اس وقت قلعہ کی کوئی علامت موجود نہیں ہے۔ قلعہ کے بغل سے دریائے گھاگھرہ تک دو سرنگیں بھی تھیں جو سراغ رسانی کے کام میں آتی تھیں۔ تقریباً سو برس ہوئے، اس کے شمال جانب موضع "چیتن کشور" میں سرنگ ملا تھا جسے سرکاری افسروں نے بند کرا دیا۔

قلعہ سے پچھم طرف ایک سرائے بھی قائم تھی جو مسافروں، سوداگروں اور فوجی افسران کے ٹھہرنے کی جگہ تھی۔ یہاں ایک عالی شان گیٹ بھی تھا جو حوادث زمانہ کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گیا اور اس کے نشانات بھی ختم ہو گئے۔ البتہ آج بھی وہ جگہ "محلّہ سرائے" کے نام سے موسوم ہے۔

اس سے دکھن جانب اینٹ اور چونے کے تین گنبد کی ایک مسجد بھی تعمیر ہوئی تھی۔ یہ مسجد زمین دوز تھی اور زبردست ابھرے ہوئے تودے کی شکل میں واقع تھی۔ چاروں طرف کیوڑے کی کھیتیاں تھیں۔ خدا بخش خان نے جب اس کو دیکھا تو عوام سے درخواست کر کے صاف کرایا اور پھر یہ اپنے اصلی خدوخال میں نمودار ہوئی اور باقاعدہ نماز پنج گانہ و جمعہ وغیرہ کی نمازیں ادا کی جاتی رہیں جو آج بھی "شاہی جامع مسجد" کے نام سے موسوم ہے۔ قلعہ کے پچھمی پھاٹک پر "جلیا" اور پوربی پھاٹک پر "کلیا" کے دو مندر بھی بنے ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان مندروں کی تعمیر کے وقت "جلیا" اور "کلیا" نامی دو لڑکیوں کی بلی دی گئی تھی جس سے ان مندروں کو انہیں کے نام سے منسوب کر کے پکارا جانے لگا۔

مذہبی، دینی، وعصری علوم وفنون میں بھی یہ قصبہ اپنی حیثیت ثابت کر چکا ہے۔ چتر مکھ

پوکھرہ سے متصل جنوب میں ۱۹۰۶ء میں مسجد سے ملحقہ ایک مدرسہ کی بنیاد بہادر خان نے حضرت آسی کے دست مبارک سے ڈالی جو فی الحال تبدیلی نام کے بعد ''دار العلوم سرکار آسی سکندر پور'' کے نام سے مشہور و معروف ہے اور اس وقت یہ بلیا ضلع کا مرکزی ادارہ بن چکا ہے اور اس ادارے سے ہزاروں علما، حفاظ وقرا سند و دستار سے سرفراز ہو کر تبلیغ اسلام اور دین متین کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی مکاتیب، مدارس، ہائی اسکولیس وانٹر کالجز وغیرہ ہیں جو تشنگان علوم کی خدمات میں مصروف ہیں۔

سیاسی وسماجی اور علمی میدان میں بھی یہ قصبہ اپنی مثال آپ ہے۔ اسی سرزمین کی مٹی پر جنم لینی والی شخصیت مجاہد آزادی، مولانا آزاد سبحانی کی ہے جن کی گراں قدر اور قابل احترام علمی، ادبی، سیاسی اور سماجی خدمات تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ مصر کی جامعہ ازہر یونیورسٹی نے آپ کو ''فیلسوف ہندی'' کے خطاب سے نوازا ہے۔

ان تاریخی شواہد کے علاوہ علم نجوم (جیوتش) میں بھی سکندر پور کو ایک مقام حاصل ہے۔ پنڈت غلام مشرا سکندر پوری علم جیوتش کے بہت بڑے عالم تھے۔ آپ نے اس علم میں نئے تجربے کیے۔ بنارس کے جیوتش حلقے آپ کا بہت احترام کرتے تھے۔ موجودہ پنچانگ (پترہ) جو رائج ہے، اس کے مرتبین میں آپ کا نام بھی شامل ہے۔

علم سنسکرت میں بھی سکندر پور کو فخر حاصل ہے کہ پنڈت گوری شنکر تیواری اس علم کے ماہر اور اچھے جان کار گزرے ہیں۔

حکمت کے میدان میں بھی اہل سکندر پور نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ حضرت آسی کے علاوہ حکیم محمد عبد القدوس، حکیم عبد الصمد، حکیم جمیل احمد شاہی طبیب ریاست حیدر آباد، حکیم احمد حسین، حکیم محمد سلیم، حکیم اکبر حسین، حکیم امیر احمد شاہدی، حکیم عبد الرحیم اور حکیم امیر احمد ہندی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان کے علاوہ سکندر پور کو جو مقبولیت وشہرت حاصل ہوئی، اس کی ایک وجہ پھولوں کی کاشت بھی ہے۔ یہاں پھولوں کی کاشت زمانۂ قدیم سے بلا تفریق مذہب وملت ہو رہی ہے۔ ہند وبیرون ہند سے آنے والے بے شمار افراد پھولوں کے ذریعے خوشبودار تیل، عطر، عرق گلاب،

گلقند وغیرہ مصنوعات تیار کر کے عدن، ایران، عراق، بلخ، پاکستان، بنگلہ دیش، برما وغیرہ مختلف ممالک میں فروخت کرتے ہیں۔ ہر قسم کے خوشبودار پھول مثلاً بیلا، چمبیلی، گلاب، کیوڑہ وغیرہ سے تمام گلیاں مہکتی رہتی تھیں، مگر علاقے کی تباہی و بربادی اور ترک وطن وحکومت کی عدم توجہی کی وجہ سے صدیوں سے اس گلستاں کی فضا جو رنگا رنگ خوشبوؤں سے معطر و معمور تھی، وہ بہت مختصر ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ قدیم سلسلہ مختصر ہی صحیح مگر آج بھی جاری ہے اور پھولوں کی کاشت سے سینکڑوں ہندو مسلم کنبے پرورش پا رہے ہیں۔

اس کے علاوہ وہ سرزمین سکندر پور میں ایسی ایسی نامور ہستیاں اس مردم خیز خطے میں ابھریں جن کی گوناں گوں علمی، عملی، ادبی صلاحیت اور شاعرانہ عظمت میں خاص مہارت حاصل تھی جس کا اعتراف اہل علم وادب نے کیا اور جن کے کارنامے تاریخ کے اوراق میں بھی ثبت ہو چکے ہیں۔

الحمدللہ! ان پاک ہستیوں کی کرم فرمائی، نظر عنایت اور کریمانہ نوازشات ہیں کہ یہ قصبہ بدعقیدگی سے پاک وصاف ہے اور روز بروز پھل پھول رہا ہے۔ خاص کر عارف باللہ حضرت آسی کی پاکیزہ زندگی کی برکت اور ان کا فیضان ہے کہ سکندر پور ترقی کے منازل پر گامزن ہے۔ دعا ہے کہ سکندر پور ہمیشہ یوں ہی سرسبز وشاداب رہے۔ آمین

☆☆☆

حضرت آسی، تصوف اور تصوف مخالف تحریک: ایک تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر محمد سجاد عالم رضوی ☆

ہندوستان میں انیسویں صدی کے آغاز میں کئی فکری اور اعتقادی تحریکوں نے جنم لیا۔ ان تحریکوں کا مطالعہ عموماً ''اصلاح وتجدید'' کے زیرعنوان کیا جاتا ہے اور ان کو عالم اسلام میں پائی جانی والی تحریکات سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے۔ تاریخی طور پر اگر دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں مسلم حکومتوں کے عروج وزوال کے نامیاتی تصور اور مغربی استعمار کے پس منظر میں نمودار ہوئیں۔ جدید مسلم افکار ونظریات کے مطالعات میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ احیاے اسلامی کے سوتے اٹھارہویں صدی سے ملتے ہیں۔ اس حوالے سے ''وہابی نظریہ'' اور بعد کے دور کی ''اسلامی فکر'' کے درمیان ایک خاص نوعیت کا رشتہ تلاش کیا جاتا ہے۔ بنیاد پرستی پر مبنی اس احیاو تجدید کے تسلسل کا دعویٰ اس مفروضے پر مبنی ہے کہ تنظیمی ڈھانچے میں اختلاف کے باوجود اٹھارہویں صدی کے وسط سے لے کر انیسویں صدی کے وسط تک کی احیائی تحریکوں نے کم وبیش یکساں فکر کو پیش کیا جو اسلام کے ایک قابل شناخت بنیاد پرست پہلو سے تعلق رکھتا ہے۔ اسلام کی یہ مخصوص تصویر مندرجہ ذیل موضوعات کے تحت پیش کی جاتی ہے:

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ تاریخ، پریسیڈینسی یونیورسٹی، کولکاتا، مغربی بنگال

اصول کی طرف رجوع، قرآن وسنت پر عمل کی ضرورت، مطالعۂ حدیث اور اجتہاد کی دعوت، معمولات میں بدعات، فقہ واصول فقہ میں تقلید سے انکار اور تصوف کے حوالے سے بہت سے ان معمولات سے انکار جن کو ان تحریکوں نے ''بے اعتدالیوں اور تجاوزات'' کا نام دیا ہے۔

مذہب اور مذہبی افکار ومفکرین کی تاریخ میں دلچسپی لینے والے اسکالرز نے یہ تسلیم کیا ہے کہ زیادہ تر مسلم علما نے اٹھارہویں صدی میں عام طور پر اصلاح وتجدید کو معاشرتی ومذہبی امور تک محدود رکھا تھا۔ تاہم محمد بن عبدالوہاب کی تحریک نے سیاسی پروگرام کو بھی اپنے منصوبوں میں شامل کر لیا تھا۔

ہندوستان میں انیسویں صدی کے آغاز میں جنم لینے والی تحریک ''طریقۂ محمدیہ'' (جسے 'وہابی تحریک' کا بھی نام دیا جاتا ہے) شاہ محمد اسماعیل دہلوی اور سید احمد رائے بریلوی کی ایک تحریک ہے جس کو عصری جامعات کے دراسات اسلامی اور تاریخ اسلامی کے شعبوں میں ''اصلاح وتجدید'' کے زیر عنوان پڑھا اور سمجھا گیا ہے۔ دراصل ان مطالعات میں اس پہلو کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ مسلم علما کے افکار ونظریات میں تنوع پایا جاتا تھا۔ اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ''اصلاح وتجدید'' کے تصورات کی تعبیر وتشریح میں ان کی آرا بھی مختلف تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ محمد اسماعیل سے پہلے خود دہلی کے علما و مشائخ نے بھی اپنی تصنیفات میں ''اصلاح، تجدید، اور احیا'' پر خاصا زور دیا ہے۔ مگر اس حوالے سے ان کی تعلیمات اور شاہ محمد اسماعیل دہلوی کے خیالات کے درمیان کافی فرق نظر آتا ہے۔ ان علما اور مشائخ اور شاہ محمد اسماعیل دہلوی کے افکار ونظریات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اتباع قرآن وسنت، اجتہاد وتقلید، توسل واستعانت اور تصوف کے معمولات ومسلمات پر ان کے مابین کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ لہٰذا شاہ محمد اسماعیل کی تحریک ''طریقۂ محمدیہ'' کو اٹھارہویں صدی کی اصلاحی واحیائی تحریکوں کے تسلسل کے طور پر نہ دیکھا جائے۔ کیوں کہ ''اصلاح وتجدید'' کے پروگرام کے حوالے سے ان کے نکتہ ہائے نظر اور طریقہ ہائے کار میں یکسانیت نہیں تھی۔

طریقۂ محمدیہ کے نظریہ ساز شاہ محمد اسماعیل دہلوی کی تصنیفات کے مضامین ومواد کا تجزیاتی مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ تقویت الایمان میں تصوف کا کھلا انکار ہے تو صراط مستقیم کی عبارتوں

میں ترجیحی بنیادوں پر تصوف اور صوفیانہ روایات کو استعمال کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لیے اس میں تضادات بے شمار ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ اگر منصب امامت کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے اس میں شاہ محمد اسماعیل نے صوفیہ کرام کے افکار و نظریات سے بھرپور استفادے کی کوشش کی ہے۔ دراصل اس تحریک کی تصنیفات کے مضامین کا تعلق سید احمد رائے بریلوی کے کیریر (کردار) کے ارتقا سے ہے۔ جب منصب امامت لکھی گئی تھی اس دور میں انہوں نے اپنی خلافت و امامت کا دعوی کیا تھا۔ اس سلسلے میں صوفیہ کرام کا نظریۂ قیادت و رہنمائی (بیعت و ارادت) ان کے دعوی کے لیے سودمند ثابت ہوتا نظر آیا۔ اسی لیے انہوں نے اس کو استعمال کیا۔ مگر اسی کے ساتھ اپنی تحریک کو ایک ممتاز شناخت دینے کے لیے شاہ محمد اسماعیل دہلوی نے صوفیہ کرام کے معتقدات اور معمولات پر ''توحید، شرک، بدعت اور اتباع شریعت'' جیسی اصطلاحات کا استعمال کر کے تنقید کی ہے۔ مگر جہاں تک سید احمد رائے بریلوی کی روحانی قیادت کی بات ہے تو صوفیۂ کرام کے کشف و الہام، بیعت و خلافت اور اطاعت و اتباع شیخ کے اصولوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

اس تحریک نے بعد کی کئی تحریکوں کو متاثر کیا ہے۔ تحریک دیوبند نے ''اصلاح تصوف'' کے نام پر صوفیہ کے بعض معمولات کو ''بدعت'' کے خانے میں رکھا ہے تو دوسری طرف تحریک اہل حدیث نے تصوف کا کھل کر انکار کیا ہے۔ کچھ اسکالرز کا ماننا ہے کہ علی گڑھ تحریک بھی طریقۂ محمدیہ کے افکار و نظریات سے متاثر ہوئی۔ تاہم علی گڑھ تحریک نے مغربی افکار کو بنیاد بنا کر ''عقلیت پسندی'' کو اپنایا جس کا نتیجہ بعد میں ''نیچریت'' کی شکل میں نمودار ہوا۔ لیکن اگر غور و فکر کے ساتھ ''طریقۂ محمدیہ'' کے نظریہ سازوں اور ان سے متاثر افراد اور اداروں کے افکار و نظریات اور کردار و عمل کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جن مسائل تصوف پر ان لوگوں نے بحث کی شروعات کی ہے، ان کی رو سے جملہ سلاسل تصوف ''شرک و بدعت'' کے جرم کا ارتکاب کرتے نظر آتے ہیں۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور کے علما نے طریقۂ محمدیہ کی تعلیمات پر شدید تنقید کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر اور انیسویں صدی کے نصف اول میں اس حوالے سے متعدد مسائل پر بحث و مباحثہ کا آغاز ہوا۔ رسالے اور جوابی رسالے لکھے گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستانی مسلمان کئی گروہوں میں

بٹ گئے۔ اکثریت کا تعلق تا ہم اہل سنت جماعت سے رہا۔

اس مختصر سے مضمون میں تصوف اور صوفیہ کی جن تعلیمات اور معمولات پر شاہ محمد اسماعیل دہلوی نے تنازعہ پیدا کیا تھا، ان میں سے چند مسائل (تصور محبت، مسئلہ وحدۃ الوجود، پیری مریدی اور زیارت) پر حضرت شاہ عبدالعلیم آسی غازی پوری کی فکر کا ایک اجمالی تجزیہ پیش ہے۔

پیش کش کی ترتیب اس طرح ہے کہ پہلے ان مسائل پر ۱۸ویں صدی کے چند اہل علم و عرفان صوفیہ کی تحریروں کو پیش کیا جائے گا اور اس کے بعد شاہ اسماعیل دہلوی کے افکار و خیالات پر گفتگو ہوگی۔ اس کے بعد شاہ عبدالعلیم آسی کے کلام کی روشنی میں ان کے موقف کو واضح کیا جائے گا۔ اس عنوان پر کام کرنے کی تحریک حضرت سید شاہ شاہد علی سبز پوش رشیدی گورکھپوری کی اس عبارت سے ملی جس میں انہوں نے ''وہابی خیالات'' کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''حضرت کی کرامتیں اگر لکھی جائیں تو ایک ضخیم کتاب میں بھی نہ سمائیں گی۔ حضرت کی خدمت سے میں نے کسی صاحب غرض کو محروم جاتے نہیں دیکھا بشرط یہ کہ جو حضرت کی زبان سے نکلا ہو، اس پر اس نے عمل کیا ہو۔ جو کوئی کوئی غرض لے کر آتا حضرت کوئی دعا یا اسم بتا دیتے یا کسی بزرگ کے مزار پر حاضری کو فرماتے یا کوئی تعویذ وغیرہ دلوا دیتے۔ بعض مرتبہ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ کسی نے اپنی حاجت پیش کی اور حضرت نے انتہائی بے توجہی ظاہر کی اور ادھر اس کا کام ہوگیا۔ ۱۹۰۹ء میں جب حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو میرے خیالات کچھ وہابیت اور نیچریت لیے ہوئے تھے۔ جو خیال دل میں آتا تھا دوسروں پر رکھ کر اس کا جواب فوراً دے دیتے تھے۔ جب تک میرے عقائد بالکل درست نہ ہو لیے، اس وقت تک میرے ہر خطرے کا جواب ملتا رہا۔ اخیر میں اکثر یہ خطرات آئے کہ حضرت پر خطرات مکشوف ہوتے ہیں جب جواب ملتا ہے یا حضرت کی تقریر ہی اتنی جامع ہوتی ہے کہ سب کے خیالات کے جواب ہو جاتے ہیں۔ اگر میں سامنے بیٹھا رہا تو آنکھ ملا کے جواب ملا۔ اگر پشت کی طرف بیٹھا رہا تو میری طرف منہ پھیر کر فرمایا کہ تمہارا جواب ہے۔ اور پھر دوسروں سے باتیں کرنے لگے۔'' [عین المعارف، ۶۰]

حضرت آسی نے ان ''وہابی اور نیچری خیالات'' کا جواب اپنی مجلسی گفتگو میں تو دیا ہی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اپنے اشعار میں بھی جا بجا اس پر کلام کیا ہے۔ اشعار بھی ایسے جوان کی

نظر میں الہام یا کرم کردگار ہیں۔

شعر اور سر غیب یقیناً یہ میں نہیں
روح القدس ہے یا کرم کردگار ہے

تصور محبت اور ہندوستانی صوفیہ

محبت ایک ایسا تصور ہے جو صوفی ادب میں بہت ہی نمایاں ہے۔ چوں کہ یہ لفظ حب الٰہی اور حب انسانی دونوں کے لیے مستعمل ہے۔ اسی لیے اس پر بحث بھی بہت زیادہ ہوئی۔ دراصل خدا اور بندے کے درمیان جو رشتہ اور تعلق ہے، اس کی تعبیر لفظ محبت سے کی جاسکتی ہے یا نہیں ، اگر کی جائے تو کیا جو الفاظ انسانی محبت کے اظہار کے لیے مستعمل ہیں، ان کو حب الٰہی کے لیے استعمال کر سکتے ہیں؟۔ اس سلسلے میں لفظ عشق کا استعمال ذات باری تعالی کے لیے کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اس صورت میں اس لفظ کے معانی و مفاہیم مختلف ہوں گے یا نہیں؟ ان سوالات پر صوفی ادب میں کافی بحث ہوئی ہے۔ اس موضوع پر اولین صوفیہ کی تعلیمات دو جہتوں پر ملتی ہیں:

(۱) اللہ تعالی سے انسان کا تعلق وجود کے اعتبار سے

(۲) اور اللہ تعالی سے انسان کا تعلق اخروی نجات کے اعتبار سے

اول الذکر کی طرف اشارہ حدیث "کنت کنزا مخفیا الخ'' میں ملتا ہے جب کہ ثانی الذکر کا بیان قرآنی آیت ۔"یحبھم و یحبونہ'' میں ملتا ہے۔

ان صوفیہ نے بندے کے لیے خدا کی محبت اور خدا کے لیے بندے کی محبت دونوں کو تسلیم کیا ہے، تاہم یہ حضرات خدا کی محبت کو اس کے ارادہ، قرب ، انس ، جذب وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

جہاں تک خدائے تعالی اور بندہ کے درمیان محبت کے لیے لفظ عشق کے استعمال کی بات ہے تو اس سلسلے میں شیخ علی ہجویری لکھتے ہے:

''عشق کے بارے میں مشائخ کے کئی اقوال ہیں:

ایک گروہ کا ماننا ہے کہ اللہ کے لئے (بندہ) کا عشق ممکن ہے۔ مگر یہ ماننا درست نہیں کہ اللہ کی طرف سے (بندہ کے لیے) عشق ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ عشق ایک ایسی صفت ہے

جو محبوب سے روکتی ہے۔ بندہ کو حق تعالی سے ملنے میں رکاوٹ ہو سکتی ہے مگر حق تعالی کی لیے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اسی لیے اللہ کے لیے بندہ کا عشق جائز ہے مگر اللہ کی طرف سے بندہ کے لیے جائز نہیں۔ ایک دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ حق تعالی کے لیے بھی بندہ کا عشق روا نہیں۔ کیوں کہ عشق حد سے تجاوز کرنے کو کہتے ہیں جب کہ خداوند تعالی کی کوئی حد نہیں ہے۔ ایک اور گروہ کا قول ہے کہ عشق دونوں جہاں میں صرف ادراک ذات کے طالب پر درست آتا ہے اور حق تعالیٰ کی ذات مدرک نہیں۔ ہاں صفت کی محبت درست ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عشق دید کے بغیر بیدار نہیں ہوتا جب کہ محبت سماعت سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ اسی لیے حق تعالی کے لیے عشق روا نہیں، کیوں کہ کوئی بھی باری تعالیٰ کو اس دنیا میں نہیں دیکھ سکتا ہے۔ چوں کہ عشق کا تعلق نظر سے ہے اس لیے ذات حق سے عشق نہیں ہو سکتا۔ اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ اس کے متعلق صرف سنا ہے۔ اس لیے سب نے دعوی کر دیا۔ کیوں کہ سب کو اذن گفتگو ہے۔ ذات حق محسوس نہیں ہو سکتی اور احاطۂ ادراک سے باہر ہے۔ اس لیے عشق کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ حق تعالی اپنے افعال اور صفات سے اپنے اولیا پر احسان اور رحمت کرتا ہے۔ اس کی صفات سے محبت درست ہے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو یوسف علیہ السلام کی محبت نے مستغرق کر دیا تھا۔ جب فراق کی حالت میں ان کے پیرہن کی بو ان کے مشام تک پہنچی تو ان کی آنکھوں میں بینائی آ گئی۔ اور جب زلیخا کو یوسف علیہ السلام کے عشق نے فنا کر دیا تھا تو جب تک ان سے ملاقات نہ ہو گئی، ان کی آنکھیں روشن نہ ہوئیں۔ یہ ایک عجیب طریق ہے کہ کوئی ہوئی کو پالتا ہے تو کوئی ہوئی کو چھوڑ دیتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ عشق کی کوئی ضد نہیں اور حق تعالی کے لیے بھی کوئی ضد نہیں۔ اسی لیے وہ اس کے لیے روا ہے۔ اس فصل میں بہت سے لطیف اور باریک نکات ہیں مگر طوالت کے خوف سے اسی مقدار پر کفایت کرتا ہوں۔''

[کشف المحجوب، فارسی، ص: ۲۷۱۔۲۷۲]

مگر بعد کے صوفیہ نے حب الٰہی اور حب انسانی کے درمیان تفریق کر کے اس اختلاف کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح سے عشق کو محبت کے مدارج و مقامات میں سے ایک مقام کے طور پر قبول کیا گیا ہے مگر اسی کے ساتھ اس لفظ کے مواقع استعمال کے لحاظ سے مختلف

معانی و مفاہیم کی تشریح بھی کی گئی ہے۔فارسی زبان میں صوفی ادب کی نمایاں شخصیات مثلاً حافظ، عطار اور رومی کی تحریروں میں عشق ایک مرکزی موضوع بن گیا۔اسی سے متعلق عشق مجازی اور عشق حقیقی کی بحث بھی ہے۔جس کے لیے مشہور مقولہ ''المجاز قنطرة الحقیقة'' کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔آئندہ سطور میں اس موضوع پر ۱۸ویں صدی کے چند ہندوستانی علما کی تحریروں سے اقتباسات پیش کیے جارہے ہیں۔ان سے معلوم ہوگا کہ ان حضرات نے صوفیہ کے تصور محبت پر کیا موقف اختیار کیا تھا۔

شاہ کلیم اللہ جہان آبادی سلسلۂ چشتیہ کے ایک عظیم بزرگ ہیں۔انہوں نے محبت کی تعریف اور اس تصور کی مختلف تعبیرات کی نوعیت کے بیان کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

''محبت اس توجہ (اور طبعی میلان) کو کہتے ہیں جو ایسے غلبے کے ساتھ ممتاز ہو جو ترجیح ارادہ کے ساتھ پیدا ہوا ہو۔محبت کا تحقق طرفین میں ہوا کرتا ہے۔کیوں کہ وہ ایک ایسا معنوی ربط ہے جو غلبہ اور عنایت کے ساتھ روابط میں مؤثر ہوا کرتا ہے۔محبت کے علاوہ عشق، ہوئ، میل، شغف، کلف چند ایسے الفاظ ہیں جو محبت کے مرادف اور ہم معنی ہیں۔صرف قوت وضعف کے اعتبار سے ان میں ذرا ذرا سا فرق ہے۔علمائے محققین کا جو اس میں اختلاف ہے کہ عشق اور اس کے ہم معنی الفاظ کا اطلاق باری تعالی عز اسمہ کے حق میں جائز ہے یا نہیں۔اس مسئلہ میں ہر شخص ایک طرف گیا ہے۔یہ صرف لفظی نزاع ہے۔[..............] یہاں تک کہ بعض عارفین نے ذات بحت کو عشق سے تعبیر کیا ہے۔اور اصطلاح وتعبیر میں کوئی مناقشہ نہیں۔ع

وللعاشقین فیما یعشقون مذاهب

سمنون محب علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ:

''محبت کے سوا کوئی ایسا مقام نہیں جس پر تغیر وزوال عارض نہ ہوتا ہو۔صرف محبت ہی ایک ایسی چیز ہے جس پر ازلاً وابداً زوال نہیں ہوتا۔'' [تلک عشرۃ کاملہ: ۶۷۔۶۸]

بندہ کے لیے اللہ کی محبت اور اللہ کے لیے بندہ کی محبت کے بیان میں شاہ کلیم اللہ جہان آبادی فرماتے ہیں:

''محبت کی دو قسم ہیں: ایک وہ محبت جو مربوب اور مخلوق کی طرف سے رب اور خالق کی

جانب ہو (یعنی بندہ کا خدا سے محبت کرنا) دوسری وہ محبت جو رب اور خالق کی طرف سے مربوب مخلوق کی جانب ہو (یعنی خدا کا بندہ سے محبت کرنا)۔ بندہ کی خدا سے محبت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کی مقدس جناب کی طرف نزدیکی اور تقرب (زلفی) کا قصد کرتا ہو۔ اور خدا کی بندہ سے محبت کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنی طرف اسے قریب کرنا چاہتا ہو۔ محبت کی ان دو قسموں میں سے ہر ایک قسم ان احکام و آثار سے پہچانی جاتی ہے جو اس کے ساتھ خاص ہوتے ہیں۔ قسم اول کے احکام میں سے یہ ہیں: خدا کو ہمیشہ یاد کرنا، اس کی تعظیم و رضا جوئی کی طلب، تقرب و نزدیکی کی امید میں بے قرار رہنا، جو چیز اس کو ناپسند ہو یا جس سے اس کو انکار ہو اس سے دلی نفرت کرنا اور اس کی مامورات و منہیات کی بجا آوری میں ان چیزوں کو یک لخت چھوڑ دینا جن سے اس (بندہ) کو الفت اور انسیت ہے۔ قسم ثانی کے احکام میں یہ ہیں: بندہ کی لیاقت اور قابلیت کے مطابق اپنی نعمتوں سے سرفراز کرنا یعنی دنیا میں ایمان کا ثمرہ اور آخرت میں اس کی لذت، اغیار کی طرف التفات کرنے سے اسے ہمیشہ محفوظ رکھنا، شان و تعین اور اعتبار سے اسے مجرد کرنا۔"

[تلک عشرہ کاملہ: ۶۸۔۶۹]

محبوب کے اقسام، حیثیت اور نوعیت کے اعتبار سے بھی وہ محبت کی دو قسم کرتے ہیں:

"بعض کبرا کا قول ہے: محبت دو قسم پر ہے۔ ایک جنس کی محبت اپنی جنس کے ساتھ۔ اس قسم کی محبت میں نفس کو اپنے ہم جنس کی طرف میلان اور انسیت ہوا کرتی ہے اور وہ ذات محبوب کو از روئے ممارست اور ملازمت کے طلب کرتا ہے۔ دوسری جنس کی محبت غیر جنس کے ساتھ۔ اس قسم کی محبت میں انسان محبوب کے اوصاف میں سے کسی صفت کے ساتھ انسیت حاصل کرنے کی غرض سے اس کے اوصاف دریافت کیا کرتا ہے۔ جیسے سماع بلا کلام اور رویت بلا عین۔ میں کہتا ہوں کہ محبت ایک ایسا لطیفہ ہے جو متجانسین اور متخالفین میں متفاوت نہیں ہوتا مگر ان لوازمات کی وجہ سے جو خارج میں ان دونوں قسموں کے ساتھ مختص ہوا کرتے ہیں۔" [تلک عشرہ کاملہ: ۶۹]

اس بیان میں شاہ کلیم اللہ جہان آبادی نے اللہ تعالی اور بندہ کے درمیان جو معنوی رابطہ اور تعلق ہے اس کو محبت کا نام دیا ہے۔ اس تعلق کو بتانے والے متعدد الفاظ کو ذکر کرنے کے بعد ان پر اختلاف کو نزاع لفظی کا نام دیا ہے۔ کیوں کہ انہوں نے اللہ تعالی کی محبت اور بندہ کی محبت

میں فرق و امتیاز کو ملحوظ رکھا ہے۔ ان کے مطابق محبت کی ان دونوں اقسام کی تعریفیں مختلف ہیں۔ لہٰذا ان کے احکام و آثار بھی الگ نوعیت کے ہوں گے۔ اس لیے صوفی ادب میں اس لفظ کے استعمال کے سیاق وسباق کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

اسی طرح محبت کی ابتدا کے اسباب کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''جاننا چاہیے کہ جو لوگ منعم حقیقی کی محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں، وہ دو گروہوں میں ہیں۔ ایک تو جس نے اولاً منعم کو دیکھا اور اسے اس کے افعال میں کمال آرزومندی اور مزید شوق ظاہر کرنے کا سبب قرار دیا ہے۔ دوسرا وہ گروہ ہے جس نے اولاً انعام کو ملاحظہ کیا اور اس کی ذات میں مزید آرزومندی اور شوق کا سبب اسے ٹھہرایا۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ سبقت لے جانے والے تو سبقت لے جانے والے ہیں۔ وہ تو مقرب ہیں۔ اس لیے کہ پہلا گروہ مصائب اور آفات سے ایسا ہی متلذذ ہوتا ہے جیسا کہ انعامات و احسانات سے لذت اٹھاتا ہے۔ دوسرا فرقہ نعمتوں سے مطمئن ہوتا ہے اور آفات و بلیات سے مضطرب و بے قرار ہوتا ہے۔ گو ان دونوں فرقوں میں فرق ہے لیکن خدائے تعالیٰ کی طرف سے دونوں کو نیکی کا وعدہ ہے۔ ''و کلاً وعد اللہ الحسنیٰ۔'' [تلک عشرہ کاملہ: ۷۰]

''پھر یہ بھی جاننا چاہیے کہ حبیب، حبیب کا حبیب اور حبیب کے دشمن کا دشمن حبیب ہوتا ہے۔ اور دشمن، حبیب کا دشمن اور حبیب کے دشمن کا حبیب دشمن ہوتا ہے۔ نیز حبیب کے اوامر و نواہی کو دوست رکھنا اس کی عین محبت ہے۔ اور اس کے اوامر و نواہی سے عداوت رکھنا عین دشمنی ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کی رعایت سالک کے لیے نہایت ضروری اور اہم بات ہے۔ یہاں سے وہ خدشہ بھی دفع ہو جاتا ہے جو بعض دلوں میں اکثر گزرا کرتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب ایک شخص خدا کی محبت کو اپنے دل میں جگہ دے گا تو اسے نبی ﷺ اور آپ کی آل پاک اور اپنے والدین، نیز بچوں اور پڑوسیوں وغیرہ کی محبت کیونکر حاصل ہو سکتی ہے حالانکہ یہ اقسام محبت وہ ہیں جن کی بابت احادیث و آثار ناطق ہیں۔'' [تلک عشرہ کاملہ: ۷۱۔۷۲]

اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ شاہ کلیم اللہ جہان آبادی نے اس موضوع پر صوفیہ کرام کے اقوال و تعلیمات کا بہتریں خلاصہ پیش کیا ہے۔ اس میں نمایاں بات یہ ہے کہ انہوں نے حب

الٰہی اور حب انسانی کے درمیان تفریق کو ملحوظ رکھا ہے۔ ساتھ ہی لفظ عشق اور اس کے استعمال کے سلسلے میں ان کا موقف یہ ہے کہ یہ لفظی اختلاف ہے اور اس کا تعلق اصطلاح سے ہے۔ کیوں کہ وہ جب عشق کو حق تعالی کے لیے استعمال کرتے ہیں تو اس کی تشریح وتعبیر اس انداز سے کرتے ہیں کہ عشق کے مفہوم میں بیان کیے جانے والے منفی لوازمات نہیں آتے۔

مرزا مظہر جان جاناں کے مرید وخلیفہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی سے کسی نے سوال کیا تھا:

''اکثر اولیا اللہ نے عشق کو محبت کا اعلیٰ مرتبہ لکھا ہے اور انہوں نے عشق کی مدح وثنا بہت کی ہیں۔ جب کہ امام غزالی علیہ الرحمہ نے کچھ حد تک عشق کی ہجو کی ہے اور حب (محبت) کو عشق پر ترجیح دی ہے۔ بعض نے محبت کے پانچ مراتب لکھے ہیں۔ الفت، مودت، محبت، عشق اور شفقت۔''

اس کے جواب میں حب اور عشق کی تعریف اور اس سلسلے میں اپنی تحقیق قاضی صاحب ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

''صاحب من! اللہ تعالی کے قول:

''ان کنتم تحبون الله فاتبعونی یحببکم الله'' کی تفسیر میں امام محی السنہ بغوی نے لکھا ہے کہ'' حب المؤمنین لله اتباعهم امره و اتیانهم طاعته و ا تغاؤهم مرضاته و حب الله للمؤمنین ثناؤه علیهم و ثوابه لهم''

درحقیقت یہ محبت کی تعریف نہیں ہے بلکہ یہ مقتضائے محبت ہے۔ تفسیر بیضاوی میں ہے:

''ان المحبة میل النفس الی الشئ بکمال ادراک فیه بحیث یحمله علی ما یقربه الیه''

درحقیقت یہ محبت صفاتی کی تعریف ہے، محبت ذاتی کی نہیں۔ فقیر کے نزدیک'' حب عبارت ست از اشتغال قلب محب بمحبوب بقسمی کہ باز دارد اور از توجہ بسوی غیر او۔ وچارہ نباشد اورا از توجہ دوام بسوی او۔ اور یہی معنی ہے ان کے قول کا کہ:

''العشق نار یحرق ما سوی المحبوب یعنی یقطع عن قلبه التوجه الی غیر المحبوب فیجعله نسیامنسیا کان لم یکن فی الوجود غیر محبوبه حتی

یسقط عن نظر بصیرتہ نفسہ کما لایری غیرہ"

اور محبت کی یہ تعریف بندہ کی ہے۔ حق تعالیٰ قلب اور اشتغال قلب سے منزہ ہے۔ اسی لیے حق تعالی کی محبت کا مطلب ہے انس ساذج (خالص انس) جو بندہ کو اپنی جانب جذب کرنے اور اس کو اپنے غیر کی طرف متوجہ نہ ہونے دینے کا مقتضی ہے۔ تو بندہ کی محبت خدا کی محبت کی فرع ہے۔ اسی لیے حق تعالی نے فرمایا ہے" **یحبھم و یحبونہ**" اس میں اللہ تعالی نے اپنی محبت کو بندہ کی محبت پر مقدم رکھا ہے۔ لفظ عشق کلام خدا میں نہیں آیا ہے۔ اور رسول اللہ کے کلام میں کم آیا ہے۔ کلام اللہ میں" **والذین امنوآ اشد حباًللہ**" آیا ہے اور" **اشد حباً**" عبارت ہے افراط محبت سے۔ لغت میں عشق کو بھی افراط محبت کہا گیا ہے۔ **کذا فی القاموس**۔

اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ قرآن میں عشق کا ذکر ہوا ہے۔ لیکن فقیر کے خیال میں اگر فرط محبت میں عقل پر محبت غالب آجائے اور عقل وحواس کو بے کار کر دے تو اس فرط محبت کو عشق کہتے ہیں نہ کہ مطلق فرط محبت کو۔ اسی لیے عشق میں سکر و مستی لازم ہے۔ اور یہ کیفیت تنگیٔ حوصلہ کی وجہ سے ہے۔ اگر حوصلہ وسیع اور استعداد عالی ہو تو جس قدر بھی محبت میں افراط ہو گی عقل اپنی جگہ رہے گی۔ اور حواس بے کار نہیں ہوں گے۔ لہذا حق سبحانہ تعالی پر" **یحبھم**" صادق آئے گا۔ **ودود** کا لفظ اسمائے الٰہی میں سے ہے جس کا معنی محبّ ہے۔ اللہ تعالی کے لیے عاشق کا لفظ استعمال کرنا صحیح نہیں کیونکہ محبت کا دوسرے صفات الٰہی کو بے کار کرنا محال ہے۔ **ولا یغنیہ شان عن شان** ۔ نیز انبیاے عظام، صحابہ کرام اور ائمۂ اہل سنت اور بعض اولیاے امت جن کا حوصلہ وسیع اور استعداد عالی ہے ان کی محبت اگرچہ اشد واقوی ہے مگر ان کی عقل وحواس کو درہم برہم نہیں کرتی ہے اور نہ ہی سکر دامن گیر ہوتا ہے۔ بیچارہ منصور تنگیٔ حوصلہ سے بے خود ہو گیا اور" **انا الحق**" پکار اٹھا۔ اور سرور عالم ﷺ سوائے" **سبحانک ما عرفناک حق معرفتک و ما عبدناک حق عبادتک**" کے لب نہیں کھولے۔ اسی لیے انبیاے کرام خلیل اللہ، صفی اللہ اور حبیب اللہ کے لقب سے موسوم ہوئے۔ عاشق اللہ کے نام موسوم نہیں ہوئے۔

مگر اولیاء اللہ نے عشق کی مدح وستائش کی ہے اور عشق کو حب کا اعلیٰ مرتبہ کہا ہے۔ یہ بھی بجا ہے کہ عشق فرط محبت سے عبارت ہے۔ اور فرط محبت الٰہی نفس محبت الٰہی سے اولیٰ واعلیٰ

ہے۔ اسی لیے مولوی روم فرماتے ہیں۔ مثنوی

ہرچہ گویم عشق ازاں بر تر بود
عشق امیر المؤمنین حیدر بود

رہ گئی یہ بات کہ امام حجۃ الاسلام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے عشق کی اتنی تعریف و مدح نہیں کی ہے اور ان کے قول سے ایک حد تک ہجو کا مفہوم نکلتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس مقام پر ان کی نظر سکر پر ہے جو لوازم عشق سے ہے۔ یہ تنگیِ حوصلہ کی خبر دیتا ہے۔ ورنہ فرط محبت خدا سراسر ممدوح ہے۔ لیکن اگر صحو کے ساتھ ہو تو وہ عشق سے بھی بہتر ہے۔

مشفقا در راہِ خدا جملہ ادب باید بود
تا جان باقیست در طلب باید بود
دریا دریا اگر بکامت ریزند
کم باید کرد و خشک لب باید بود

فرط محبت کا مقتضی یہ ہے کہ خدا کے حکم کو اپنی طبیعت کے مقتضیات پر مقدم رکھے۔ لیکن اگر فرط محبت کے ساتھ سکر و مستی بھی ہو تو عذاب کا خوف اور ثواب کی امید نہیں رہتی۔ شغاف دل کے اوپر کے غلاف کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالی کا قول ہے ''قد شغفها حباً''۔ شغف کی ضمیر مرفوع یوسف کی طرف راجع ہے۔ اور ''حبا'' نسبت سے تمیز ہے۔ یعنی'' قد شغف حب یوسف زلیخا'' یعنی یوسف کی محبت زلیخا کے دل کے پردے کو چاک کر کے اس دل کے اندر جاگزیں ہوگئی۔ مثلاً طاب زید علما یعنی طاب علم زید۔ لیکن اس میں ایہام نسبت و تمیز مبالغہ ہے۔ اس لیے شغف محبت کے مراتب میں سے کوئی مرتبہ نہیں ہے۔ اور کسی نے جو تعلق خاطر کو پانچ نام دیا ہے تو یہ اصطلاح ہے۔ اور ''لا مشاحة فی الاصطلاح، درحقیقت محبت کے کئی مراتب ہیں۔'' [کلمات طیبات، مکتوبات قاضی صاحب، ص: ۱۴۵۔۱۴۸]

اس طرح سے قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے بھی صوفیہ کے تصور محبت میں جو تشریح پیش کی ہے اس میں حب الہی اور حب انسانی کے فرق کو ملحوظ نظر رکھا ہے۔ ان کے خیال میں اس سیاق و سباق میں جب عشق کا استعمال ہوتا ہے تو اس لفظ کا معنی مختلف ہوگا۔ تاہم چوں کہ وہ سلسلۂ

نقشبندیہ کی مجددی شاخ سے تعلق رکھتے تھے اسی لیے وہ یہ بھی کہتے ہیں افراط محبت میں سکر و مستی نہ ہو۔ کیوں کہ وہ اس صورت میں محبت عقل پر غالب آجائے گی۔ اور یہ کیفیت تنگیِ حوصلہ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر حوصلہ وسیع اور استعداد عالی ہو تو جس قدر بھی محبت میں افراط ہوگی عقل اپنے جگہ رہے گی اور حواس بے کار نہیں ہوں گے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی نے ''الطاف القدس فی معرفۃ لطائف النفس'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف فرمائی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں خود مصنف بیان فرماتے ہیں:

''یہ چند اوراق ہیں جن کا نام ''الطاف القدس فی معرفۃ لطائف النفس'' رکھا گیا ہے۔ اور ان میں میں قلب، عقل، نفس، روح، سر، خفی، اخفی، حجر بحت، اور انا کی حقیقت اور ان سب کی تہذیب و شائستگی کے طریقے بیان کیے گئے ہیں۔ اور اس مقالہ کا مقصد یہ ہے کہ خالص مسائل وجدانیہ و کشفیہ لکھے جائیں اور علوم فکریہ اور نقلیہ کو ان میں کوئی دخل نہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ ہماری بات کا ضامن ہے۔'' [الطاف القدس فی معرفۃ لطائف النفس:۱۔۲]

اس رسالے میں شاہ ولی اللہ دہلوی نے اگر چہ محبت اور عشق کے عنوان پر الگ سے کوئی باب قائم نہیں کیا ہے مگر لطائف پر ان کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے عشق کو دو خانوں میں رکھ کر اس کی تفصیلات بیان کی ہیں شاہ ولی اللہ نے ان لطائف کی تہذیب کے تین طریقے بیان کیے ہیں۔ حکمت اخلاق، شریعت (طب روحانی) اور معرفت و طریقت۔ حکمت اخلاق کے تحت لطائف ثلثہ بارزہ (قلب، عقل اور نفس) کی تہذیب کے زیر عنوان وہ کہتے ہیں:

''جب قلب و عقل نفس کے تابع ہو جاتے ہیں تو کئی قسم کے برے اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔ اجمالاً اس کو نفس بھیمہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً جماع سے لذت حاصل کرنا، یا نظر و لمس سے لطف اندوزی۔ ایسے امور قلب کو اپنا تابع بنا لیتے ہیں۔ اس کی محبت اور اس کی طرف کلی میلان قلب میں القا کرتے ہیں۔ پھر عقل کو صورتِ محبوب کے تصور، اس کی یاد اور اس کے وصال کے طریقوں پر غور و فکر کا حکم کرتے ہیں۔ انہی چیزوں کے مجموعے کا نام عشق ہے۔ اسی طرح کھانے پینے کی لذتیں قلبی و عقلی قوتوں کو اپنے تابع بنا لیتی ہیں۔ ان صورتوں کو انسان ذرا سی توجہ سے پہچان سکتا ہے۔'' [الطاف القدس، مطبع احمدی ۱۳۰۵ھ ص:۱۱۔۱۲]

دراصل شاہ ولی اللہ دہلوی نے لطیفۂ نفس کے تحت جس عشق کا بیان کیا ہے، اس کا تعلق انسانی محبت سے ہے اور مرد و عورت کے درمیان بہ تقاضائے شہوت جو رشتہ قائم ہوتا ہے، اس کی کیفیت کو انہوں نے عشق کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کو ہوس اور ہوئی بھی کہتے ہیں۔ لیکن صوفیہ کرام جس محبت و عشق کی بات کرتے ہیں اس کو انہوں نے دیگر لطائف سے متعلق قرار دیا ہے۔ معرفت و طریقت کے اعتبار سے لطائف کی تہذیب کے تحت شاہ ولی اللہ نے پانچ اقسام بیان کیے ہیں۔ نفس، قلب، عقل، روح اور سر۔ یہاں وہ روح کو قلب کے اعلیٰ ترین مقام اور سر کو عقل کے اعلیٰ ترین مقام کے طور پر شمار کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ صوفیہ کے تصور محبت کو لطیفۂ قلب اور لطیفۂ روح کے ضمن میں بیان کرتے ہیں۔

چناں چہ لطیفۂ قلب کے مقامات اصلی کے بیان میں وہ محبت شعائر اللہ کو ذکر کرتے ہیں:

"قلب کی جبلت دوستوں سے وفا اور ان کے آئین کو لازم پکڑنا ہے۔ اور اس اعتبار سے (قلب) کی تہذیب کا اثر تقویٰ اور شعائر اللہ کی محبت ہے۔

[الطاف القدس، مطبع احمدی ۱۳۰۵ھ ص:۲۶]

"شعائر اللہ کی محبت عبارت ہے قرآن، پیغامبر اور کعبہ کی محبت سے۔ بلکہ ہر اس چیز کی محبت جو خدا سے منتسب ہو۔ یہاں تک کہ اولیا اللہ سے محبت بھی شعائر اللہ کی محبت میں شامل ہے۔ اس کو بعض حضرات فنا فی الرسول یا فنا فی الشیخ کہتے ہیں۔"

[الطاف القدس، مطبع احمدی ۱۳۰۵ھ ص:۳۰]

اس کے بعد لطیفۂ روح سے متعلق مقامات کے ذیل میں وہ رقم طراز ہیں:

"جاننا چاہیے کہ روح کی اصولی طور پر دو صفتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ حظیرۃ القدس کے وسط میں قائم تجلی اعظم کی طرف منجذب ہوتی ہے۔ اس تجلی کے قابل (مقابل) نفس کلیہ سے چمٹ جاتی ہے۔ اور وہاں سے اس پر اطمینان اور بے کیف آرام کا فیضان ہوتا ہے۔ یہ صفت روح کے بلند مراتب میں سے ہے۔ اور اپنے مقر اصلی کی طرف اس کی غایت حرکت ہے۔ دوسری صفت اس کا ارواح طیبہ اور ملأ اعلیٰ کے ساتھ جمع ہونا اور ان کی طرف کھنچنا ہے۔ اس صفت کا اثر یہ ہے کہ ان سے اس طرح اثر قبول کرتی ہے جس طرح موم اس انگوٹھی کا اثر قبول کرتی ہے جو اس پر

رکھی جاتی ہے۔ انگوٹھی کے نقوش موم کے جسم پر چھپ جاتے ہیں۔ یہ اثر اصل میں ایک اجمالی امر ہے جس میں احوال و اوقات کے تقاضوں کے مطابق مختلف آثار کی طرف وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ کبھی باہمی مخاطبت کا سلسلہ ہوتا ہے اور اس کا سبب عقل کی مبادرت ہے۔ اور کبھی واردات کا سلسلہ ہوتا ہے اور اس کا سبب قلب کی پیش دستی ہے۔ یہ صفت مراتب روح کے پست ترین مراتب میں سے ہے۔ اور اس کا منشا اس کا اپنے منازلِ اعلیٰ سے پیچھے رہ جانا ہے۔ یہ بعض آلائشوں کی وجہ سے ہوتا ہے جن میں طبیعت ملوث ہو جاتی ہے۔

الغرض یہ انجذاب تجلی اعظم کی نسبت سے ہو یا ملأ اعلیٰ کی نسبت سے اس کی تعبیر محبت خاصہ سے کی جاتی ہے۔ اور یہ محبت ایمان کے علاوہ ہے جس کا منشا عقائد حقہ پر عمل کا جزم اور ان عقائد پر قلب کا عقل کے تابع ہونا ہے۔ اور یہ محبت اس شوق وگرمی کے علاوہ ہے جس کا منشا قلب کا مقولۂ وجد کے کسی حال سے متصف ہونا جیسے حال قلق وشورش۔ بلکہ محبت خاصہ تو زمین کے اپنے مرکز کی طرف میلان کی طرح یا ہوا کے اپنے مقر کی طرف میلان کے مانند ہے۔ اہل عقل جانتے ہیں کہ یہ میلان ایک چیز ہے جو دو شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ فراق کے وقت یہ شوق وحرکت سے متمثل ہوتی ہے اور وصال کے حال میں اطمینان وسکون کی صورت میں متصور ہوتی ہے۔ پس محبت خاصہ یہی میلان ہے۔ اطمینان وسکون کے ساتھ متشبح ہونے کے اعتبار سے۔ اس کا منشا وہ جذب ہے جو بنی آدم کی ارواح کی نسبت سے تجلی اعظم میں موجود ہے اور وہ انجذاب ہے جو اس تجلی اعظم کی بہ نسبت طبائع ارواح میں ودیعت کیا گیا ہے۔ اس جذب وانجذاب کی مثال اس نسبت کی ہے جو مقناطیس اور لوہے میں ہے۔ پس محبت خاصہ تجلی اعظم کے ساتھ پیوستگی، نزدیکی، ہم آغوشی (تنگ وزیر گرفتن) اور ان جیسے معانی سے شعلہ ہائے الفت کا التہاب ہے

بلبلے برگ گلے خوش رنگ در منقار داشت
واندراں برگ ونوا صد نالہائے زار داشت
گفتمش در عین وصل ایں نالہ وفریاد چیست
گفت مارا جلوۂ معشوق دراں کار داشت"

[الطاف القدس، مطبع احمدی ۱۳۰۵ھ ص: ۳۴-۳۳]

اس سلسلے میں یہ وضاحت مناسب رہے گی کہ معرفت اور طریقت کے اعتبار سے لطائف کی تہذیب کے تحت شاہ ولی اللہ نے یہاں جس لطیفۂ روح کا ذکر کیا ہے وہ اس روح سے مختلف ہے جس کو انہوں نے اس کتاب کے آغاز میں ذکر کیا ہے۔ وہاں انہوں نے اس روح کے تین اجزا گنائے ہیں۔ روح ہوائی (نسمہ)، نفس ناطقہ اور روح ملکوت۔ یہاں جس لطیفۂ روح کی بات کر رہے ہیں ان کی توضیح کے مطابق دراصل لطیفۂ قلب ہے جو احکام سفلیہ کو ترک کر چکا ہے اور روح ملکوت اور نفس ناطقہ کی مشابہت اس پر غالب آ گئی ہے۔

اس طرح سے شاہ ولی اللہ نے صوفیہ کرام کے تصور محبت کو قلب یا اس کے اعلیٰ ترین مقام روح سے منسوب کیا ہے۔ اس محبت کا تعلق نفس سے نہیں ہے بلکہ یہ محبت تو شاہ ولی اللہ کے مطابق توبہ اور زہد کے ذریعے نفس کی تہذیب کے تہذیب قلب کا ثمرہ ہے۔ تاہم لطیفۂ روح سے متعلق جس ''محبت خاصہ'' کی وہ بات کرتے ہیں اس کا تعلق نہ عقل سے ہے اور نہ ہی قلب سے۔ بلکہ یہ محبت تجلی اعظم یا ملأ اعلیٰ اور روح کے درمیان جذب و انجذاب کی کیفیت کا نام ہے۔ اس میں روح کی حالت کے اعتبار سے کبھی شوق و حرکت ہے تو کبھی اطمینان و سکون۔ اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ نے صوفیہ کے تصور محبت میں روح کی مختلف حالتوں کا اعتبار کیا ہے۔ اسی لیے ایک ہی کیفیت کی دونوں حالتوں کو بیان کر دیا ہے۔ دراصل شاہ ولی اللہ کے مطابق لطائف کی قوت وضعف کے اعتبار سے افراد مختلف ہوتے ہیں۔'' وہ لکھتے ہیں کہ:

''صوفیہ نے فنا و بقا کے بارے میں بہت بحث کی ہیں۔ تاہم نص یا اجتہاد سے انہوں نے اس کی توضیح نہیں کی۔ اس کے بارے میں جو اس فقیر (شاہ ولی اللہ) نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ جوارح اور ان لطائف میں سے ہر ایک اپنی اپنی جدا الگ حکم رکھتا ہے۔ اور جس وقت یہ آپس میں مل جائیں تو دو حال سے خالی نہ ہوں گے۔ یا ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ باہم پارے میں پانی اور چاندی یا کمان میں لکڑی اور سینگ کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ متصل اور مدغم ہوں گے یا ان میں سے ہر ایک اپنے حکم میں مستقل ہوگا۔ البتہ جسم کی ترکیبی ضرورت کے مطابق دوسرے کی امداد کرے گا۔ حالت اول میں غلبہ، سکر، محو اور وجد پیدا ہوں گے۔ اور دوسری صورت میں صحو، تمکین اور استقامت حاصل ہوگی۔ اور لوگوں میں سب سے بڑا اور عظیم وہی آدمی ہے جو تمکین

خالص کا مالک ہے اور جس کا ہر لطیفہ اپنے حال میں مستقل ہے۔'' [الطاف القدس، ص:۳۶]

اس طرح سے شاہ ولی اللہ نے صوفیہ کرام کے تصور محبت میں شوق، گرمی، اضطراب اور اطمیان وسکون کو محبت کی مختلف حالات اور کیفیات سے منسوب کیا ہے۔ جو لطائف کے باہمی تعلقات کی نوعیت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

اس کے برخلاف ہم آگے دیکھیں گے کہ شاہ محمد اسماعیل نے ان دونوں حالتوں کو بنیاد بنا کر محبت کی دو قسمیں کی ہیں۔ شوق وحرکت، شورش وقلق اور اضطراب و بے قراری کی کیفیت کو حب عشقی اور حب نفسانی کا نام دیا ہے جب کہ اطمینان وسکون کی کیفیت کو وہ حب ایمانی اور حب عقلی کا نام دیتے ہیں۔ دراصل شاہ ولی اللہ نے راہِ طریقت میں طالب جن حالات، مقامات اور واردات کا تجربہ کرتا ہے ان کو اپنے بیان میں مختلف لطائف سے منسوب کیا ہے۔ اس طرح سے وہ مختلف سلاسل کے اشغال، اذکار اور اوراد میں تطبیق دینے میں کامیاب ہوئے جو ان کا مقصد تھا۔ جب کہ شاہ محمد اسماعیل دہلوی کا مقصد طریقۂ محمدیہ کو امتیازی شناخت دینا تھا۔ اسی لیے اس نے صوفیہ کرام کے تصور محبت کی تشریح وتعبیر میں کیفیتِ محبت کی مختلف حالتوں کو بنیاد بنا کر حب عشقی / حب نفسانی کو راہِ ولایت سے منسوب کیا اور حب ایمانی / اور حب عقلی کو راہِ نبوت کا ثمرہ بتایا ہے۔ آئندہ سطور شاہ محمد اسماعیل دہلوی کی تشریح وتعبیر پر گفتگو ہے۔

شاہ محمد اسماعیل دہلوی نے اپنی کتاب ''صراط مستقیم'' میں جسے وہ سید احمد رائے بریلوی کے ملفوظات کی شکل میں پیش کرتے ہیں، صوفیہ کرام کے تصور محبت پر تفصیل سے کلام کیا ہے۔ اس کی وجہ وہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''افادہ۔ جاننا چاہیے کہ شریعت وطریقت کا ثمرہ اور حقیقت ومعرفت کی اساس محبت حضرت حق کی تحصیل ہے۔ چناں چہ'' من کان اللہ و رسولہ احب الیہ مماسواہ'' اس کی تصریح ہے اور'' والذین امنوا اشد حبا '' اس کی تلویح ہے۔ اس مسئلہ پر اگرچہ صوفیہ کرام کا اجماع اور عام لوگوں کا اتفاق ہے۔ مگر اس مقام پر ایک نکتہ ہے کہ اکثر اہل زمان غفلت اور نسیان میں ہیں۔ اور وہ نکتہ حب نفسانی جسے عشق کے لقب سے جانا جاتا ہے اور حب ایمانی جو حب عقلی سے مشہور ہے، ان دونوں کے درمیان فرق وامتیاز ہے۔ اس لیے کہ اول الذکر سلوک

کے مبادی کی واردات سے ہے۔ جب کہ ثانی الذکر انبیاے کرام کے کمالات اور اولیاے عظام کے مقامات سے ہے۔ اکثر عوام صوفیہ اول کو ثانی جگہ رکھ کر اور اشارات شرعیہ کا مشار الیہ مان کر انبیا و اولیا کی سیر کو اہل عشق و مواجید کے احوال کے ساتھ تطبیق دینے میں بے حاصل تشویشات لاتے ہیں۔ حالاں کہ کے ان بزرگواروں کی ان سالکوں کی واردات سے ذرا سی مطابقت نہیں ہے۔" [صراط مستقیم، فارسی، ص:۴۔۵]

شاہ محمد اسماعیل دہلوی حب عشقی کو راہِ ولایت سے اور حب ایمانی کو راہِ نبوت سے منسوب کرتے ہیں۔ پھر وہ حب اور عشق کے درمیان تفریق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عشق سے مراد وہ قلق و شورش ہے جو انسان کے باطن میں مقصود کی عدم موجودگی (فقد) کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور تمام قوای باطنہ میں سرایت کر جاتی ہے۔ اس کی غایت اس مقصود کو پانا اور اس محبوب کا وصال ہے۔ اولاً اس کا موقع قلب ہے، جو جمیع کیفیات نفسانیہ کی محل ہے اور ثانیاً سارے قوای باطنہ ہیں۔ اس کی غایت محبوب کو پانے میں طالب کا اضمحلال واز خود رفتگی ہے۔ اس کے بعد جب یہ غایت حاصل ہو جاتی ہے تو اس قلق و اضطراب کی شورش دور ہو جاتی ہے اور وہ کیفیت جس کا نام عشق ہے زائل ہو جاتی ہے۔

حب عقلی سے مراد کسی چیز کی طلب کے داعیہ کا اس طرح پیدا ہونا ہے کہ طالب اس کے فوائد و منافع اور اس کی جانب اپنی احتیاج پر مطلع ہوتا ہے۔ یہ داعیہ طریقِ طلب کی مشقت کو برداشت کرنا اس (طالب) کے لیے آسان کر دیتا ہے۔ اس سبب سے وہ اس کی طلب میں کمر ہمت کستا ہے اور ہر حیلہ جو اپنی کیسۂ فکر میں رکھتا ہے اس کی طلب میں لگاتا ہے اور اپنے سارے سروسامان کو چھوڑ دیتا ہے۔ یہ سب کچھ وہ اختیاراً کرتا ہے نہ کہ اضطراراً۔ اس داعیہ کی جگہ (موقع) اولاً عقل ہے جو خزانۂ معلومات ہے اور ثانیاً وہ سارے قوای باطنہ میں سرایت کر جاتا ہے۔ جس طرح پانی درخت کی جڑ سے برگ و ثمر تک پہنچتا ہے۔ پھر عقل میں بہت سے ایسے افکار و انظار ہوتے ہیں جن کو وہ اس کی تحصیل کے لیے درست کرتا ہے اور قلب میں بہت سے ایسے عزائم و ہمتیں ہیں جو اس کی طلب میں پیدا ہوتی ہیں۔ اور اس کے (حصول) کے راستے کے سلوک میں بہت سی مشقتیں اور چیزوں کے ترک کو اپنے جوارح پر پسند کرنے لگتا ہے۔ چوں کہ حب اول (حب

نفسانی رحب عشقی) کا نتیجہ فنائے علم ہے۔ یعنی غیبت اور محبوب کے ماسوای کا عدم شہود۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آپ (نفس) سے (بے خبر ہو جاتا ہے)۔ اسی طرح حب ثانی کا ثمرہ فنائے ہمت ہے یعنی جو کچھ وہ کہتا ہے محبوب کی طرف سے کہتا ہے اور جو کچھ وہ سنتا ہے محبوب کی طرف سے سنتا ہے۔ اور ہر فکر و نظر جس کا نتیجہ محبوب کی تحصیل اور اس کے راستے کے سلوک کے علاوہ ہو اس کے نزدیک وہ وساوس کے قبیل سے ہے جن کا کوئی اعتبار نہیں۔ اور ہر حب و بغض اور پسند و ناپسند (استحسان و کراہت) جو محبوب کے مناسب مخالف (ملائم و منافر) ہو اور اس کا راستہ نہ ہو وہ عوارض کے قبیل سے ہے جس کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ خلاصہ یہ کہ محبوب کی تحصیل کا داعیہ اور اس کے راستے کی تمہید طالب کے ظاہر و باطن کو اپنی حکومت و فرماں روائی کے زیر اثر لاتی ہے۔ حب اول کے بر خلاف کیوں کہ اس میں محبّ کے تمام باطن کا امتلا اس کے تحقق کی شرط نہیں بن سکتا۔ کیوں کہ بہت بار ایسا ہوتا ہے کہ کسی چیز کا عشق اس کے بغض عقلی کے ساتھ جمع ہو جاتا ہے۔ (لا سیما عند التعارض بین الحبین)۔ مثال کے طور پر ایک دیندار اور والدین کا فرمانبردار نوجوان کسی عورت یا امرد کے عشق میں مبتلا ہوتا ہے۔ شریعت یا والدین جو اس کے نزدیک حب عقلی کے اعتبار سے محبوب ہیں چاہے جتنا اسے روکیں اور چاہے وہ سعادت مند اس معشوق بلکہ اس کے عشق کو اپنے صمیم عقل سے مکروہ و مبغوض سمجھے مگر اپنی طبیعت کے اعتبار سے اس کا مغلوب ہو جاتا ہے۔ رہ گئی حب ثانی کی بات تو یہ ہے کہ اس کا مقر اصلی عقل ہے۔ اس جگہ اس کے لشکر (جنود) اس کے قوای طبعیہ میں پہنچ کر محبّ کے تمام باطن کو اس طرح مسخر کر لیتے ہیں کہ معارض کو اس میں کوئی راستہ نہیں ملتا ہے۔ جس طرح حب اول محبوب کے پا لینے کے بعد زائل ہو جاتی ہے۔ اس کا شعلہ بجھ جاتا ہے۔ اسی طرح حب ثانی محبوب کے وصال سے زیادہ ہوتی ہے۔ ایک سے ہزار ہوتی ہے۔ اور اتنی وسعت پکڑتی ہے کہ ہجر میں وہ قوت و وسعت متصور نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اول کی بنیاد نہ ہونے (فقد) پر تھی اور ہجر سے مشروط تھی۔ و اذا فات الشرط فات المشروط۔ جب کہ ثانی کی بنیاد محبوب کے فوائد و منافع کے علم، اس کے کمالات کے جاننے اور اس کی جانب احتیاج پر تھی۔ اور یہ معنی وصال میں اور واضح تر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ علم الیقین عین الیقن سے بدل جاتا ہے۔ جب یہ مقدمہ ذہن نشین ہو گیا تو جاننا چاہیے کہ حق جل وعلا

اپنے بعض خاص بندگان کو، جن کے نصیب میں ازلی سعادت تھی، چن کر محض اپنی عنایت و کرم سے محبت کی دونوں نوعوں میں سے ایک نوع یا دونوں نوعوں سے اپنی نسبت کے تعلق سے ہدایت کرتا ہے۔اوران کواس دوجہانی سعادت کی توفیق دیتا ہے۔اس کے ثمرات ونتائج سے ان کو قابل فخر ومباہات بناتا ہے۔و ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ان دونوں نوعوں میں ہر ایک کے لیے اسباب ومؤیدات اور آثار وثمرات ہیں جواس نوع کے ساتھ مختص ہیں۔چونکہ راہ حق کا طالب محبت کی ان دونوں نوعوں میں ہر ایک کو دوسرے سے ممتاز اور الگ جانتا ہے۔لہذا ان امورار بعہ کو وجوہ تمایز فیما بین النوعین کا نام دیا جاتا ہے۔'' [صراط ص:۴۰۔۷]

شاہ محمد اسماعیل دہلوی نے اگر چہ اس تفصیلی بحث کی وجہ ان ''بے حاصل تشویشات'' کو بتایا ہے جو''عوام صوفیہ'' کے حب عقلی اور حب نفسانی کے درمیان امتیاز نہ کرنے کے سبب پیدا ہوئی ہیں اور اقتباس کے آخری حصہ کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے، کہ وہ محبت کی دونوں اقسام کو درست قرار دیتے ہیں۔لیکن ان دونوں کے اسباب ومؤیدات اور آثار وثمرات جن کو وہ'' وجوہ تمایز فیما بین النوعین '' کا نام دیتے ہیں اگر ان کا بغور تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دیگر جملہ سلاسل کے مشائخ کی تغلیط کرتے ہیں اور اپنے پیر و مرشد کے سلسلہ یعنی طریقۂ محمدیہ کو دیگر سلسلوں سے ممتاز دیکھنا چاہتے ہیں۔محبت کی یہ دواقسام اور عقل کے ساتھ نفس کو بھی صوفیہ کرام کے نظریۂ محبت میں شامل کر کے وہ دراصل اپنی تحریک کے ایجنڈے کو عوام میں مقبول بنانے کی کوشش کررہے تھے۔اس کی وضاحت اس وقت ہوتی ہے جب ہم اسی کتاب کے باب اول میں ''وجوہ تمایز فیما بین النوعین'' کے تحت جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں اور کتاب مذکور کے باب دوم کے فصل اول میں محمد شاہ اسماعیل دہلوی کے بقول ''صوفیہ کبار سے تشبہ رکھنے والے صوفی شعار ملحدین ومشرکین کے اختلاط کی وجہ سے عوام اہل اسلام میں پھیلی بدعات'' کو پڑھتے ہیں۔

شاہ محمد اسماعیل دہلوی کے مطابق طریق ولایت میں ذکر وفکر، حب عشقی کی تحصیل کے اسباب ہیں۔جہری ذکر سے دفع وساوس، جمعیت خاطر اور ترقیق ارواح کا کام ہوتا ہے۔جب کہ ذکر خفی میں لفظ کی مدد سے حلاوت کا وجدان اور خلوت، سکوت، اور لوگوں کے ساتھ مخالطت اور مکالمت سے نفرت اور لذت جیسی چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔اللہ تعالیٰ کے نام کے ذکر کی وجہ سے

سالک کی روح جو لطیف ترین جز ہے، اپنی اصل سے ملنا چاہتی ہے اور روح الٰہی، جس کے بارے میں کہا گیا کہ ''قل الروح من امر ربی''، مشت خاک میں محبوبیت کی وجہ سے اپنی اصل کو فراموش کر چکی ہوتی ہے اور اس کے آئینہ ادراک میں زنگ لگ جاتا ہے۔ جب ''اللہ'' کے اسم کے ذکر کی برکت سے وہ مصقل ہو جاتی ہے تو تجلی حق کا جذب اور اس روح کا انجذاب حظیرۃ القدس کا اقتضا کرتا ہے۔ اس وقت بشریت کا غبار اس سے مانع ہوتا ہے اور روحانی اور نفسانی تقاضوں کے مابین مزاحمت شروع ہوتی ہے۔ اس سبب سے نسمہ جسے روح طبی کا نام بھی دیا جاتا ہے میں شورش، غلغلہ اور گرمی پیدا ہوتی ہے۔ یہ کیفیت طالب کو دیوانہ وار اور مستانہ شعار بنا دیتی ہے۔ اس کی عقل و فکر کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ اور وہ قانون شرع و ادب کا پاس و لحاظ نہیں کرتا۔ بیابانوں اور میدانوں کا رخ کرتا ہے۔ گھر اور مجلس سے وحشت محسوس کرتا ہے۔ آہ و فغاں کرتا ہے۔ اس کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے اور اس کی آنکھوں سے اشک رواں ہوتے ہیں۔ اسی کیفیت کا نام عشق ہے۔ چوں کہ اس کیفیت کا حاصل روح حیوانی ہے اس کو حب نفسانی کا نام دیا گیا ہے۔ یہ کیفیت بڑھتی رہتی ہے یہاں تک کہ حجاب بشریہ منخرق ہو جاتے ہیں اور غبار نفسانیہ پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ اس وقت اس حب کا ثمرہ مترتب ہوتا ہے۔'' [صراط: ۸۔۹ ملخصاً]

شاہ محمد اسماعیل مزید لکھتے ہیں کہ حب عشقی کے مؤیدات میں سے تقلیل منام و کلام و صحبت با انام ہے۔ کیوں کہ روح حیوانی کو اس کی وجہ سے لطافت حاصل ہوتی ہے۔ اور روح حیوانی جس قدر رقیق ہو گی غلغلہ، شورش اور گرمی اتنی ہی تیز تر ہو گی۔ حب عشقی کے مؤیدات میں سے اچھی لحن، دلکش آواز، شوق آمیز قصے اور عشق انگیز اشعار کو سننا بھی ہے۔ حب عشقی کے مؤیدات میں سے نیند کی کثرت اور کثیف (بھاری) غذا جیسی چیزوں سے احتراز کرنا ہے۔ اس لیے کہ ان سے روح طبی میں کثافت پیدا ہوتی ہے۔ شاہ محمد اسماعیل دہلوی کے مطابق حب عشقی کے آثار میں سے اس حب کا اقتضا حجاب بشری کا انخراق (پھٹنا) اور روح الہی کا اپنی اصل سے ملنا ہے۔ اس میں نہ قانون شرع اور نہ قانون ادب کی، نہ محبوب اور نہ غیر محبوب کی رضا و خوشنودی کی مطابقت اور نہ کسی کی متابعت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اگر اس حالت والے کو یہ گمان ہو کہ اس کا مقصود مزامیر کے سننے، عشق مجازی، شغل برزخ، اور ان جیسے شرعاً ممنوع امور اور اوقات کو اذکار و

طاعات میں مشغول رکھنے سے حاصل ہوگا تو وہ اپنے صمیم قلب سے ان امور کی طرف مائل ہو گا۔تاہم شاہ محمد اسماعیل دہلوی نے یہ وضاحت کی ہے کہ اس کلام سے مقصد حاشا و کلا حب عقلی کی اہانت نہیں ہے بلکہ اس فرق کی طرف اشارہ کرنا ہے جو حب عشقی اور حب عقلی کے مابین ہے۔[صراط:۱۰۔۱۱] حب عشقی کے آثار میں سے تفرد بھی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ محبوب کے ماسوای سے اس طرح سے قطع تعلق کرنا کہ انسان مختلف مشاغل، زیادہ تعلقات کے ہجوم، متفرق امور کی ترتیب مثلاً گھر بار کو سنبھالنے (سیاست منزل)، سیاست مدنی، جماعت کی امامت، عیدوں اور جمعہ کی نمازوں کو قائم کرنے، اور اہل قرابت کے حقوق کی ادائیگی کرنے میں تنگ حوصلہ ہوتا ہے۔اس لیے ایسے شخص کو شادی سے جو کہ جملہ تعلقات کی اصل ہے وحشت و نفرت ہوتی ہے۔حب عشقی کے آثار میں سے استقلالاً مرشد کے ساتھ قلب کی شدت تعلق ہے۔یہ تعلق اس حیثیت سے نہیں ہے کہ مرشد حق تعالی کی طرف سے ملنے والے فیض کا ذریعہ اور اس کی ہدایت کا واسطہ ہے بلکہ اس میں مرشد ہی سے عشق متعلق ہو جاتا ہے۔علاوہ ازیں اس عشق کے آثار میں سے علوم اور طاعات ظاہرہ سے بے اعتنائی ہے۔کیوں کہ ان میں نظم و ترتیب کی ضرورت ہے جو صاحب عشق کے کاروبار کے لیے پریشانی کا باعث ہے۔یہ ظاہر شرع اور باطن شرع کے مابین جو علاقہ (تعلق) ہے اس سے بھی آگاہ نہیں ہو پاتا۔[صراط:۱۱]

اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ حب عشقی کے اسباب، مؤیدات اور آثار کے بیان میں شاہ محمد اسماعیل دہلوی نے جن امور کو شمار کیا ہے ان میں سے زیادہ تر وہ ہیں جن کو وہ خلاف شرع قرار دیتے ہیں۔اس سے ان سارے سلاسل کی تغلیط ہوتی ہے جو طالب اور سالک کو ان کی تعلیم دیتے ہیں۔تاہم جب وہ اس حب عشقی کے ثمرات کو بیان کرتے ہیں تو ان کے بیان میں تضادات سامنے آجاتے ہیں۔

حب عشقی کے ثمرات کے بیان میں شاہ محمد اسماعیل دہلوی لکھتے ہیں کہ:

''کیفیت عشقیہ کی شدت وحدت، تجلی علمی کی قوت اور روح الٰہی کے کمال انجذاب کی وجہ سے غبار شہادت و مثال منکشف ہو جاتے ہیں اور نورانی و ظلمانی حجابات دور ہو جاتے ہیں۔اس کے نتیجے میں حضرت ذوالجلال کے جمال لایزال کا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے اور قرب و معیت کا

معنی، جس کی تعبیر وصال سے بھی کی جاتی ہے، واضح ہو جاتا ہے۔ اور ہجر و حرمان کے وقت جو بے تابی اور قلق و اضطراب تھے وہ ختم ہو جاتے ہیں اور اس کی جگہ سرور و ابتہاج اور مکالمہ و مسامرہ کی خلعت ہاتھ آتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ سراسیمگی الفت میں اور وحشت انس میں بدل جاتی ہے۔ اس کے بعد مقام فنا و بقا پردۂ اختفا سے نکل آتے ہیں۔ اس وقت رحمانی جذب و کشش کی موجیں طالب کے نفس کاملہ کو بحر احدیت کی لہروں کی گہرائی کی طرف کھینچتی ہے۔ "انا الحق" اور "لیس فی جبیی سوی اللہ" کا زمزمہ اس سے سرزد ہوتا ہے۔ اسی سلسلے میں آیا ہے:

"کنت سمعه الذی یسمعه به و بصره الذی یبصر به و یده التی یبطش بها و رجله التی یمشی بها"

اور ایک روایت میں "و لسانه الذی یتکلم به" آیا ہے۔ یہ ایک باریک مقام اور نازک مسئلہ ہے۔ اس کے بارے میں نیک گمان رکھنا چاہیے اور تفصیل کو دوسرے مقام پر چھوڑنا چاہیے۔

ورآء ذاک فلآ اقول لانه

سر لسان النطق عنه اخرس

ہرگز اس معاملے پر تعجب نہیں کرنا چاہیے اور نہ اس کا انکار کرنا چاہیے۔ کیوں کہ جب وادی مقدس میں آگ سے "انی انا اللہ رب العالمین" کی ندا آسکتی ہے تو اگر نفس کاملہ جو اشرف موجودات اور حضرت ذات کا نمونہ ہے، اس سے "انا الحق" کی آواز آئے تو یہ محل تعجب نہیں۔ اس مقام کے جملہ لوازم میں سے خوارق غریبہ کا صدور، تاثیرات قویہ کا ظہور، استجابت دعوات اور دفع بلیات (دعاؤں کی قبولیت اور بلاؤں کو دور کرنا) ہے۔ "لان سألنی لاعطینه ولان استعاذنی لاعیذنهم" میں اس کی تصریح ہے۔ اور اس معنی میں اس کے جملہ لوازم میں سے اس حال والے شخص کے بدسگال دشمن پر وبال کی ذلت ہے۔ کیوں کہ "من عادلی ولیا فقد اذنته بالحرب" میں یہی مضمون ہے۔ [صراط: ۱۲-۱۳]

شاہ محمد اسماعیل دہلوی کے مطابق حب عشقی کا ایک ثمرہ یہ بھی ہے کہ مشاہدہ کے بعد ادراک میں عظیم وسعت اور پنہائی پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے تمام حقائق کونیہ اور موجودات امکانیہ کو

ذات بیچوں میں مضمحل اور فانی پاتا ہے اور جو نسبت اس طالب اور حضرت حق کے بابین ظاہر ہوئی وہی وہ عرصۂ وجود میں ہر چیز اور حضرت حق میں روشن پاتا ہے۔ بالجملہ بساط وجود پر حضرت حق کی قیومیت کا انبساط اور اس ذات متوحدہ سے ان حقائق متکثرہ کے قیام کا ادراک ہوتا ہے۔ اس وقت ''هو الاول والآخر و الظاهر و الباطن و هو بكل شيء محيط. و لو وليتم بحبل الى الارض السابعة لهبط على الله'' کی آواز بلند کرتا ہے۔ سبحان اللہ حب عشقی اور جذب تجلی علمی کی تاثیر! یہ مشتِ خاک مقامِ مقدس و پاک میں کس قدر چالاک ہو گیا اور یہ ترب مہین رب الارباب کی مجلسِ قرب میں کیسی مقعد صدق اور کیسا مقام کریم پایا ہے

جسم خاک از عشق بر افلاک شد
کوہ در رقص آمد و چالاک شد
عشق جان طور آمد عاشقا
طور مست و خر موسیٰ صاعقا

اس مقام کے لوازم میں سے ''وحدت وجود'' کی صدا بلند کرنا ہے اور معارف الٰہیہ کے بیان میں لب کھولنا ہے۔ [صراط: ۱۲-۱۳]

اسی طرح شاہ محمد اسماعیل دہلوی نے حب ایمانی اور حب عقلی کے اسباب و مؤیدات اور آثار و ثمرات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بہ خوف طوالت یہاں ان تفصیلات کی طرف صرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔ ان کے مطابق حب ایمانی دراصل منعم کی محبت و تعظیم ہے اور ماسوی پر اس کو ترجیح دینا، اس کی نعمتوں پر شکر بجالانا، اور اس کی رضا جوئی میں مشقتوں کو برداشت کرنا اور مالوفات و مرغوبات کو ترک کرنا، خود کو اس کے بندوں میں شمار کرنا اور حقیر و ناچیز جاننا، اس کی مدح و ستائش میں زبان کھولنا، جوارح کو اس کی خدمت میں لگانا، اس کے زیر منت گردن جھکانا، قولاً اور فعلاً اس کے احسان کا اظہار کرنا، اس کی فرماں برداری میں اپنی مرغوبات کو چھوڑ دینا، دل کو اس کے اوامر کی بجا آوری اور اس کی رضا جوئی کے لیے عزیمت کے ساتھ محکم رکھنا، اس کے سامنے خضوع اور نیاز مندی سے عار محسوس نہ کرنا چاہے امور حسیہ و شاقہ کیوں نہ پیش آئے، اور ان امور مذکورہ پر استقامت اور مداومت برتنا۔ [صراط: ۱۴]

اس حب ایمانی کی تحصیل کے لیے شاہ محمد اسماعیل نے دیگر سلاسل تصوف سے الگ اشغال و مراقبات اور اذکار و اوراد کو بیان کیا ہے۔ ان کے مطابق اس حب کے لیے طالب ذکر کی جگہ قرآن پاک کی تلاوت اور اس کے معانی پر تدبر کرتا ہے۔ اس تلاوت کو شاہ محمد اسماعیل دہلوی ذکر ایمانی اور تدبر، مراقبہ صمدیت قرار دیتے ہیں۔ جب یہ ذکر کمال کو پہنچتا ہے تو تعظیم مفرط سے ممزوج الفت شدیدہ اس کے دل کی گہرائی سے ظاہر ہوتی ہے۔ اسی کو حب ایمانی کا نام دیا گیا ہے۔ اس حب ایمانی کے اسباب میں اولین تو حضرت حق کی طرف سے اجتبا ہے۔ اس کے بعد اتباع شریعت پر عزیمت قلبیہ کا استحکام، موافقت سنت پر وفور رغبت، بدعت کی ملابست سے شدت نفرت، اللہ تعالی کی مضبوط رسی کو پکڑنا، منعم کی رضا جوئی میں جان، مال اور سرو سامان کو قربان کر دینا، حق کو اپنے پر ترجیح دینا، حق کی خاطر ہلاکت کے مواقع میں بھی اقدام کرنا، حق بات میں مناظرہ اور منازعت کو ترک کرنا، اور تبحر علما، جو قوت مناظرہ اور مخالف کو خاموش کرنے کے لیے مشہور ہیں، ان کے سامنے اپنی خطا اور نافہمی کا اعتراف کرنا، اپنے ہم عصروں پر حسد نہ کرنا، نام و نشان پر توجہ نہ دینا، خوارق کا اظہار، آئندہ واقعات کا کشف، اور استجابت ادعیہ (دعا قبول کرنا کرانا) کو ان مشائخ کے لیے ترک کر دینا جن سے یہ تاثیر اور کشف وقائع منسوب ہیں۔ [صراط: ۱۹-۲۳] اس کے علاوہ حب ایمانی کے مؤیدات میں مواقع عظیمہ میں کوشش کرنا ہے۔ مثلاً، شرع کی تائید، سنت کی احیا، مصیبت اور بلا میں گرفتار لوگوں کی مدد، مقروضوں کی اعانت، پریشان حال کی پریشانی کو دور کرنا، نفع عام اور اصلاح فیما بین الناس کے لیے کوشش کرنا۔ ان امور کو انجام دینے سے حب ایمانی کو تائید ملتی ہے۔ [صراط: ۲۳-۲۴]

شاہ محمد اسماعیل دہلوی نے حب ایمانی کے آثار کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس حب کا اثر حضرت حق کی رضا جوئی میں فنائے ہمت و عزیمت ہے۔ اوامر کی بجا آوری، اشاعت طریقت حقہ، لوگوں کو اللہ کی اطاعت و فرماں برداری کی دعوت دینا، اور بدعت کی بیخ کنی کی ہدایت کرنا، مکالمہ و مشاہدہ کی طلب اور مقامات فنا و بقا کے حصول اور استکشاف حقائق اشیا کی کوشش نہ کرنا ہے۔ اس حب ایمانی کا مقصد صرف مولی کی رضا جوئی اور مصطفےٰ علیہ السلام کی متابعت ہے۔ یہ مقامات عالیہ اور درجات رفیعہ اگرچہ طرق کسبیہ سے حاصل ہوتے ہیں مگر حب ایمانی والوں کو

یہ محض عنایات اور جذبات وہبیہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ بلاؤں اور مصائب پر شجاعت بھی حب ایمانی کے آثار میں سے ہے۔ تاہم اس کے لیے ریاضات شاقہ پر توجہ دینے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اگر کوئی وجہ ہو مثلاً جہاد تو پھر حب ایمانی والا شخص خورد و نوش اور لباس وغیرہ میں ان کو برداشت کرتا ہے۔ مناجات میں حلاوت اور طاعات میں لذت بھی اس حب ایمانی کے آثار میں سے ہے۔ اس ضمن میں فوائد متعدیہ کو اپنے نفس کی تکمیل پر ترجیح دینا، لوگوں کی اصلاح، سیاست منزلی و مدنی کا انتظام، خدمت خلق میں مشقتوں کو برداشت کرنا، مخلوق کی تربیت میں تکلیف گوارا کرنا جیسے امور کو عزلت، مخلوق سے فرار، بیابانوں میں سکونت اور اوقات کو اذکار و مراقبات میں مشغول کرنے پر ترجیح دینا ہے۔ اسی حب ایمانی کے آثار میں سے تقویٰ ہے۔ جس کی تعبیر صلاح سے بھی کی جاتی ہے۔

اس حب ایمانی کے ثمرات پر شاہ محمد اسماعیل دہلوی لکھتے ہیں کہ:

شکر، توکل اور صلاح قلب میں جاگزیں ہو جاتے ہیں۔ ذات حق کے تفرد کا یقین، توحید افعالی جس کو ایمان بالقدر بھی کہتے ہیں حاصل ہوتا ہے۔ جب حق جل و علا کی محبت کے آثار پیدا ہوتے ہیں تو وہ اس بندے کو اپنی ولایت میں لے کر اس کی تربیت اس انداز سے کرتا ہے کہ وہ اس کو تدبیر تکوینی و تشریعی میں جارحہ (آلہ/وسیلہ) بنالیتا ہے۔ اس محبت والے کو حظیرۃ القدس سے اتصال نصیب ہوتا ہے۔ پھر اس کو مقامات بلند حاصل ہوتے ہیں۔ یہ شہدا و حوارین، اقطاب و اوتاد اور صدیقین کے مقامات ہیں۔ (صدیقین کے بیان میں شاہ محمد اسماعیل دہلوی نے لکھا ہے کہ یہ حضرات انبیائے کرام کے ہم استاذ بھی ہوتے ہیں کیوں کہ ان کو الہام کی دولت نصیب ہوتی ہے)، اس کے بعد جس طرح اس حب ایمانی میں ترقی ہوتی جاتی ہے، اسی طرح تدریجاً بعثت، امامت، وصایت، حکمت، وجاہت، عصمت، نیابت، مفہمین، ریاست، فاتحین وخاتمین، فردانیت کے مقامات بلند حاصل ہوتے جاتے ہیں۔ [صراط: ۲۴-۳۹]

یہ سارے مقامات وہ ہیں جن کو شاہ محمد اسماعیل دہلوی نے کمالات نبوت کے تحت اپنی دوسری کتاب منصب امامت میں بیان کیے ہیں۔ یہ کتاب انہوں نے اپنے مرشد سید احمد رائے بریلوی کی امامت و خلافت کے اعلان کے بعد لکھی تھی۔ اس طرح سے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ حب

ایمانی کے مؤیدات، آثار اور ثمرات میں جن امور کا تذکرہ کیا ہے وہ ان کی تحریک طریقۂ محمدیہ کے پروگرام میں شامل تھیں۔ یہ پروگرام تھا تحریک جہاد لیے لوگوں کی حمایت اور تعاون حاصل کرنا اور سید احمد رائے بریلوی کی امامت وخلافت کو تسلیم کرانا۔ اس وقت ہندوستان کی سیاسی حالت ایسی تھی کہ سیاسی قیادت کے لیے کوئی ماڈل موجود نہیں تھا۔ ہاں عوام میں صوفیہ کرام کی روحانی قیادت وارشاد کو اعتبار واستناد حاصل تھا۔ تحریک طریقۂ محمدیہ کے نظریہ سازوں نے سیاسی اور روحانی قیادت کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔ اس کے لیے ان کو بہت سے نظریات وافکار کی نئی تشریح وتعبیر کرنی پڑی۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ نظریۂ محبت کا جو بیان شاہ محمد اسماعیل دہلوی نے پیش کیا وہ بہت حد تک ان پیش رو اہل علم وعرفان علما سے الگ تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شاہ محمد اسماعیل دہلوی کی تشریح میں بہت سے تضادات ملتے ہیں۔ پہلے کے صوفیہ نے حب الٰہی کی تعریف میں نفس کو شامل نہیں کیا ہے بلکہ وہ مجاہدہ اور ریاضت کے ذریعے نفس کی تربیت کی تعلیم دیتے ہیں۔ ان صوفیہ نے حب اور عشق کو الگ الگ بیان کیا ہے جب کہ شاہ محمد اسماعیل دہلوی نے حب اور عشق میں نسبت اضافت کی مدد سے "حب عشقی" کی ایک نئی ترکیب وضع کی ہے۔ حب عشقی اور حب نفسانی کے بیان میں ہم نے دیکھا کہ شاہ محمد اسماعیل دہلوی نے یہ لکھا ہے کہ اس محبت کے لیے انسان بہت سے خلاف شرع امور کا سہارا لیتا ہے۔ جب کہ حب ایمانی اور حب عقلی میں شریعت کی اتباع واطاعت کرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں قسموں میں تضاد ہے۔ مگر جب ہم صراط مستقیم کے باب اول، جو محبت کی ان دو اقسام کے بیان پر مشتمل ہے، کے اختتامی حصہ کو پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ شاہ محمد اسماعیل دہلوی ان دونوں میں تباین نہیں مانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ نہ خیال کرنا چاہئے کہ راہ ولایت اور راہ نبوت میں کوئی تباین ہے۔ بلکہ وہ حب ایمانی کو اسپ تیز گام اور حب عشقی کو اس طریق کا بادیہ یا ایک منزل سمجھتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ حب ایمانی کو بنائے سلوک کی اساس اور حب عشقی کو خوش رنگ اور دلکش نقوش کی طرح بیان کرتے ہیں۔

حب عشقی کے بیان میں جا بجا شاہ محمد اسماعیل دہلوی نے حب عشقی والوں پر تنقید کرتے وقت یہ بھی کہا ہے کہ حاشا وکلا وہ ان صوفیہ کی اہانت نہیں کرنا چاہتے ہیں بلکہ محبت کی ان دونوں

قسموں کے درمیان جو فرق ہے اس کو واضح کرنا ان کا مقصد ہے۔ مگر تصوف کے جن امور کو بنیاد بنا کر اہل تصوف کی تنقید کرتے ہیں اور انجام کار تصوف کا انکار کرتے ہیں ان میں سے زیادہ تر کا بیان شاہ محمد اسماعیل دہلوی نے حب عشقی / حب نفسانی کے ذیل میں کیا ہے۔ ان میں ریاضت و مجاہدہ، پیر و مرشد کی محبت و تعظیم، سماع، مسئلۂ وحدت الوجود، اتباع شریعت سے بے اعتنائی، سماجی و معاشرتی ذمے داریوں سے فرار، سیاست مدنی سے لاتعلقی، اصلاح فیما بین الناس کے کام سے بی رغبتی، گوشہ نشینی اور اذکار و اوراد میں مشغولیت وغیرہ امور ہیں۔ جب ہم مخالفین اور منکرین تصوف کی تحریروں کو پڑھتے ہیں تو یہی وہ باتیں اور امور ہیں جن کو یہ لوگ دلائل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ شاہ محمد اسماعیل دہلوی کی کتاب ''تقویۃ الایمان'' اور ''صراط مستقیم'' کے باب دوم میں مذکور ''بدعات'' نے بھی منکرین اور مخالفین تصوف کو متاثر کیا ہے۔ ان میں سے کچھ کو شاہ محمد اسماعیل دہلوی نے ''صوفیہ کبار سے تشبہ رکھنے والے صوفی شعار ملحدین و مشرکین کے اختلاط کی وجہ سے عوام اہل اسلام میں پھیلی بدعات'' کا نام دیا ہے۔ ان میں وہ کشف و شہود، مخالفت شرع، حضرت حق کی جناب میں بے ادبی کے کلمات، توحید وجودی الحادی، مسئلۂ تقدیر میں قیل و قال اور بحث و جدال، تعظیم مرشد میں غایت افراط، محبت مرشد، زیارت قبور کا قصد، اہل قبور سے استمداد و استعانت، قبور پر اور قبرستان میں چراغاں اور اولیا کی نذر و نیاز جیسے عناوین کی اپنے انداز میں تشریح کرتے ہیں۔ [صراط: ۴۲-۵۴] اس کے علاوہ اسی کتاب میں طریقۂ نقشبندیہ مجددیہ کے اشغال کے ضمن مین شاہ محمد اسماعیل دہلوی نے شغل برزخ کو اشغال مبتدعہ میں شمار کیا ہے۔ اس شغل کو تصور شیخ اور رابطہ بالشیخ بھی کہا جاتا ہے جس کو صوفیا دفع خطرات اور جمعیت ہمت کے لیے مریدین کو تجویز کرتے ہیں۔ شاہ محمد اسماعیل دہلوی یہ کہتے ہیں کہ:

''یہ عمل متاخرین کے اکثر طرق میں مشہور ہے بلکہ بعض اکابر کا کلام بھی اس پر مشتمل ہے۔ یہ ایک بدعت اور صریح حرام عمل ہے۔'' [صراط: ۱۱۸-۱۱۹]

ان امور کے سلسلے میں اہل تصوف اور صوفیہ نے بھی کتابیں لکھی ہیں اور اپنے موقف کی

وضاحت میں دلائل پیش کیے ہیں۔اس کے ساتھ شرعاً ممنوع امور کی نشاندہی بھی کی ہیں۔شرعی اور نقلی دلائل کی روشنی ان امور میں جائز طریقوں کو تفصیلاً بیان بھی کیا ہے۔ان میں سے چند پہلوؤں کو اس مضمون کے آخری حصہ میں بیان کیا جائے گا۔

حضرت آسیؔ اور تصور محبت

حضرت آسیؔ کی عملی زندگی خود بتاتی ہے کہ اگر یک طرف وہ مسند ارشاد و ہدایت پر فائز ہیں تو دوسری طرف وہ درس گاہ میں درس و تدریس کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں۔یہی نہیں بلکہ طبابت میں مہارت حاصل کرنے کے بعد وہ خدمت خلق کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں۔اس طرح سے ان کی زندگی میں ہم کو تصوف کے عملی اور نظری دونوں پہلوؤں کے جلوے ملتے ہیں۔عشق و محبت کے حوالے سے چند اشعار پیش ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاہ محمد اسماعیل دہلوی کے تصور حب و عشق سے اتفاق نہیں رکھتے۔اس سلسلے میں شاہ محمد اسماعیل نے وحدت الوجود، فنا و بقا اور رابطہ بالشیخ، توسل و استعانت اور شفاعت کے تصورات پر جو تنقید کی ہے حضرت آسیؔ کے اشعار میں اس تنقید سے بیزاری نظر آتی ہے۔وہ فرماتے ہیں:

عشق و ہوس میں حسن کو تمیز چاہیے
مانو نہ مانو آگے تمہیں اختیار ہے
واعظ مرا معاملہ میرے خدا کو سونپ
بندہ گناہ گار، وہ آمرز گار ہے

حب نفسانی کے حوالے سے شاہ اسماعیل کے خیالات اور حضرت آسیؔ کے موقف کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ صوفیہ کرام کے تصورِ حب و عشق میں حب نفسانی ''ہوس'' کو روا نہیں سمجھتے ہیں۔ بلکہ اس میں اور صوفیہ جس عشق و محبت کی بات کرتے ہیں، ان میں امتیاز کی دعوت دیتے ہیں۔وہ جذب اور سلوک دونوں کی بات کرتے ہیں۔مگر اسی کے ساتھ ساتھ حسن و عشق میں محبوب کے ناموس کے تحفظ کی دعوت بھی جذبۂ محبت کے معجزے کے حوالے سے دیتے ہیں۔

جز عشق کس میں قوت ادراک راز حسن

بلبل کے اشک غم سے بڑھی آبروئے گل
میں جانتا ہوں جذب محبت کے معجزے
اے عندلیب غنچۂ منقار و بوئے گل

راہ سلوک میں فنا و بقا کے مقامات بھی آتے ہیں۔ مگر ان کی تفہیم حضرت آسی جس انداز سے کرتے ہیں، وہ شاہ اسماعیل کی تشریح سے بالکل الگ ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے جس روحانی رشتے کی بات کی جاتی ہے، اس میں وفا، ذوق، جرم محبت، فراق اور وصال جیسی اصطلاحات تصوف کا استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ حضرت آسی دعوت فکر بھی دیتے ہیں کہ یہ ''روحانی نسبت'' ایک حالت ہے اور اس کیفیت کا اظہار الفاظ میں نہیں ہوسکتا۔

امام قشیری سے منقول ہے کہ:

''محبت ایک ایسی کیفیت ہے جس کی تعبیر الفاظ میں نہیں کی جاسکتی۔''

اسی لیے اگر کہیں بھی اس ''کیفیت'' کا بیان الفاظ میں ہو تو ان الفاظ کو ''مجاز'' پر محمول کیا جائے تا کہ اس سے ''حقیقت'' کی تفہیم ہو سکے۔ حضرت آسی فرماتے ہیں:

سلوک راہ وفا میں فنا کے طور ہیں اَور
جو آپ مار کے تیشہ مرا تو جھک مارا
نہ مستعد فنا ہو تو ذوق عشق غلط
کہ بہر جرم محبت ہے قتل کفارا
تعینات میں کیا اختلاف ہوتا ہے
وہ بدر عالم حسن اور آنکھ کا تارا
فراق یار کی طاقت نہیں وصال محال
کہ اُس کے ہوتے ہوئے ہم ہوں یہ کہاں یارا
اگر بیان حقیقت نہ ہو مجاز کے ساتھ
تو شعر لغو ہے آسی کلام ناکارا

وہ مزید فرماتے ہیں کہ:

سخت دشوار تھی معشوق سے عاشق کی شناخت
وصل کی رات نہ تھی، تھی وہ طلسمات کی رات
بعد تھا قرب، جدائی تھی اگر عین وصال
یاد ہے اے کششِ دل وہ کرامات کی رات
کچھ ہمیں سمجھیں گے یا روزِ قیامت والے
جس طرح کٹتی ہے امیدِ ملاقات کی رات
پھر وہی طرف چمن ہو، وہی صحبت، وہی دور
پھر وہی ہم ہوں، وہی تم، وہی برسات کی رات
اب تو پھولے نہ سمائیں گے کفن میں آسی
ہے شبِ گور بھی اس گل کی ملاقات کی رات

حضرت آسی کے نزدیک راہِ عشق میں وصل کی حالت طلسمات کی رات کی طرح ہوتی ہے۔ کیوں کہ سلوک کا سفر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ طالب کی طلب کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ راہِ طریقت میں ''حالات ومقامات'' بہت ہیں۔ واردات، مشاہدات اور مخاطبات کا ایک سلسلہ ہے۔

نہ کیوں ہو دل کو یقین پیدا شہادت اُس کی ہے غیب اس کا
نقاب منہ پر نہیں ہے لیکن کسی کو تابِ نظر نہیں ہے
جو اپنے دم سے بھی آدمی کو نصیب ہو اتحاد کامل
کسے نہیں خلوت انجمن میں کسے وطن میں سفر نہیں ہے
طلب تمام ہو مطلوب کی اگر حد ہو
لگا ہوا ہے یہاں کوچ ہر مقام کے بعد

ان مقاماتِ طریقت میں سے ایک مقام تجرید وتفرید بھی ہے۔ حضرت آسی فرماتے ہیں:

ہے اہل جہان سے ایسی تجرید مجھے
تجرید میں گویا کہ ہے تفرید مجھے
ان میں بھی نہیں میں پیشوا ہوں جن کا
سبحہ کے امام کی ہے تقلید مجھے

یقین، شہادت، غیب، نقاب (حجاب)، اتحاد (شعور وحدت)، خلوت درانجمن، سفر در وطن اور تجرید وتفرید تصوف کی وہ اصطلاحات ہیں جو اپنے اندر ایک جہان معانی لیے ہوئے ہیں۔ کتب صوفیہ میں ان پر تفصیلات موجود ہیں۔ ان کے حوالے سے اگر حضرت آسی کے افکار و خیالات کا مطالعہ کیا جائے تو ان مطالب و معانی کی تشریح وتعبیر میں نئے آفاق دریافت کیے جاسکتے ہیں اور ناقدین تصوف کی ان تنقیدات کا جواب بھی مل سکتا ہے کہ جو ان اصطلاحات کی من مانی توضیح کر کے صوفیہ کرام کی پاک جماعت کو بدنام کرتے ہیں اور اس کے در پردہ اپنے منصوبوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ (ان اصطلاحات کے تفصیلی بیان کے لیے کشف المحجوب، رسالہ قشیریہ، عوارف المعارف اور احیاء علوم الدین کا مطالعہ مفید ہوگا)

عشق ومحبت کے مختلف احوال و کیفیات ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں حضرت آسی نے ان کیفیات اور مقامات کی حفاظت کی تاکید کی ہے۔ محبت کی دولت کے حصول کے لیے وہ بے قراری، شعلہ، تلاطم، خودی اور بے خودی، جذب وکشش اور فنا و نیستی کا ذکر کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ دل کو سنبھالنے اور بے تابی سے بچنے کی بات بھی کرتے ہیں۔

مرا سفینہ تلاطم میں بحر عشق کے ہے
مزا تو جب ہے خدا آئے ناخدا ہو کر
نہ پوچھ تندی و تیزی مئے محبت کی
جسے یہ نشہ چڑھا رہ گیا فنا ہو کر
قرار جز دل عاشق کجا حسیناں را
وہ آخر آئے مرے دل میں جابجا ہو کر
موسیٰ کی طرح گر پڑے غش کھا کے خدائی
برقع رخ روشن سے ذرا سا جو ہٹا دو
کب تک میں تحمل کروں جھگڑے من وتو کے
اک بار دو عالم کے بکھیڑے سے چھڑا دو

عشق میں محویت ہے مگر شاہ اسماعیل کے برخلاف راحت وصل اور رنج فرق نہیں

ہے۔ عشق کی دولت عطائے الٰہی ہے۔ عزلت اور گوشہ نشینی کی بات میں مگر ایسی گوشہ گیری جس میں جنگلات اور بیابانوں کی بات نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ وہ ایسی عزلت کی بات کرتے ہیں جس میں حدیث نفس بھی نہیں ہے۔

عاشقی میں ہے محویت درکار
راحت وصل و رنج فرقت کیا
گوشہ گری حدیث نفس کے ساتھ
دل ہی مجمع میں ہے تو عزلت کیا

محبت میں ایک عاشق کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے محبوب کے حکم کی بجا آوری میں وفاداری کا ثبوت دے۔ اور اس کی مرضی اور خواہش کے احترام میں کوئی کسر نہ چھوڑے۔ کیوں کہ محبوب کی اطاعت اور اتباع محبت کے مقتضیات میں سے ہے۔ حضرت آسی فرماتے ہیں

رتبہ پایا ہے محبت میں تو اب دل کو سنبھال
گر پڑے گا صفت برق جو بے تاب ہوا
تابع خواہش محبوب ہو خواہش جس کی
رنج پاس اس کے نہ آئے کبھی راحت کے سوا

اس شعر میں ایک لطیف اشارہ اس قرآنی آیت کی طرف بھی ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ اللہ کے محبوب اولیا کو نہ کوئی خوف ہوتا ہے نہ کوئی حزن وملال ان کے دامن گیر ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ حضرت آسی عشق کی دولت کو محبت خیز کہتے ہیں اور ان حضرات کا رد بھی کرتے ہیں جو صوفیہ کے تصور محبت کی من مانی تشریح اور تعبیر کر کے اس کو شورش، قلق واضطراب اور جنوں کا نام دیتے ہیں۔ حضرت آسی نے طریق جنوں میں ہی کوچۂ سلامت دریافت کی ہے

یہ طریق جنوں مرا اے شیخ
راہ ہے کوچۂ سلامت کی
خوفِ دوزخ نہ حرصِ جنت کی
بے غرض میں نے تجھ سے الفت کی

اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت آسی نے اپنے اشعار میں صوفیہ کرام کے تصور محبت کو جس انداز سے بیان کرتے ہیں اس میں محبت کی تعبیر کے مختلف الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ مجاز و حقیقت کے رشتے کو ملحوظِ نظر رکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ''راحت وصل'' اور ''رنج فرقت'' کو کیفیت عشق و محبت کے مختلف حالات اور مقامات کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ محبوب کی اطاعت واتباع کو محبت میں وفاداری کا ثبوت سمجھتے ہیں۔

مسئلہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود

تصوف کی کتابوں میں وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی بحث پر کافی تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ صوفیہ کرام ''لا موجود الا اللہ'' کو مانتے ہیں۔ ان کی نظر میں خدا کے سوا سب معدوم ہیں۔ موجود وہی ذات احد ہے۔ زیادہ تر صوفیہ کرام وحدۃ الوجود کے قائل ہیں۔ ایک گروہ وحدت الشہود کا قائل ہے۔ شیخ علاء الدولہ سمنانی اور شیخ روز بہان بقلی وغیرہ اور بعد کے دور میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی اور ان کے ماننے والے جو نقشبندی مجددی ہوتے ہیں، وہ وحدۃ الشہود کو مانتے ہیں۔ اٹھارہویں صدی میں دہلی کے صوفی علما نے اس بحث کو لفظی قرار دیا ہے۔ دوسرے چشتی صوفیہ کی طرح شاہ کلیم اللہ جہان آبادی اور ان کے سلسلے کے جانشین مولانا فخر الدین نظامی اس مسئلہ پر عوام میں گفتگو کرنے سے احتراز کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس کا تعلق تجربہ اور وجدان سے ہے نہ کہ الفاظ واقوال سے۔ [مناقب فخریہ: ۲۶]

جہاں تک مرزا مظہر جان جاناں کی بات ہے تو وہ حضرت شیخ احمد سرہندی کے سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے سجادہ نشین ہونے کی حیثیت سے اس مسئلہ پر شیخ مجدد کے موقف کی حمایت کرتے ہیں۔ وہ وحدۃ الشہود کو ترجیح دیتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ وہ بھی مصالحتی کوشش کرتے دکھتے ہیں۔ [شاہ غلام علی، حالات ومقامات مظہری، ص: ۱۱۔ ۱۰۸]

تاہم ان کے مرید وخلیفہ شاہ غلام علی نے وحدۃ الشہود پر شیخ مجدد الف ثانی کے موقف کی پرزور تائید کی ہے۔ [درالمعارف: متعدد مقامات]۔ خواجہ میر درد بھی اس مسئلہ پر ایک مصالحتی رائے رکھتے تھے۔ انہوں نے بھی اپنی کتابوں میں اس پر گفتگو کی ہے۔ ان کے خیال میں اہل کمال صوفیہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے تھے۔ ان کا کہنا ہے

کہ سچے محمدی وجود کی جگہ نور کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اور وہ توحید محمدی کی اصطلاح کو ترجیح دیتے ہیں۔ [درد: علم الکتاب: ۱۰۶] شاہ ولی اللہ دہلوی نے اس موضوع پر چند مکتوبات لکھے ہیں۔ اس مسئلہ پر ان کا مکتوب مدنی بہت ہی مشہور ہے۔ شاہ ولی اللہ نے اپنے قیام حرمین کے دوران ایک کتاب بنام فیوض الحرمین لکھی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے بہت سے ایسے خوابوں کا ذکر کیا ہے۔ جن میں انہوں نے براہ راست حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی مسائل پر استفسار کیا تھا۔ ان میں ایک مسئلہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود بھی تھا۔ جس پر حضور اکرام صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہ ولی اللہ کو مصالحتی موقف اختیار کرنے کا حکم فرمایا۔ (تفصیل کے لیے فیوض الحرمین کا مطالعہ فرمائیں)

شاہ ولی اللہ کے فرزند شاہ عبدالعزیز نے بھی قرآنی آیات کی روشنی میں اس مسئلہ پر فریقین کے موقف کو درست قرار دیتے ہوئے تطبیق کی کوشش کی ہے۔ مگر اسی کے ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اس مسئلہ پر عوام میں گفتگو سے بچنا چاہیے، کیوں کہ زیادہ تر لوگ اس کے صحیح معانی سمجھنے سے قاصر ہیں۔ [فتاوی عزیزی، جلد اول، : ۲۸۔۲۹]

شاہ ولی اللہ نے شیخ احمد سرہندی کے کلام کی تاویلات کی ہیں۔ شاہ ولی اللہ کے مکاتیب کا رد مولوی غلام یحییٰ نقشبندی مجددی نے کیا۔ یہ مرزا مظہر جان جاناں کے مرید تھے۔ ان کے رد کا رد مولوی رفیع الدین ابن شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب ''دمغ الباطل'' میں کیا ہے۔ علامہ فضل حق خیرآبادی نے بھی اس موضوع پر اپنے ایک رسالہ بنام ''الروض المجود فی مسئلۃ وحدۃ الوجود'' میں وحدۃ الوجود کی حقانیت پر تفصیلی دلائل تحریر فرمائے ہیں۔ تاہم اس مسئلہ کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے زیادہ تر اہل عرفان علما نے اس پر عوامی گفتگو سے منع فرمایا ہے۔

حضرت آسی اور مسئلۂ وحدۃ الوجود

حضرت آسی وحدۃ الوجود کو مانتے ہیں مگر اس پر وہ اس طرح کلام کرتے ہیں کہ کثرت اور وحدت دونوں میں ذات باری تعالیٰ کے جلووں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ماسوا کے معدوم ہونے کی بات کرتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ وہ بھی مصالحتی موقف اختیار کرتے ہیں اور اپنے اشعار میں وحدت اور کثرت کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ قاری کو یہ اندازہ نہیں ہو پاتا کہ وہ کس کو

ترجیح دیتے ہیں۔ دراصل طرز بیان میں یہ ابہام صوفیہ کی اس تجویز پر عمل ہے کہ اس مسئلہ کو عوام میں بیان کرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔

آسیؔ اگر ادراک حقیقت ہو میسر
ہے انفس و آفاق میں تاثیر ہماری
نہ تھا معشوق جس میں غیر عاشق
عجب خلوت تھی وہ بھی ہم جہاں تھے
ظاہر و مظہر اگر باہم نہیں تھے حسن و عشق
بلبلیں رنگیں نوا کیوں، غنچہ کیوں دل گیر تھا
حق ہو یا ناحق، کہا تم نے ہوا بدنام میں
اب تو ثابت ہوگیا، منصور بے تقصیر تھا

اس مسئلہ پر حضرت آسی کہتے ہیں کہ یہ تو تجربہ اور عرفان کی بات ہے۔ طالب اور سالک کے ظرف، طبیعت اور حال و مقام کی بات ہے۔ ماسوای کے خیال کو دل سے محو کر کے جب وہ دیکھتا ہے تو اس کی آنکھوں میں جمال محبوب کے مشاہدہ کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ اسی لیے وہ اس مسئلہ پر بحث کرنے والے حضرات کو کثرت سے نفرت کرنے یا ذوق وحدت میں محو ہونے کے مقام سے اوپر اٹھ کر سوچنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اور اپنے لیے حضرت حق کی بارگاہ میں دعا بھی کرتے ہیں۔

مری نظروں میں تو ہو، ڈر ترا، تیری محبت ہو
نہ دنیا ہو، نہ عقبیٰ ہو، نہ دوزخ ہو، نہ جنت ہو
مجھے ہر طرح کی خود بینیوں سے کردے بے گانہ
جو آئینہ بھی دیکھوں نمایاں تیری صورت ہو
ہماری دید میں، فہمید میں، دے ایسی یک رنگی
کہ صورت عین معنی اور معنی عین صورت ہو

پیری و مریدی

صوفیہ کے مطابق روحانی سفر کی دو جہتیں ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ جذب الٰہی متوجہ ہوتی ہے اور اس کو معرفت و حقیقت کے لیے چن لیتی ہے۔ اور اس پر قرب خداوندی کا انعام و اکرام ہوتا

ہے۔اس کو راہِ جذب کہا جاتا ہے۔دوسری جہت یہ ہے کہ ایک شخص ریاضت اور مجاہدہ کے ذریعہ اپنے نفس کو برے اخلاق وصفات سے پاک کرتا ہے اور اس کو اچھے اور عمدہ اخلاق وصفات سے آراستہ کرتا ہے۔اس کے بعد اذکار واشغال اور مراقبات کے ذریعہ قرب خداوندی اور معرفت حق کی طلب میں کوشش کرتا ہے۔پھر اس پر عنایت الٰہی کا نزول ہوتا ہے۔اس کو راہِ سلوک کا نام دیا جاتا ہے۔صوفیہ نے کہا ہے کہ اول الذکر راہ میں بندہ حضرت حق کی طرف خود بہ خود کھنچتا چلا جاتا ہے۔اس میں اس کی کوشش کا کوئی دخل نہیں۔جب کہ ثانی الذکر میں بندہ کوشش کرتا ہے اور اس کی کوشش پر رحمت حق مہربان ہوتی ہے۔صوفیہ نے یہ بھی کہا ہے کہ کامل ومکمل اور تجربہ کار پیرو مرشد کی تربیت ونگرانی میں راہِ سلوک پر چلنا آسان ہو جاتا ہے۔اسی لیے ان حضرات نے پیری مریدی کے ادارے کو رواج دیا ہے۔اس میں طالب ایک شیخ طریقت کے ہاتھ پر پچھلے گناہوں سے توبہ کر کے آئندہ گناہوں سے بچنے اور نیک اعمال کرنے کا عہد کرتا ہے۔اس عمل کو بیعت و ارادت کہا جاتا ہے۔اس کے ذریعے سے طالب ایک سلسلہ میں داخل ہو جاتا ہے۔اس کے ساتھ ہی وہ ایک روحانی خانوادے کا فرد بن جاتا ہے۔یہ سلسلہ دراصل رسول کریم ﷺ سے لے کر موجودہ شیخ تک روحانیت اور روحانی تعلیمات کے تسلسل کو ظاہر کرتا ہے۔شجرۂ طریقت میں ان مشائخ کے نام درج ہوتے ہیں جن کے واسطے سے طالب کا رشتہ رسول کریم ﷺ سے ملتا ہے۔اسی لیے صوفیہ کہتے ہیں کہ ان کے لیے رسول کریم ﷺ قابل تقلید نمونہ ہیں۔پیری مریدی کے رشتہ میں اطاعت وفرماں برداری اور جذباتی وابستگی کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا گیا ہے۔اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کے اہل علم وعرفان صوفیہ نے بھی راہ سلوک کے لیے پیرو مرشد کے اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔انہوں نے روحانی سفر اور سماجی زندگی میں قرآن وحدیث پر عمل کے ساتھ ساتھ پیر کی صحبت اختیار کرنے کے تلقین کی ہے۔ان کے خیال میں مرشد نائبِ رسول اور خلیفۂ رسول ہوتا ہے۔اسی لیے اس کی اتباع اور پیروی کر کے ایک طالب منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔تاہم ان حضرات نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ کامل اور مکمل شیوخ بہت کم پائے جاتے ہیں۔اسی لیے کامل پیر کی صفات تفصیلاً بیان کی ہیں۔اور بیعت وارادت کے لیے شرائط بھی ذکر کیے ہیں۔(اس موضوع پر تفصیلات شاہ ولی اللہ کی القول الجمیل، الانتباہ فی سلاسل الاولیاء و

اسانید وارثی رسول اللہ، شاہ کلیم اللہ جہان آبادی کی کشکول کلیمی اور مولانا نعیم اللہ بہرائچی کی معمولات مظہریہ میں ملاحظہ فرمائیں)۔ اٹھارہویں صدی میں ان میں سے زیادہ تر حضرات نے پیر و مرشد کے کردار میں بھی دعوت و تبلیغ اور ارشاد و ہدایت کا فریضہ بھی انجام دیا ہے۔ آئندہ سطور میں پیری مریدی کے حوالے سے جن امور پر شاہ محمد اسماعیل دہلوی نے تنقید کی شروعات کی ہے اور بعد میں منکرین تصوف جن کو بنیاد بنا کر تصوف اور اہل تصوف کا انکار کرتے ہیں ان پر اس دور کے صوفی علما کے تحریروں سے اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں۔

شاہ ولی اللہ نے سلسلۂ نقشبندیہ کے مشائخ کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''ان کے نزدیک اللہ تک پہنچنے کی تین راہیں ہیں: ذکر، مراقبہ اور رابطہ بالشیخ۔''

آخر الذکر کی تفصیل میں وہ فرماتے ہیں کہ:

''اس کی شرط یہ ہے کہ شیخ قوی التوجہ ہو۔ یادداشت کی مشق دائمی رکھتا ہو۔ پھر جب مرید ایسے شیخ کی صحبت اختیار کرے تو وہ اپنی ذات کو ہر چیز کے تصور اور خیال سے خالی کرلے سوا اس کی محبت کے۔ اور اس کا منتظر رہے جس کا اس کی طرف سے فیض آئے۔ اور دونوں آنکھیں بند کرلے یا ان کو کھول دے۔ اور شیخ کی دونوں آنکھوں کے بیچ میں اپنی نظریں جمادے۔ پھر جب کسی چیز کا فیض آئے تو اس کے پیچھے پڑ جائے اپنے دل کی جمعیت کے ساتھ۔ اور چاہیے کہ اس فیض کی محافظت کرتا رہے۔ اور جب شیخ اس کے پاس نہ ہو تو اس کی صورت کو اپنی دونوں آنکھوں کے درمیان خیال کرتا رہے محبت اور تعظیم کے ساتھ۔ اس کی خیالی صورت وہ فائدہ دے گی جو اس کی صحبت فائدہ دیتی تھی۔''

[شفاء العلیل ترجمۂ قول الجمیل، مطبع نظامی کانپور، ص: ۵۳-۵۴۔]

اس موضوع پر شاہ ولی اللہ نے الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ و اسانید وارثی رسول اللہ میں بھی، بیعت و ارادت کی مشروعیت، حکمت اور اس کی اقسام اور طریقۂ کار پر تفصیل سے لکھا ہے۔ تاہم طوالت کے خوف سے ان کو یہاں ذکر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ان کے ملفوظات کے مجموعہ سے ایک اقتباس پیش کیا جا رہا ہے۔ جس میں شاہ ولی اللہ، شیخ کو وصول الی اللہ کا وسیلہ بھی مانتے ہیں۔ وہ اپنے والد بزرگوار کے حوالے سے کہتے ہیں:

"افادہ: حضرت والا نے بیان فرمایا ہے کہ حضرت شیخ بزرگ عبدالرحیم قدس سرہ کو ایک مجلس میں امیر عصمت اللہ سہارنپوری سے، جو اس دیار کے اکابر علما میں سے تھے، ملاقات کا اتفاق ہوا۔ انہیں بظاہر تصوف سے جس میں بیعت و ارادہ ومجاہدہ ہے اور جس کا ثمرہ مکاشفہ ہوتا ہے، اعتقاد نہ تھا۔ پس حضرت شیخ بزرگ نے میر مذکور سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ آپ کہاں کے مرید ہیں؟ انہوں نے کہا کہ کیا یہ طریقہ شرع سے ثابت ہے جو اس کی پابندی کرنی چاہیے؟ حضرت شیخ نے فرمایا کہ حجج شرعیہ میں تین چیزیں ہیں: کتاب، سنت اور اجماع۔ اور مجتہد کا قول بھی حجت ہے۔ اور یہ بات ان تمام سے ثابت ہے۔ میر نے کہا کہ یہ کس طرح ہے؟ اس کی وضاحت کیجیے۔ آپ نے فرمایا کہ "کتاب وہ ہے کہ اللہ فرماتا ہے:

"یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللہ و ابتغوا الیہ الوسیلۃ و جاھدوا فی سبیلہ لعلکم تفلحون."

اس آیت میں ابتغاے وسیلہ سے مراد کیا ہے؟ میر نے جو کچھ بعض مفسرین نے اعمال صالحہ وغیرہ کا ذکر کیا ہے، بیان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ معنی مراد نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ ایمان مراد نہیں ہوسکتا کیوں کہ خطاب مومنین سے ہے۔ (یعنی ایمان والے سے یہ کہنا کہ ایمان لاؤ، یہ ایک مہمل سی بات ہے) اور اعمال صالحہ تقوی میں داخل ہیں اور تقوی سے مراد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل کرنا ہے۔ (یہ بھی و ابتغوا الیہ الوسیلۃ میں داخل نہیں ہیں) اور یہ بھی مراد نہیں ہوسکتا کیوں کہ قاعدۂ عطف مغایرت چاہتا ہے۔ اور ذکر میں ترتیب اس کی مقتضی ہے کہ وہ ایک ایسی چیز ہے جو تقوی کے بعد ہوتی ہے اور یہی چیز ارادت اور مرشد سے بیعت ہے۔ اس کے بعد مجاہدہ اور ریاضت ہے تاکہ فلاح حاصل ہو۔ جس سے مطلب ذات حق کا وصول ہے۔ پس میر مذکور نے بہت رد و قدح کے بعد اسے قبول کیا اور اعتراف کیا۔ (پھر) آپ نے فرمایا کہ حدیث شریف میں ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا:

"کیف اصبحت مومنا حقا قال ماحقیقتہ ایمانک الخ"

پس اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بیداری اور بھوک جو جہاد کا ایک شعبہ ہے تخلیہ و تجلیہ (خلوت و جلوت) کے ثمرات اسی سے حاصل ہوتے ہیں۔ نیز غیبی امور کا کشف حاصل ہوتا

ہے۔اس حدیث سے اس کے التزام کا حکم بھی معلوم ہو گیا۔اور یہی تصوف کا طریقہ ہے۔پس ہزاروں، لاکھوں علمائے عارفین نے نبی علیہ ﷺ کے وقت سے لے کر آج تک یہی طریقہ اختیار کیا ہے اور نیز خود کو اس پر عامل رکھا ہے۔یہی مجتہد کا قول ہے جو مشہور ہے۔امام اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ "لو لا السنتان لهلك النعمان" اگر دو سال نہ ہوتے تو نعمان ہلاک ہو جاتا (یعنی حضرت امام ابو حنیفہ نے دو سال حضرت امام صادق کی خدمت میں فیوض و برکات حاصل کیے) اور حضرت فرید الدین عطار کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ میر صاحب نے کہا وہ عالم ثقہ تھے۔آپ نے فرمایا کہ انھوں نے یہ کہا کہ یہی دو سال ایسے تھے کہ امام نے اس مدت میں امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں (سے) باطنی استفاضہ کیا۔پس معترف ہوئے اور حضرت والا کی خدمت میں استفاضہ کا قصد کیا۔لیکن ان کے سفر دکھن کے سبب یہ بات عملی جامہ نہ پہن سکی (ممکن نہ ہو سکی)۔[القول الجلی یعنی ملفوظ شاہ ولی اللہ مؤلف شاہ محمد عاشق پھلتی۔ترجمہ از حافظ تقی انور علوی۔خانقاہ کاظمیہ، کاکوری، ۵۳۲۔۵۳۴]

شاہ ولی اللہ نے تلمیذ میں تاثیر توجہ اور تاثیر ہمت کے سلسلے میں لکھا ہے:

"متاخرین صوفیہ اور بالخصوص مشائخ نقشبندیہ نے قلب کے احوال سے ایک دوسرے حال کا استنباط کیا ہے۔اس سے متقدمین صوفیہ آشنا نہیں تھے۔تاہم کسی قاعدے کو متعین کیے بغیر کبھی کبھار ان سے کچھ چیزیں ظاہر ہوئیں۔مثلاً تلمیذ میں تاثیر، اور حیز عالی میں ہمت کی تاثیر۔اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان میں غلبہ اور عزم کی قوت ودیعت رکھی گئی ہے۔صاحب قوت و عزم جس چیز کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس چیز کو اپنی نسبت حقیر سمجھتا ہے اور خود کو اس پر غالب جانتا ہے۔اور اس شخص کا جب کسی سے معاملہ ہوتا ہے تو یہ اس پر غالب آ جاتا ہے۔اور دوسرا مغلوب، پریشان اور ترساں و ہراساں ہو جاتا ہے۔اور اگر یہ شخص کسی کے ساتھ نشست و برخاست رکھے، اس وقت اس پر جو بھی حال طاری ہو، مثلاً حزن و نشاط وغیرہ اس شخص میں سرایت کر جاتی ہے۔لوگ قوت غلبہ کے معاملے میں مختلف الحال ہوتے ہیں۔کچھ لوگ علی الوجہ الاتم رکھتے ہیں۔بعض بالکلیہ نہیں رکھتے ہیں۔اور کچھ لوگوں میں یہ قوت بین بین (یعنی درمیانہ درجے کی) ہوتی ہے۔لیکن مجاری عادت میں (عادتاً) یہ قوت معاملات، گفتگو، امداد، اور

لڑائی جھگڑے کے وقت ظاہر ہوتی ہے۔ اور مجاری عادت میں (عادتاً) غم وخوشی کا سرایت کرنا گفت وشنید سے مقرون ہوتا ہے۔ جو اس صفت کی طرف مشعر ہوتی ہے۔ اس وجہ سے عوام اس قوت کو دوسری تمام قوتوں سے ممتاز نہیں کر سکتے۔ اور نہ ہی اس کی صفت وصورت ان کے دل میں ممثل ہوتی ہے۔ جب یہ شخص دوام عبودیت میں مشغول ہوتا ہے۔ اور اس کی صفات قلبیہ مثلاً محبت، وجد اور شوق بغیر کسی قسم کی بات کیے اور کام کیے مستقل ہوں۔ اور ان چیزوں کے ساتھ اقتران کی احتیاج باقی نہ رہے اور یہ خصلت اس کی تمام صفات قلبیہ میں ظاہر ہو جائے اور قوت غلبہ بھی اپنا حصہ پالے۔ تو اس وقت اگر یہ شخص اپنے تلمیذ کی طرف اپنی قوت غلبہ اور ہمت کے ساتھ متوجہ ہوگا تو تلمیذ کی روح کو قابو میں کر لے گا۔ اور اپنی چشم ہمت کو اس کے دل ودماغ میں پیوست کر دے گا۔ محبت ویقین میں سے جو صفت بھی وہ چاہے گا اپنے تلمیذ کے خاطر (دل) میں ڈال دے گا۔ اس کو تاثیر توجہ اور قبولیت کی نظر سے دیکھنا کہتے ہیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ قوت غلبہ کے ساتھ توجہ اور تلمیذ کو صفات محمودہ میں سے کسی صفت میں رنگ دینا ایک بہت بڑی نعمت اور عظیم اعانت ہے۔" [الطاف القدس: مطبع احمدی، ص ۰۳-۱۳]

مولانا شاہ نعیم اللہ نقشبندی بہرائچی، خلیفہ حضرت مرزا مظہر جان جاناں نے معمولات مظہریہ میں حضرت مجدد (شیخ احمد سرہندی) کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

"انہوں نے بعض لوگوں کے سوال کہ پیر اول کی زندگی میں اگر کوئی طالب دوسرے شیخ کی خدمت میں طلب حق کرے تو اسے اجازت ہے یا نہیں کے، جواب میں اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"مقصود حق سبحانہ تعالیٰ ہے اور پیر اس کے لیے وصول حق کا وسیلہ ہے۔ اگر طالب اپنی رہنمائی دوسرے شیخ کے پاس دیکھتا ہے اور اس کی صحبت میں اپنے دل کو مطمئن پاتا ہے تو جائز ہے کہ پیر کی زندگی میں اس کے اذن کے بغیر اس شیخ کی خدمت میں چلا جائے اور اس سے رہنمائی حاصل کرے؛ لیکن چاہئے کہ پہلے پیر کا انکار نہ کرے اور سوائے بھلائی کے اس کا ذکر نہ کرے۔ خصوصاً اس زمانے میں کہ پیری مریدی ایک رسم سے زیادہ نہیں رہ گئی ہے۔ اکثر پیر اپنی خبر نہیں رکھتے اور ایمان کو کفر سے تمیز نہیں کر سکتے، حق سبحانہ تعالیٰ کی کیا خبر رکھ سکتے ہیں اور مرید کو

کیا راہ دکھا سکتے ہیں۔

آگہ از خویشتن چو نیست چنیں
چہ خبر دارد از چناں و چنیں

افسوس ہے اس مرید پر جو اس طرح کے پیر پر اعتقاد کر کے مطمئن ہو جائے اور کسی کامل کی طرف رجوع نہ کرے اور راہِ حق جل شانہ معلوم نہ کرے۔ شیطانی وسوسہ ہے جو حیات پیر ناقص کی راہ سے آ کر طالب کو حق سبحانہ سے روکتا ہے۔ جس جگہ ہدایت اور دل کا اطمینان پایا جائے بے توقف اس کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ شیطانی وسوسہ سے پناہ ڈھونڈنی چاہئے۔"

[معمولات مظہریہ، اردو ترجمہ، ص: ۸۶]

مولانا نعیم اللہ بہرائچی مزید لکھتے ہیں:

"حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہ نے اس کے جواز میں علمائے بخارا سے فتوی حاصل کیا تھا۔ البتہ اگر ایک سے خرقہ ارادت حاصل کیا ہے تو دوسرے سے خرقۂ ارادت نہ لے۔ اور اگر لے تو خرقۂ تبرک لے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرا پیر ہرگز نہ بنائے۔ بلکہ جائز ہے کہ خرقۂ ارادت ایک سے لے اور تعلیم وطریقت دوسرے سے حاصل کرے اور صحبت تیسرے سے رکھے۔ اور اگر یہ تینوں ایک سے حاصل ہوں تو کیا اچھی نعمت ہے۔ اور جائز ہے کہ متعدد مشائخ سے تعلیم وصحبت کا استفادہ کرے۔ جاننا چاہئے کہ پیر وہ ہے جو مرید کو حق سبحانہ کی طرف رہنمائی کرے۔ یہ بات تعلیم طریقت میں زیادہ ملحوظ اور زیادہ واضح ہے کہ پیر تعلیم استاد شریعت بھی ہے اور رہنمائے طریقت بھی ہے۔ بخلاف پیر خرقہ کے۔ پس پیر تعلیم کے آداب کی زیادہ رعایت کرنی چاہئے کہ وہ پیر کہے جانے کا زیادہ مستحق ہے۔ نیز حضرت ایشاں (مرزا مظہر جان جاناں) فرماتے تھے کہ یہ فقیر کسب سلوک کے دوران اپنے مشائخ سے اس قدر قوی اعتقاد اور عظیم محبت رکھتا تھا کہ حضرت امام مہدی موعود ظہور فرماتے تو بھی اپنے مشائخ کی اتباع سے باز نہ رہتا۔ اور بلند ہمتی اس قدر تھی کہ دل میں یہ پختہ عزم تھا کہ انشاء اللہ تعالی سلوک میں سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی سے اگر سبقت نہ لے جاؤں تو خود کو ضائع اور برباد کروں گا۔ پس جو شخص ہمارے مشائخ جیسا شیخ کامل رکھے اسے لازم ہے کہ دوسرے شیخ کی طرف رجوع نہ کرے مگر پیر ناقص سے

رجوع خود ضروری ہے کہ وہ اس قابل نہیں کہ اس کے ساتھ صحبت رکھی جائے۔ بلکہ اس کے ساتھ صحبت رکھنا اپنی استعداد کو ضائع کرنا ہے۔[معمولات مظہریہ، ص:۸۸۔۸۹]

مولانا نعیم اللہ بہرائچی نے معمولات مظہریہ میں شیخ احمد سرہندی کے حوالے سے لکھا ہے:

''حضرت مجدد رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسالہ مبدا و معاد میں فرماتے ہیں کہ پیر کے حقوق تمام حق والوں سے بڑھ کر ہیں۔ ولادت صوری (جسمانی پیدائش) اگر چہ والدین سے ہے لیکن ولادت معنوی (روحانی پیدائش) پیر سے متعلق ہے۔ ولادت صوری کی حیات چند روزہ ہے اور ولادت معنوی کی حیات ابدی ہے۔ مرید کی باطنی نجاست کو پیر ہی ہے جو اپنے قلب و روح سے صاف کرتا ہے۔ بعض مریدوں میں توجہات کے وقت محسوس ہوتا ہے کہ ان کی باطنی نجاستوں کی تطہیر میں ان کا کچھ اثر صاحب توجہ میں بھی سرایت کرتا ہے اور اسے کچھ دیر کے لیے مکدر کرتا ہے۔ پیر ہی ہے جس کے وسیلے سے لوگ خدا تک پہنچتے ہیں جو تمام دنیوی اور اخروی سعادتوں سے بڑھ کر ہے۔ پیر ہی کہ وسیلے سے نفس امارہ جو بالذات خبیث ہے مزکی اور مطہر (پاک و صاف) ہو جاتا ہے اور امارگی (نفس امارہ کا ہونا) سے اطمینان تک پہونچتا ہے اور کفر جبلی (طبعی کفر) سے اسلام حقیقی کی طرف آتا ہے۔ ع۔ گر بگویم شرح آں بے حد بود۔ پس اپنی سعادت قبول پیر میں اور بدبختی اس کے رد میں سمجھنی چاہئے۔ نعوذ باللہ سبحانہ من ذالک۔ (اس سے اللہ کی پناہ) رضائے حق جل شانہ کو پیر کے پس پردہ رکھ دیا گیا ہے۔ جب تک مرید اپنے کو پیر کے مرضیات میں گم نہیں کرے گا حق سبحانہ کے مرضیات تک نہیں پہونچے گا۔ مرید کی تباہی پیر کے تکلیف دینے میں ہے۔ جو لغزش بھی اس کے بعد ہو اس کا تدارک ممکن ہے۔ لیکن پیر کی تکلیف دہی کا کسی طرح تدارک نہیں ہوسکتا۔ آزار پیر بدبختی کی جڑ ہے۔ عیاذاً باللہ سبحانہ من ذالک۔ اسلامی معتقدات میں خلل اور احکام شرعیہ کی ادائیگی میں فتور اسی کے اثرات سے ہے۔ آثار و مواجید (قلبی کیفیات) جو باطن سے تعلق رکھتے ہیں ان کا کیا ذکر۔ اور اگر آزار پیر کے بعد احوال کا کچھ اثر باقی رہے تو اسے استدراج سمجھنا چاہئے جو بالآخر خرابی تک پہنچے گا۔ اور نقصان کے سوا کوئی نتیجہ نہ دے گا۔ انتھی۔ یہی سبب ہے کہ حضرت ایشاں (مرزا مظہر جان جاناں) فرماتے تھے کہ فقیر ساتھیوں کی لغزش۔ سے اس قدر ناامید نہیں ہوتا جس

قدر ان دو باتوں سے۔ایک دنیا داروں کے ساتھ اختلاط سے۔دوسرے پیر کے ساتھ بد اعتقادی سے۔ یہ دونوں مہلک امراض میں سے ہیں اور لاعلاج ہیں۔''

[معمولات مظہریہ۔ص:۹۴۔۹۵]

اس کے علاوہ کتاب مذکور میں کیفیت ذکر رابطہ، مرید کو توجہ دینے اور القا کرنے کے کیفیت، امراض ظاہری و باطنی سلب کرنے کا طریقہ، اہل نسبت وغیرہ کے احوال باطن کی کیفیت معلوم کرنے کا طریقہ، احوال میت معلوم کرنے کا طریقہ، قلبی خطرات کی کیفیت معلوم کرنے کا طریقہ، توبہ وصلاح وتقوی کی فیض رسانی کا طریقہ، جلب منفعت وسلب مضرت کا طریقہ، کے حوالے سے بھی ایسی تفصیلات بیان کی گئی ہیں جن سے مشائخ نقشبندیہ کے نزدیک پیراور شیخ کی تاثیر وتوجہ کا اعتراف پایا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸ویں صدی میں دہلی کے علما نے سفرسلوک کے لیے شیخ ومرشد کی رہنمائی اور صحبت کی ضرورت اور اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔پیر سے محبت اور تعظیم کا رشتہ قائم کرنے اور جذباتی وابستگی استوار کرنے کی تلقین کی ہے۔تاہم ان حضرات نے پیر کامل کی پیروی کی ہدایت کی ہے اور پیر ناقص سے بچنے کی نصیحت بھی کی ہے۔ ساتھ ہی یہ حضرات تصور شیخ ، رابطہ بالشیخ ، ہمت شیخ ،اور توجہ وتاثیر شیخ کو جائز سمجھتے ہیں اور اس کی تعلیم دیتے ہیں۔ان امور کو یہ حضرات شاہ محمد اسماعیل دہلوی کی طرح ''بدعات'' میں شمار نہیں کرتے ہیں۔ان میں سے سردست صرف زیارت مزارات وقبور اور عرس کی تقریبات کے حوالے ان اہل علم وعرفان علما کے معمولات بیان کیے جارہے ہیں۔

زیارت مزارات وقبور

شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کے سوانح نگاروں کے مطابق اور خود ان کے مکتوبات اور کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مزارات پر حاضری دیتے تھے۔ مشائخ کے عرس کی تقریبات اور فاتحہ خوانی کا اہتمام کرتے تھے۔(تفصیلات کے لیے ،تاریخ مشائخ چشت، تکملہ سیر الاولیا، کشکول کلیمی، مکتوبات کلیمی، مناقب فخریہ، فخر الطالبین کی طرف رجوع کریں)۔اسی سلسلہ کے مشہور شیخ مولانا فخر الدین نظامی کے بارے میں روایت ہے کہ:

جب وہ دکن سے دہلی آ رہے تھے تو انہوں نے حضرت خواجہ معین الدین اجمیری علیہ الرحمۃ کے مزار کی زیارت کی۔ اس کے بعد وہ حضرت خواجہ قطب الدین علیہ الرحمہ کے آستانہ پر حاضر ہوئے۔ پھر وہ شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کے مزار پر پہونچے۔ [مناقب فخریہ، ص:۹۔۱۰]

خواجہ میر درد اگر چہ نقشبندی مجددی سلسلہ سے بیعت وارادت رکھتے تھے تاہم ان کے حوالے سے ہم یہ بھی پڑھتے ہیں کہ وہ اپنے والد ماجد خواجہ ناصر عندلیب کے یوم وفات کی یاد میں ہر ماہ کی دوسری تاریخ کو محفل سماع منعقد کرتے تھے [میخانۂ درد، ص: ۱۵۔۱۴۷]

مرزا مظہر جان جاناں کے مرید وخلیفہ شاہ غلام علی دہلی میں مختلف سلاسل کے مشائخ کے مزارات کی زیارت کرتے تھے۔ [درالمعارف، ص: ۵۔۶]

وہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور دیگر مشہور اور ممتاز مشائخ طریقت کا عرس بھی مناتے تھے۔ اپنے شیخ کی طرح وہ بھی اسراف اور خرافات سے بچنے کی تلقین کرتے تھے۔ (تفصیل کے لیے درالمعارف دیکھیں)

ایک بار شاہ غلام علی مرزا مظہر جان جاناں کے مزار پر حاضر ہوئے۔ پائیدان کے پاس سے تھوڑی دھول اٹھا کر اپنے چہرے اور سینے پر ملنے لگے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا، ''یا حضرت میں اتنا کمزور ہو گیا ہوں کہ نماز کے لیے کھڑا نہیں ہو سکتا اور قرآن کی تلاوت نہیں کر سکتا۔ آپ نے میری تربیت کی ہے۔ اللہ تعالی آپ کے وسیلے سے میرا خاتمہ بالخیر فرمائے!''

[ملفوظات شریفہ، ص: ۱۴۲۔۱۴۳]

شاہ ولی اللہ نے ''انفاس العارفین'' میں اپنے والد گرامی شاہ عبدالرحیم کے بارے میں لکھا ہے کہ:

جب وہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمہ کے مزار پر مراقبہ کر رہے تھے تو ان کو ایک بچے (شاہ ولی اللہ) کی پیدائش کی بشارت دی گئی۔ [انفاس العارفین، ص: ۴۴]

شاہ ولی اللہ نے خود اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے کہ:

''اپنے والد کی وفات کے بعد کم وبیش بارہ سال تک دینی اور عقلی علوم پر کتابوں کی تدریس میں مشغول رہا۔ ہر عمل پر غور وخوض کرتا رہا۔ اور جب اپنے والد کی قبر مبارک پر مراقبہ کرتا

تھا تو اس دوران توحید اور راہِ جذب کے اسرار کھلتے اور سلوک کا ایک عظیم حصہ میسر آتا۔ اور علوم وجدانیہ نازل ہوتے۔ مذاہب اربعہ کی کتابوں اور ان کے متمسک احادیث کے ملاحظہ کے بعد نورِ غیبی کی مدد سے میرے دل نے فقہا کی روش کو اختیار کیا۔ بارہ سال کے بعد حرمین محترمین کی زیارت کا شوق بیدار ہوا۔ ۴۳ ویں سال حج سے مشرف ہو کر ۴۴ ویں سال مکہ معظمہ کی مجاورت اور مدینہ منورہ کی زیارت میں گزرا۔'' [الجزء اللطیف مشمولہ در انفاس العارفین، ص: ۱۹۵]

شاہ ولی اللہ اپنے والد کے عرس کے دن ان کے قبر کی زیارت کرتے تھے۔

[القول الجلی، ص: ۳۶]

شاہ محمد اسماعیل دہلوی نے ''تقویۃ الایمان'' میں پیری مریدی کے ادارہ پر تنقید کی ہے۔ حضرت آسی نے اس اہم ادارہ کی افادیت اور راہ سلوک میں اس کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور دوسروں کو اس کی دعوت بھی دی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

عشق کامل ہو تو مرشد نہیں ایسا کوئی
خود وہی قبلہ وہی قبلہ نما ہوتا ہے

ہمت شیخ کی صیقل کی بدولت آسی
یہی دل آئینۂ روئے خدا ہوتا ہے

راہِ حق کی ہے اگر آسی تلاش
خاکِ رہ ہو مردِ حق آگاہ کی

ان اشعار میں حضرت آسی نے روحانی سفر کی دونوں جہتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جس کو معرفت اور حقیقت کی دولت راہِ جذب سے حاصل ہو اس کے لیے اس کا عشق کامل ہی اس کا قبلہ اور قبلہ نما ہوتا ہے۔ تاہم جو لوگ راہِ سلوک پر چل کر روحانی سفر کو طے کرنا چاہتے ہیں ان کو وہ کسی مردِ حق آگاہ کی خاک رہ ہونے کی تلقین کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ دیگر صوفیہ کرام کی طرح مرید میں شیخ و مرشد کی ہمت و توجہ کی تاثیر کو بھی تسلیم کرتے ہیں جس کی بدولت مرید کا دل تجلیات الٰہی کا آئینہ ہو جاتا ہے۔ اگلے شعر میں حضرت آسی پیر و مرشد کے نائب رسول اور خلیفۂ رسول ہونے کے موقف کی حمایت کرتے ہیں اور صوفیہ کرام کی روش کو راہ نبوت سے جوڑ کر

رسول کریم ﷺ لے کر موجودہ شیخ تک روحانی تعلیم کے تسلسل کی وضاحت بھی کرتے ہیں۔

ظاہر و مظہر میں فرق ایسا نہیں
پیر ہاتھ آیا تو پیغمبر ملے

ان اشعار میں حضرت آسی نے راہ سلوک اور قرب خداوندی کے لیے شیخ مرشد کی ضرورت اور ارشاد و ہدایت کے لیے شیخ کے کردار اور روحانی تاثیر کا اعتراف کیا ہے۔ یہ اعتراف صرف الفاظ ہی میں نہیں بلکہ ان کے سوانحی حالات یہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے ابتدا میں طالب و مرید ہو کر اور پھر مرشد و پیر کی حیثیت سے اس پر عمل بھی کیا ہے۔ وہ پیر کو وسیلہ مانتے ہیں اور اس سے توسل واستعانت کو روا جانتے ہیں۔ مخالفین کے اعتراضات اور طعن و تشنیع کو تہمت بے جا قرار دیتے ہیں۔

نسبت شرک بجز تہمت بے جا کیا ہے
دل ہے جب اس کی طرف، رخ ہے وسائل کی طرف
مستیِ نعرۂ ہو حق بھی کہیں وعظ میں ہے
چھوڑ کر حق کو عبث جاتے ہیں باطل کی طرف
طعن و تشنیع سے نقصان نہیں ظاہر کا
طعن ناقص کبھی عائد نہ ہو کامل کی طرف

مسئلۂ زیارت پر حضرت شاہ عبدالعلیم آسی کا موقف بھی دیگر مشائخ کی تحریروں اور معمولات کے مطابق ہے۔ انہوں نے اپنے اشعار میں سلسلۂ رشیدیہ کے مشائخ اور سرزمین جون پور سے اپنی قلبی اور جذباتی وابستگی کو بیان کیا ہے۔ اپنے شوق زیارت کا اظہار بھی کیا ہے

مشعل راہ ہدایت ہے اگر ہاتھ آجائے
ذرۂ خاک کف پائے محمد ارشد
دل کو کر دیتی ہے مرآت جمال ازلی
نگہ لطف دل آرائے محمد ارشد
دوست کا دوست بھی ہے آئینہ دار رخ دوست
عارف حق ہے شناسائے محمد ارشد

آستانۂ شیخ کی محبت اور شوق زیارت کا جذبہ بھی رکھتے ہیں۔

آسی خاک نشین ہے تو سیہ کار ضرور
سگ درگاہ رشیدی ہے برا کیا کہیے
پھر لا ملائے مجھ کو خدا جون پور سے
تقدیر کر رہی ہے جدا جون پور سے
احباب جون پور سے پھر وصل ہو نصیب
کرتا چلا ہوں یہ بھی دعا جون پور سے
بے وصل رہ گیا میں اگر عاشقی بھی کی
دردِ فراق ساتھ چلا جون پور سے

حاصل کلام

حضرت شاہ عبدالعلیم آسی نے ۱۸ویں صدی کے نصف آخر اور ۱۹ویں صدی کے نصف اول میں اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار اپنے اشعار میں کیا ہے۔ ان خیالات اور ان کے سوانحی حالات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ علمی اور عملی طور پر تصوف اور اہل تصوف کے موقف، افکار و نظریات اور معمولات سے مکمل اتفاق رکھتے تھے۔ اس دور میں شاہ محمد اسماعیل دہلوی کی تحریک طریقۂ محمد یہ کے اثرات کی وجہ سے پیدا تصوف مخالف رجحانات کے رد کی طرف انہوں نے اپنے اشعار میں اشارے بھی کیے ہیں۔ ان کا موقف پیش رو صوفیہ کرام کی تعلیمات کے مطابق تھا۔ وہ دیگر صوفیہ کرام کی طرح اصلاح وتجدید کے تناظر میں ایمان وعقیدے کی درستگی، شریعت پر عمل، قرآن وسنت کی اطاعت واتباع کے ساتھ ساتھ کسی کامل مرشد کی نگرانی وتربیت میں سفر سلوک پر چلنے کی تلقین کرتے تھے۔ اسی لیے ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کے مطالعہ میں ''اصلاح وتجدید'' کو کسی ایک تحریک سے جوڑنے کو کوشش پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ جن تحریکوں نے '''اصلاح وتجدید'' کے الفاظ کو اپنی امتازی شناخت کے طور پر پیش کیے ہیں انہوں نے ان تصورات کے معانی ومفاہیم کی تشریح وتعبیر میں کون سی تبدیلیاں کی ہیں۔ کیوں کہ زبان وبیان کے مطالعات میں یہ حقیقت تسلیم کی گئی ہے کہ

وقت وحالات اور سیاق وسباق کے لحاظ سے الفاظ کے معانی میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔اس طرح سے یہ جاننے میں مدد ملے گی کہ کیا، تصوف اور اہل تصوف کے منکرین نے جن ''اصطلاحات صوفیہ'' کو بنیاد بنا کر تصوف کا انکار کیا ہے،ان کے صوفیہ کرام کے نزدیک وہی معانی تھے جو یہ منکرین تصوف کہہ رہے ہیں۔اس مضمون میں یہی دیکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ شاہ محمد اسماعیل دہلوی نے صوفیہ کرام کے نظریات اور معمولات پر تنقید کرتے ہوئے جو معانی ومطالب بیان کیے ہیں وہ صوفیۂ کرام کی توضیحات وتشریحات سے مختلف ہیں۔

☆☆☆

باب پنجم

احوال وکمالات

آئینۂ حیات آسی

نام : محمد عبدالعلیم
تاریخی نام : ظہور الحق
تخلص : پہلے عاصی بعد میں آسی
معروف : حضرت آسی غازی پوری اور حضرت آسی سکندر پوری
لقب : قطب عالم، بحرالاسرار، قاسم الانوار، قطب العرفاوالعشاق
عرف : حضرت مولانا، سرکار آسی
ولادت : ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۲ء
وطن مالوف: سکندر پور، بلیا، یوپی
والد بزرگوار : شیخ قنبر حسین رشیدی سکندر پوری
نسب : فاروقی
مذہب : سنی حنفی
مشرب : صوفی قادری
مسلک : ماتریدی
تعلیم : خانقاہ رشیدیہ، جون پور و مدرسہ حنفیہ، جون پور
اساتذہ : قطب الہند شیخ غلام معین الدین رشیدی جون پوری،
نانا مفتی احسان علی آروی، علامہ عبدالحلیم فرنگی محلی لکھنوی،
مفتی محمد یوسف فرنگی محلی لکھنوی
علامہ عبدالحلیم فرنگی محلی لکھنوی
بیعت وارادت: قطب الہند شیخ غلام معین الدین رشیدی جون پوری
[چھٹویں سجادہ نشیں: خانقاہ رشیدیہ، جون پور]
سلسلۂ طریقت: سلسلۂ عالیہ قادریہ احمدیہ
عقد مسنون : غازی پور میں منشی راحت علی غازی پوری کی بڑی صاحبزادی سے
منصب سجادگی: سجادگی خانقاہ عالیہ رشیدیہ جون پور میں ۱۳۱۴ھ میں حاصل ہوئی

اولاد : صرف دو صاحبزادیاں جنت بی بی اور عزت بی بی تھیں

تصانیف : عین المعارف (دیوان آسی)، فوائد جوہریہ، سراج الصرف، فوائد محمدیہ، فوائد سراجیہ، رسالۂ فریدیہ، رسالۂ احمدیہ وغیرہ جیسی علمی وفنی کتابیں تصنیف فرمائیں۔

ممتاز تلامذہ : مولانا عبدالاحد شمشاد لکھنوی، مولانا عبدالمجید کاتب مصطفیٰ آبادی، مولانا سید محمد شاد غازی پوری، مولانا علی گوہر پھلواروی، مولانا عبدالاحد شمشاد لکھنوی، فدائی جون پوری، مولانا احمد حسین لبیب سکندر پوری، مولانا محمد احمد ایمن سکندر پوری، حکیم شاہ فریدالدین احمد فرید، شاہ محی الدین حسن حیات غازی پوری، مولانا عبدالصمد صمد غازی پوری، شیخ محمد حسین باقی غازی پوری وغیرہ نامور اور باکمال علما و شعر تلامذہ ہیں

ممتاز خلفا : سید شاہ شاہد علی سبز پوش فانی گورکھ پوری، حکیم سید شاہ عبدالعزیز بہاری، شاہ محمد اویس پھلواری، مولانا سید شاہ محمد فاخر بیخود اجملی الٰہ آبادی، سید شاہ نذیر احمد بہاری، شاہ عبدالحق ظفر آبادی، مولانا شاہ عبدالسبحان گورکھ پوری، شاہ ذاکر حسین قتال پوری، مولانا شاہ ولی الرحمٰن ولی علیمی پوکھریروی، مولانا عبدالرحیم سیوانی، شاہ الفت حسین غازی پوری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

کمالات : عالم، فقیہ، منطقی، فلسفی، مرشد، مربی، صوفی، عارف، شاعر، مصنف، استاذ و مدرس

خدمات : دینی و مذہبی، اخلاقی و روحانی، علمی و ادبی، تصنیفی و تحقیقی، سماجی و معاشرتی مختلف میدانوں میں اپنی گراں قدر خدمات پیش کیں۔ درس و تدریس کے ذریعے نامور شعرا و تلامذہ، تربیت و تزکیہ کے ذریعے صاحب فضل و کمال خلفا و مریدین اور اپنی علمی صلاحیت کا مظاہرہ فرماتے ہوئے مختلف علوم و فنون پر قابل قدر رسالے تحریر فرمائے، عین المعارف کی شکل میں شائقین علوم طریقت و معرفت کو عمدہ سامان اور بیش قیمت تحفہ عطا فرمایا اور عارفانہ و صوفیانہ شاعری کو فروغ دے کر اس میں ممتاز مقام حاصل کیا، چودھویں صدی ہجری میں میں تصوف و سلوک کی بہترین ترجمانی و علم برداری کر کے تصوف و صوفیہ کے مشن کو آگے بڑھایا، سلسلۂ رشیدیہ جون پور کی تعمیر و توسیع اور اس کے دائرۂ دعوت و ارشاد کو ملک و بیرون ملک میں خوب وسیع و عام کیا۔

وصال مبارک: ۲ رجمادی الاولی ۱۳۳۵ھ/ ۲۵ رفروری ۱۹۱۷ء پچاسی برس کی عمر میں

مزار پر انوار : محلہ نورالدین پورہ، غازی پور، ضلع بلیا، یوپی میں مرجع انام ہے۔

حضرت آسی کی حیات کا ایک تحقیقی مطالعہ

مولانا محمد ذاکر حسین لطیفی ★

قطب العارفین، عمدۃ الواصلین، شیخ الکاملین، زبدۃ العاشقین، بحر الاسرار، قاسم الانوار، قطب العرفا والعشاق حضرت مولانا شاہ محمد عبدالعلیم المتخلص بہ آسی سکندر پوری ثم غازی پوری قدس سرہ ۱۹؍ شعبان المعظم ۱۲۵۰ھ مطابق ۲۱؍ دسمبر ۱۸۳۴ء دن اتوار کو مشرقی یوپی شگفتہ ریز سرزمین گل و یاسمن قصبہ سکندر پور ضلع بلیا میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اسم گرامی عبدالعلیم ہے۔ ''عین المعارف'' کی روشنی میں تاریخی نام ''ظہور الحق'' (۱۲۵۰) اور ''سمات الاخیار'' کے مطابق ''خلیل اشرف'' (۱۲۵۰) (بصورت سقوط ہمزہ) ہے، مگر آپ کے پیر دستگیر قطب الہند حضرت شیخ غلام معین الدین رشیدی جون پوری (متوفی ۱۳۰۷ھ) پیار سے آپ کو ''حلیم'' کہہ کر یاد کیا کرتے تھے اور عقیدت مندوں کی زبان ''حضرت مولانا'' کے لفظ سے مانوس تھی۔ آپ مسلکاً حنفی اور مشرباً قادری تھے۔

حلیہ و سیرت

آپ دراز قامت، گداز بدن، گول چہرہ، سیاہ آنکھیں، گول گنجان داڑھی، سڈول جسم اور سرخ و سفید رنگ کے حامل تھے۔ آپ نہایت حسین و جمیل، وجیہ صورت اور ہنس مکھ چہرہ کے مالک تھے۔ طبیعت میں نرم مزاجی، سادگی، عجز و انکساری، حلم و بردباری، ایثار و قربانی، طہارت و پاکیزگی اور

☆ استاذ: دارالعلوم سرکار آسی سکندر پور، بلیا، یوپی

تقویٰ شعاری جیسی خوبیاں بکثرت موجود تھیں۔ غیبت وشکایت اور چغل خوری و بدکلامی سے آپ کو بے حد نفرت تھی۔ خرد وکلاں، امیر وغریب اور اپنے و بیگانے سب کے ساتھ محبت سے پیش آتے۔ الغرض آپ اعلیٰ اخلاق وکردار کے حسین مجسمہ تھے اور اس کی تعلیم و تلقین بھی کرتے، فرماتے ہیں؎

اخلاق سب سے کرنا تسخیر ہے تو یہ ہے
خاک آپ کو سمجھنا اکسیر ہے تو یہ ہے

والد گرامی

آپ کے والد ماجد قطب العارفین حضرت شیخ قنبر حسین رشیدی سکندر پوری تھے۔ آپ کے حسب ونسب کے متعلق مختلف اقوال پائے جاتے ہیں۔

صاحب سمات الاخیار نے فرمایا ہے کہ ''آپ شوخ انصار سے ہیں'' اسی کی تائید ''عین المعارف'' سے بھی ہوتی ہے کہ: ''آپ کے والد ماجد قطب العارفین حضرت شیخ قنبر حسین قدس سرہ نسباً سلسلۂ جدی سے انصاری تھے جو جد مادری آپ کے اجداد کے بندگی شیخ مبارک قدس سرہ تھے جو حضرت مولانا مظفر بلخی کی اولاد میں تھے اور عدن سے سکندر پور تشریف لائے تھے۔'' ڈاکٹر سید شاہ طیب ابدالی نے ''انتخاب کلام آسی'' میں آپ کا پدری نسب فاروقی اور مادری حسب صدیقی بتایا ہے۔ اسی طرح مولانا وکیل احمد عاجز سکندر پوری کے نبیرۂ گرامی (پوتا) مناظر الحق امیر احمد فاروقی رشیدی قادری، حال مقیم کراچی نے اپنی تصنیف ''عظمت آسی'' میں تحریر فرمایا ہے کہ: ''حضرت آسی علیہ الرحمہ کا نسب نامہ فخر وامتیاز کے لیے رقم نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس لیے تحریر کر رہا ہوں کہ آپ کے نسب کے بارے میں مختلف مقالہ جات اور کتب میں غلط درج ہے تا کہ ازالہ ہو جائے۔''

مولانا عبد العلیم آسی، بن قنبر حسین، بن محمد وسیم، بن محمد عطاء، بن محمد بزرگ، بن درویش محمد، بن غوث محمد، بن محمد قطب، بن شیخ تاج محمود، بن حضرت بندگی محمد مبارک، بن خواجہ رکن الدین، بن خواجہ فخر الدین، بن خواجہ مروان، بن محمد قطب الدین، بن بہاء الدین، بن ابو اللیث، بن شیخ میران، بن عبد الجبار، بن عبد اللہ، بن شیخ داؤد، بن نصر الدین، بن امان اللہ، بن فتح اللہ، بن شیخ احمد، بن شیخ محمد، بن عبد القادر، بن عبد المجید، بن عبد الوہاب، بن عبد الفتاح، بن شیخ کمال، بن مطفر بلخی، بن شیخ منصور، بن حبیب اللہ، بن شیخ جنید، بن شیخ حمید، بن شیخ کبیر، بن

شیخ محمد، بن شیخ محمود، بن شیخ احمد، بن شیخ ناصر الدین، بن شیخ طاہر، بن شیخ سالم، بن شیخ حافظ، بن شیخ عبداللہ، بن ابومحمد، بن ابوالحاجی، بن ابوالحماد، بن ابوالحسام، بن ضیاء الدین، بن ابوالحسن سلطان شاہ حسین، بن ابوعبداللہ سلطان معز الدین، بن محمد ناصح سلطان محمد اکرم، بن سید الاولیا سلطان سید ابواسحاق ابراہیم، بن ادہم بلخی، بن سلیمانبن منصور (قیل ناصر) بن عبداللہ بن امیر المؤمنین سیدنا عادل الاصحاب جدنا عمر فاروق"۔

ڈاکٹر ڈی این چترویدی زاہد بلیاوی نے اپنی کتاب "تجلیات آسی" میں ایک خاندانی شجرہ تحریر کیا ہے جو مجمع البحرین، فقیہ عصر شیخ طریقت حضرت مفتی شاہ عبید الرحمٰن رشیدی دامت برکاتہم القدسیہ [زیب سجادہ، خانقاہ رشیدیہ، جون پور] کی تحریر سے ماخوذ ہے۔

پدری نسب

عبدالعلیم بن قنبر حسین بن محمد وسیم بن محمد عطا بن محمد غلام فرید بن محمد عوض بن شیخ فیض اللہ (شیخ فیض اللہ شیخ انصار سے تعلق رکھتے ہیں)

مادری نسب

عبدالعلیم بن قنبر حسین بن محمد وسیم بن ملتمسہ بی بی بنت محمد بزرگ بن درویش محمد بن غوث محمد بن شیخ محمد قطب بن شیخ تاج محمود بن حضرت بندگی شیخ مبارک۔

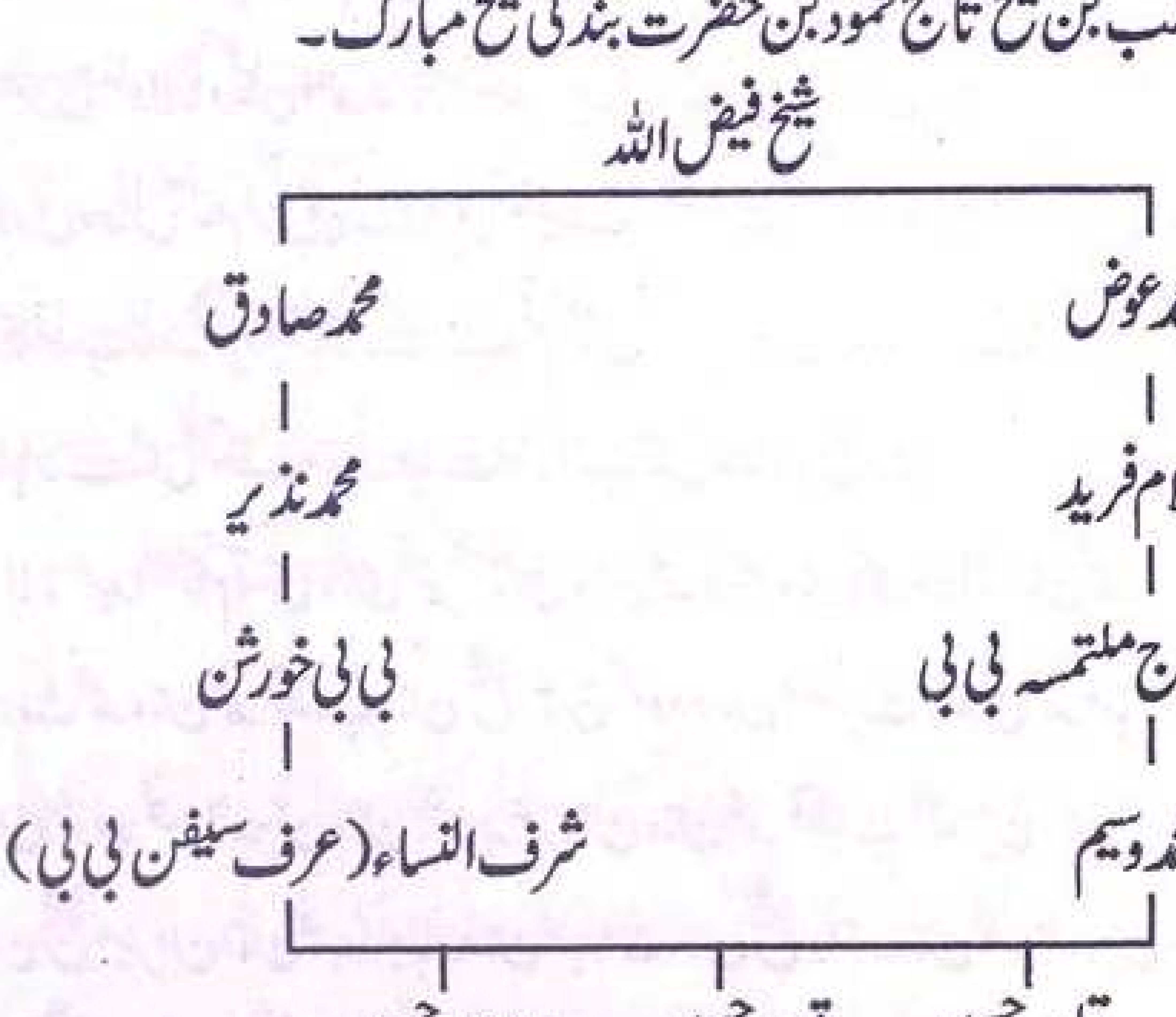

اس شجرہ کے مطابق "محمد بزرگ" جو حضرت بندگی شیخ مبارک عدنی کی اولاد سے ہیں حضرت

محمد عطا کے خسر اور محمد وسیم کے نانا ہوئے۔ مذکورہ نسب نامہ میں امیر احمد فاروقی کے شجرۂ مذکورہ سے یہاں فرق ہو رہا ہے کہ انہوں نے خسر کو والد بتایا ہے، مگر حقیقت وہی ہے جو حضرت صاحب سجادہ نے فرمایا ہے اور ''عین المعارف'' اور ''سمات الاخیار'' سے بھی یہی واضح اور ثابت ہے۔

حضرت آسی کے والد گرامی تین بھائی سے تھے:

(۱) قلندر حسین (۲) قنبر حسین (۳) الطاف حسین

مولانا ولی الحسنین، مولانا وصی الحسنین، مولانا خلیل احمد، مولانا وکیل احمد عاجز، حافظ محمد وحید، مولانا اسعد، مولانا سلیم، مولانا محمد عبد القدوس، مولانا عبد العزیز، مولانا ظہور الحسین۔ مذکورہ حضرات آپ کے چچازاد بھائی تھے جو اپنے دور کے جید علما و فضلا میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان میں مولانا وکیل احمد عاجز ممتاز تھے۔ ایک قول کے مطابق ۹۱ رکتابوں کے مصنف و مؤلف تھے۔ حیدر آباد دکن میں جج کے عہدہ پر فائز بھی رہے۔ آپ کی نسل آج بھی کراچی، پاکستان میں موجود ہے۔

مادری حسب

شیخ قنبر حسین کی دو شادی ہوئی۔ پہلی شادی موضع قاضی پورہ، ڈاکخانہ ڈومری، ضلع بھوجپور (آرہ) بہار میں حضرت مفتی بدر الدجیٰ بن حضرت مفتی احسان علی علیہما الرحمہ کی دختر نیک اختر کچھنا بی بی اور ایک قول کے مطابق عمدہ بی بی سے ہوئی۔ جس سے حضرت آسی پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کی دوسری شادی کہاں ہوئی تھی، اس کا علم نہیں ہو سکا۔ البتہ ان سے دو لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی۔

حضرت قنبر حسین کی دو شادی

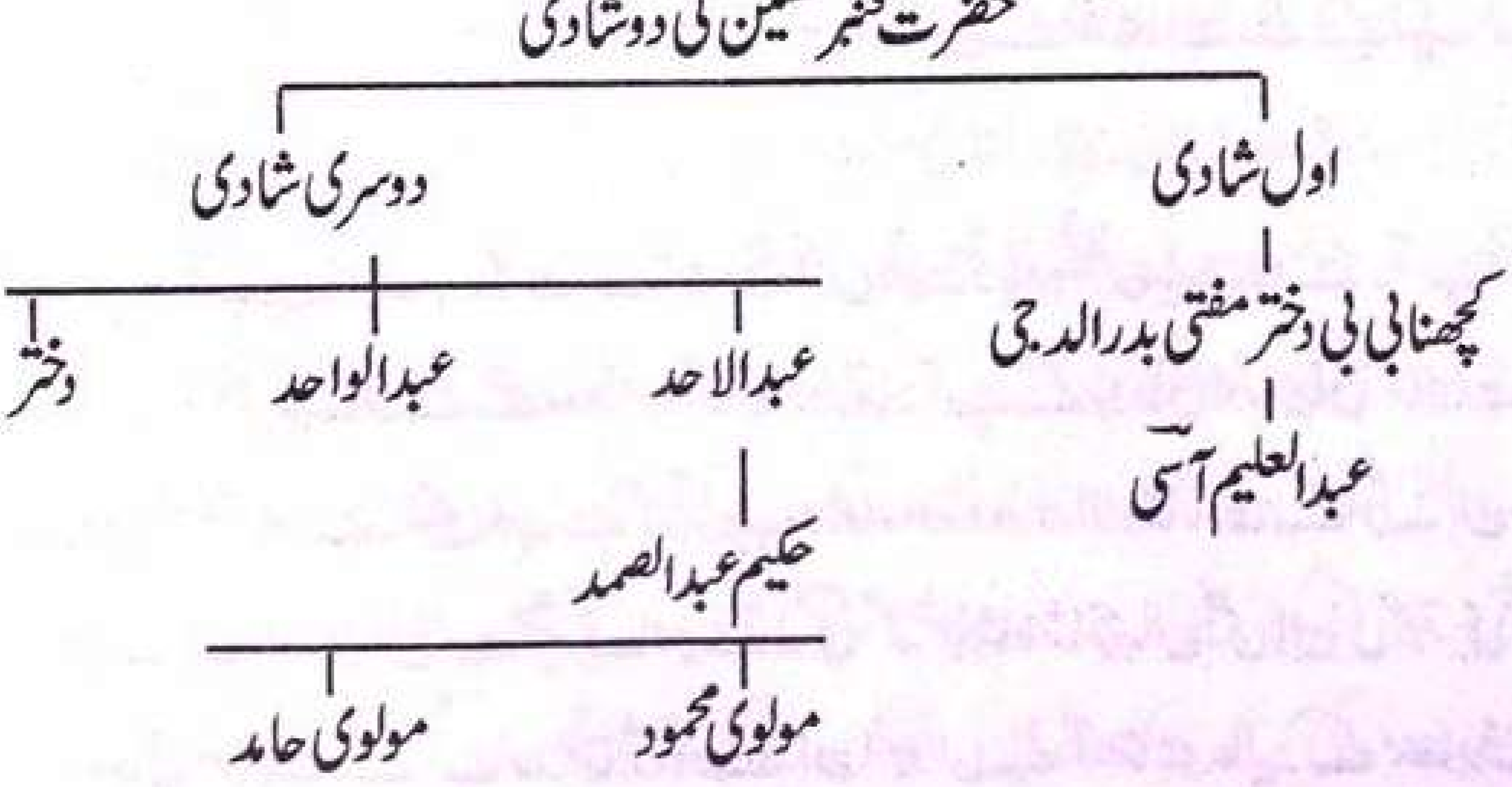

حضرت بندگی شیخ احمد مبارک چشتی عدنی

آپ کے جد مادری (شیخ محمد وسیم) کے عظیم بزرگ حضرت شیخ بندگی احمد مبارک تھے۔ جنہوں نے سکندر پور کی زمین کو اپنا مسکن بنایا۔ آپ سلسلۂ چشتیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ تقریبا ۹۳۴ھ میں پیدا ہوئے۔ نسباً فاروقی تھے۔ غالباً ۲۵ ر سال کی عمر میں اپنے والد گرامی اور پیر و مرشد شیخ الشیوخ حضرت خواجہ رکن الدین چشتی کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے وطن عزیز سرزمین عدن کو ۹۵۹ھ میں خیر آباد کہا اور مع اہل وعیال دین متین کی تبلیغ واشاعت کے لیے اپنے ملک عدن سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے، کیوں کہ سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین غریب نواز چشتی قدس سرہ نے اجمیر کی سرزمین پر پرچم اسلام لہرایا۔ چشتیت کی بنیاد ڈالی اور دھیرے دھیرے سلسلۂ چشت ہندوستان کے وسیع وعریض اطراف میں پھیل گیا۔ اس مناسبت سے آپ کو بھی ہندوستان سے ایک گونہ انسیت تھی۔ اس لیے آپ نے ہندوستان ہی کا انتخاب کیا۔

ایک روایت کے مطابق آپ کے پیر دستگیر نے وصیت فرمائی تھی کہ:

''جہاں مصلّٰی (جائے نماز) چھوٹ جائے وہیں قیام کرو''

ہندوستان کے مختلف مقامات میں آپ کا قیام ہوتا رہا لیکن یہ واقعہ ۹۶۶ھ میں قصبہ سکندر پور ضلع بلیا یوپی میں پیش آیا۔ اس کے بعد سکندر پور کو ہی آپ نے اپنا مستقل مسکن بنایا۔ ۹۶۶ھ سے لے کر ۱۰۱۷ھ تک ایک لمبی مدت یعنی پچاس سال کی زندگی سکندر پور کی سرزمین پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے سانچے میں ڈھال کر دین متین کی تبلیغ واشاعت میں صرف کردی۔ حضرت بندگی کا وجود مسعود سکندر پور اور اس کے مضافات کے لیے ایک مبارک نمونہ ثابت ہوا۔

آپ کی ذات بابرکات سے عوام وخواص بہت زیادہ فیض یاب ہوئے۔ آپ جس دور میں سکندر پور تشریف لائے تھے، وہ کفر والحاد کا دور تھا۔ آپ کے روحانی اور ایمانی کمالات سے لوگوں کافی متاثر ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ قریب وجوار اور دور دراز مقامات کے لوگ ان سے قریب ہوتے گئے اور ایمان سے مشرف ہوتے۔ حتیٰ کہ شہنشاہ شاہجہاں بھی ان کی عبقری شخصیت اور روحانی مرتبت سے بے حد متاثر ہوئے اور انہوں نے آستانۂ عالیہ کے مصارف کے لیے

۱۵۲ گاؤں (قطعۂ ارض) آپ کی خدمت میں نذر پیش کیا۔ اولاً تو آپ قبول کرنے سے گریز کر رہے تھے مگر مریدین ومعتقدین کے اصرار پر منظور کر لیا۔ لیکن آپ نے اپنے لیے کبھی بھی ان کو ذریعۂ معاش نہیں بنایا بلکہ ان کی آمدنی مساجد، مدارس، خانقاہ اور دیگر دینی امور پر آپ صرف کیا کرتے تھے۔ الغرض حضرت بندگی کی آمد سے سکندر پور اور ان کے قرب وجوار کی دنیا ہی بدل گئی۔ بہت حد تک کفر وضلالت کی تاریکیاں دور ہو گئیں اور ہر طرف اسلام کا بول بالا ہوا۔

آپ مشرباً چشتی تھے۔ ہمیشہ ان پر چشتیت غالب رہا کرتی۔ اسی وجہ سے ان کو سماع کا ذوق بہت زیادہ رہا۔ ہر ہفتہ خانقاہ میں بشرائط صوفیۂ کرام مجلس سماع کا انعقاد ہوا کرتا تھا۔ اس میں علاقے کے ارباب علم ودانش اور حضرت کے مریدین ومعتقدین بڑے ادب سے شریک ہوئے اور حضرت بھی تصوفانہ وضع قطع کے ساتھ جلوہ بار ہوتے۔ محفل سماع خوش الحانی، سرور ونغمہ سنجی اور عارفانہ کلام کی دلکشی سے اس طرح پر کیف ہو جاتی کہ تمام سامعین وجد میں آجاتے اور حضرت پر بے خودی اور مستی ودیوانگی چھا جاتی۔ باجود اس کے وہ ہاتھ پیر نہ جھاڑتے اور ہو ہائے نہ کرتے، بلکہ ان پر سکوت غالب رہتی۔ مطرب کے مطربانہ انداز میں نوائے ساز کی دلکشی اگرچہ خوب ہے مگر حضرت کی سکوت ساز کا بھی کوئی جواب نہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

نوائے ساز میں ہے دلکشی لیکن
سکوتِ ساز بھی کچھ کم نہیں ہے

حضرت کے کردار وعمل اور معمولات زندگی سے واضح ہوتا ہے کہ وہ بڑے ہی دیندار، تقویٰ شعار، پرہیز گار اور عبادت گزار تھے۔

کلمۂ طیبہ ہمیشہ ورد زبان رہتا۔ اتباع سنت رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر گامزن رہتے اور حضور کے اسوۂ حسنہ کو نمونۂ حیات بناتے جس طرح فرائض پنج گانہ بجالاتے، اسی طرح تہجد گزاری کی بھی پابندی دیکھی گئی۔ خود نماز پڑھتے اور دوسرں کو بھی نماز پڑھنے کی تلقین فرماتے۔ رات دن ذکر الٰہی، خدمت خلق، درس وتدریس اور وعظ ونصیحت کرنا زندگی کا معمول بن چکا تھا۔ یہی سبب ہے کہ عوام وخواص نے "بندگی" کے لقب سے یاد کرنا شروع کر دیا۔ اب یہ لقب بطور علم مشہور ہو گیا۔ جیسا کہ عموماً حضرت بندگی کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ انہوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں مگر ان کی کوئی کتاب

منظرِ عام پر نہ آسکی۔ صاحب توصیف مبارک کے مطابق:

''آپ کی تصانیف آفات زمانہ کی وجہ سے محفوظ نہ رہ سکیں۔''

آپ صاحب کشف وکرامت بزرگ تھے۔ دعا، تعویذ، جھاڑ پھونک سے حاجت مندوں کی دلجوئی کرتے، کبھی کبھی لوگ ان کے دربار سے خاک یا ٹھکری لے کر جاتے اور مریض کے بازو پر باندھ دیا کرتے۔ بفضلہٖ تعالیٰ مریض شفا پاجاتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت بندگی عظیم شخصیت کے مالک اور اعلیٰ فضل وکمال کے حامل تھے۔ آپ ۸۲ر سال کی عمر پا کر ۱۱ر ربیع الاول ۱۰۱۶ھ واصل حق ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کی نماز جنازہ کس نے پڑھائی اس کی تصدیق نہ ہوسکی۔ غالب گمان یہ ہے کہ آپ کے نور نظر شیخ تاج محمود نے یہ کام انجام دیا ہوگا کیوں کہ یہ بھی بڑے جید عالم اور آپ کے محبوب نظر تھے اور پھر آپ کے جانشین بھی ہوئے۔ بارہویں کی شب تقریباً آٹھ بجے اپنے مخصوص احاطہ بنام محلہ چک مبارک قصبہ سکندر پور ضلع بلیا میں سپرد خاک ہوئے۔ محلہ کا یہ نام بھی انہیں سے منسوب ہے۔ روضۂ اقدس کا احاطہ آج بھی اسی طرح برقرار ہے۔ اس میں انہیں کے دور کے کئی سایہ دار درخت آج بھی سرسبز وشاداب ہیں۔ پیڑ پودوں سے قدامت کی شان جھلک رہی ہے۔

حضرت کا مزار شریف اب بھی بارونق، منبع فیوض اور مرجع خلائق ہے

جو ہوسکے تو جیے اس طرح زمانے میں
کہ مر بھی جائے تو مرگ اس کی زندگانی ہو

حضرت مبیم دردؔ کاکوروی نے بھی قطعۂ تاریخ یوں تحریر کی ہے:

عشق وحدت کے ساز شیخ احمد
حسن کثرت کے راز شیخ احمد
دردؔ سال وصال یوں لکھو
ہادی پاک باز شیخ احمد

(۱۰۱۶ھ)

حضرت آسیؔ کا خاندان جو شیخ انصار سے تعلق رکھتا ہے، ہر زمانہ میں ایک سے ایک نامور

عالم دین اور حکیم حاذق پیدا ہوتے رہے۔ آپ کے جد امجد حضرت بندگی شیخ محمد وسیم بہت بڑے خدا ترس، متقی اور دیندار گزرے ہیں۔ یہ دنیاوی حکام کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ ان کی جانب سے کوئی بلاوا آتا تو خود نہیں جاتے، البتہ کہہ دیا کرتے کہ اگر دین کی بابت ملنا ہے، مل سکتے ہیں ورنہ دنیاوی مقصد کے لیے میں نہیں ملتا۔

آپ کے جد امجد کے زمانہ ہی سے بیشتر لوگ خانقاہ رشیدیہ، جون پور سے ارادت وخلافت کے ذریعے منسلک ہو گئے تھے۔ آپ کے والد ماجد اور آپ کے پیر و مرشد قطب الہند شیخ غلام معین الدین رشیدی جون پوری، قطب العالمین حضرت شاہ امیر الدین رشیدی جون پوری کی نظر عنایت و محبت سے ارادت و خلافت ایک ساتھ حاصل ہوئی اور پھر انہیں کے زیر شفقت ظاہری اور باطنی تعلیم بھی دونوں کی ایک ساتھ ہوئی۔ آپ کے والد ماجد نے بیشتر اوقات سکندر پور میں صرف کیا، اس لیے اہل سکندر پور بالخصوص ان سے زیادہ فیض یاب ہوئے۔ ان کا مزار شریف شاہی جامع مسجد سکندر پور کے مغربی جانب کچھ ہی فاصلہ پر واقع ہے جو مرجع خلائق ہے۔ وہیں پر آپ کے دونوں چچا یعنی قلندر حسین اور الطاف حسین بھی مدفون ہیں۔ جیسا کہ صاحب توصیف مبارک نے لکھا ہے:

"ان تینوں بھائیوں کے مزارات ایک جگہ جامع مسجد سکندر پور کے قریب زیارت گاہ خلائق ہیں"۔ گویا آپ کا آبائی قبرستان یہی ہے۔

پرورش وکفالت

ابھی آپ دس سال کی عمر شریف کو پہنچے بھی نہ تھے کہ والدۂ ماجدہ داغ مفارقت دے کر دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ گھر میں آپ کی پرورش کی صورت جو بھی رہی ہو مگر آپ ننیہال کے بڑے ہی دلدادہ اور عزیز تھے۔ اس لیے ننیہال میں ہی آپ کی بنیادی پرورش بہتر انداز میں ہوئی۔ آپ کے حقیقی نانا حضرت مفتی بدر الدجیٰ تھے اور پرنانا حضرت مفتی احسان علی تھے جو حضرت شاہ غلام حیدر بلیاوی کے اجلۂ خلفا میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کے نانا حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسل سے صدیقی کہلاتے تھے۔ یہ لوگ بڑے ہی دیندار، خدا ترس، تہجد گزار اور نیک اوصاف کے حامل تھے۔ آپ کی نانی صاحبہ نے خود سے بڑے ہی ناز و نعم سے آپ کی

پرورش کی۔ آپ کے سر سے ماں کا سایہ اٹھ گیا، لیکن آپ کو قطعاً ان کا احساس ہونے نہ دیا۔ آپ کی نانی صاحبہ بھی رابعۂ عصر تھیں، ان کو خاتون جنت کی بڑی حضوری حاصل تھی۔

''مفتی صاحب کی اہلیہ صاحبہ کو حضرت خاتون جنت رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حضوری اس طرح حاصل رہتی تھی کہ ادنیٰ ادنیٰ سی بات میں بغیر خاتون جنت سے دریافت کیے ہوئے کوئی کام نہیں کرتی تھیں۔ کسی نے کوئی بات پوچھی آپ نے فرمایا کہ حضرت بی بی سے دریافت کرلوں تو جواب دوں۔ آنکھیں بند کرتیں اور فوراً پوچھ کے جواب دے دیتیں''۔ [عین المعارف، ص:۵۶]

نانیہالی شجرہ حسب ذیل ہے جو ''تجلیات آسیؔ'' سے ماخوذ ہے۔

حضرت مفتی احسان علی

مفتی بدر الدجی

محمد حسن — کچھنا بی بی (منسوب از قنبر حسین)

(محمد حسن کی اولاد:) مفتی عبد الوحید قادری — مفتی راحت — مفتی

(مفتی عبد الوحید قادری کے فرزند:) مہدی غلام قادر (شوہر حضرت بہنی صاحبہ)

تعلیم و تربیت

والدۂ ماجدہ کا سایۂ عاطفت اٹھنے کے بعد نانیہال میں نانا اور نانی کے زیر صحبت ایام طفلی گزارنے اور ابتدائی تربیت حاصل کرنے کا حسین موقع نصیب آیا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم سے لے کر فارسی تک کی بیشتر کتابیں اپنے پرنانا حضرت مفتی احسان علی سے بالاستیعاب پڑھیں۔ آپ بڑے ذہین و فطین تھے۔ صاحب عین المعارف فرماتے ہیں کہ:

''ابتدائی کتابیں تو حضرت نے دوسروں کو پڑھتے ہوئے سن کر یاد کرلی تھیں۔''

۱۲۶۱ھ تک آپ نے نانیہالی زندگی گزاری۔ اس کے بعد تاریخ کی روشنی سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً سات سال تک والد گرامی کے زیر شفقت وطن مالوف سکندر پور میں تعلیم و تربیت کا حسین

لطف اٹھایا۔ پھر ۱۲۶۸ھ میں آپ نے علوم عقلیہ ونقلیہ کے حصول کی غرض سے خانقاہ عالیہ رشیدیہ جون پور شریف کا قصد فرمایا اور حضرت قطب الہند کے زیر سایہ رہ کر کچھ عرصے تک تعلیم حاصل کی۔ آپ کی ذہانت و فطانت سے حضرت بہت خوش تھے۔ اس لیے حضرت کا کمال توجہ آپ پر مرکوز رہا۔ اس کے بعد حضرت کے منشا کے مطابق جب آپ ''میر قطبی'' پڑھ رہے تھے تو مدرسہ حنفیہ جون پور (جو آپ کے تعلیمی دور میں قائم ہوا تھا) میں علامہ عبدالحلیم فرنگی محلی سے تعلیم حاصل کرنے لگے۔

اس وقت ''ملا حسن'' اور ''قطبی'' وہاں کے نصاب میں داخل نہ تھی، اس مجبوری کی وجہ سے آپ ''ملا جلال'' کی جماعت میں سماعت کرنے لگے۔ مولانا صاحب کی نگاہ آپ پر پڑی تو انہوں نے آپ کا تعارف پوچھا۔ آپ نے صاف صاف جواب دیا پھر پوچھا کہ کیا پڑھتے ہو؟ آپ نے کہا ''میر قطبی''، مولانا صاحب کو حیرت ہوئی اور انہوں نے فرمایا کہ ابھی ''میر قطبی'' پڑھ رہے ہو۔ ''ملا حسن'' سے ابھی تک کوئی سابقہ نہیں رہا، چلئے ''ملا جلال'' کی سماعت کرنے۔ آپ نے فرمایا کہ جو سبق آپ نے پڑھایا ہے، سماعت فرمالیں۔ انہوں نے محض سبق کا مطلب پوچھا آپ نے شرح وبسط کے ساتھ جو تشریح فرمائی، اس نے حضرت مولانا فرنگی محلی کو حیرت میں ڈال دیا، وہ بہت خوش ہوئے اور دعاؤں سے نوازا۔ اور جب آپ نے ''ملا حسن'' پڑھنے کی خواہش ظاہر کی تو آپ کی خواہش کی قدر کرتے ہوئے از خود ''ملا حسن'' پڑھانے لگے۔ جب حضرت فرنگی محلی کی نگاہ آپ پر بہت زیادہ مائل بکرم ہوئی تو موقع غنیمت سمجھ کر آپ نے شفقت کا فائدہ اٹھایا اور معقولات و منقولات کی بیشتر کتابیں آپ نے حضرت سے ہی پڑھیں۔ حضرت فرنگی محلی کو بھی آپ جیسے شاگرد پر بڑا ناز رہا۔

آپ کے پڑھنے کا انداز بڑا نرالا تھا۔ پہلے آپ متن کی عبارت کو بغور پڑھتے۔ صاحب کتاب کا منشا کیا ہے، اس کو سمجھتے اس میں از خود اعتراضات قائم کرتے اور اس کے جوابات کو بھی ترتیب دیتے۔ اس کے بعد حواشی کو بالاستیعاب پڑھتے اور اس کی جو بھی شرح ہوتی اس کا جائزہ لیتے کبھی نصف سطر، کبھی ایک سطر مطالعہ کرنے میں رات گزر جاتی، آپ کو وقت کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ آپ نے خود فرمایا کہ ''میں نے کوئی کتاب نصف صفحہ یا ایک صفحہ سے زیادہ استاد سے نہیں پڑھی۔''، آپ کی سبق خوانی کا یہ عالم تھا کہ استاد کے پاس کبھی نصف کبھی ایک سطر سے زیادہ آپ

نے پڑھا ہی نہیں۔ ایک ایک سبق کے پڑھنے میں گھنٹوں بیت جاتے اور استاذ و شاگرد دونوں پسینہ پسینہ ہو جاتے باوجود اس کے استاد کبھی ناراض نہ ہوتے بلکہ آپ کی حوصلہ افزائی کر کے آپ جیسے ذکی ذہین شاگرد پر فخر کرتے۔

آپ کے چچازاد بھائی مولانا وکیل احمد عاجز سکندر پوری جو متعدد کتابوں کے مصنف اور حیدر آباد دکن میں جج کے منصب پر فائز تھے۔ یہ بھی صاحب ذہانت تھے اور علامہ عبدالعلیم فرنگی محلی کے یہ بھی شاگرد رہے۔ مگر دونوں کی ذہانت میں فرق تھا۔ چناں چہ اگر یہ کوئی اعتراض کرتے تو اپنے استاد موصوف سے فوراً شافی جواب پا جاتے۔ اگر ان سے آپ کوئی اعتراض کرتے تو حضرت کو انتہائی مشقت کا سامنا کرنا پڑتا اور کئی ہفتوں کے بعد کوئی کمزور اور ہلکا سا جواب عنایت فرماتے مگر آپ کو تشفی نہ ہوتی۔ آپ کہتے کہ حضرت! آپ استاد ہیں کہیے تو مان لوں مگر میرے اعتراض کا جواب نہیں ہوا۔ حضرت فرماتے کہ تمہارا کہنا بالکل صحیح ہے۔ اب تم خود اس کا جواب دو۔ چناں چہ حضرت کی خدمت میں آپ اپنے سوال کا جواب عرض کرتے تو حضرت خوشی سے پھولے نہیں سماتے اور فرماتے کہ عبدالعلیم اب خود ہی مطالعہ کرو اور دوسروں کو پڑھاؤ۔ اب تمہارے حق میں یہی بہتر ہے اور اس کے بعد حضرت آپ کو تہہ دل سے دعائیں دیتے۔ آپ کی ذہانت کا خطبہ علامہ مفتی محمد یوسف لکھنوی نے بھی بڑے ہی والہانہ انداز میں پڑھا ہے اور بے ساختہ ان کی بھی دل سے دعائیں نکلیں اور انہوں نے شفقت سے فرمایا کہ جیسا میں نے حضرت فرنگی محلی سے آپ کی ذہانت کا چرچا سنا تھا بالکل ویسا ہی پایا۔ افسوس! جب مجھے ایسے شاگرد کی تلاش رہی تو کوئی نہیں ملا۔ اب میں ضعیف ہو چکا ہوں تمہیں پڑھانے کے لائق نہ رہا۔ خود ہی کتاب دیکھ جایئے اور تدریسی فرائض انجام دیجیے کہ یہی زیادہ بہتر ہے۔

مختصر یہ کہ جون پور کی سرزمین آپ کی مخصوص تعلیم گاہ رہی اور نامور اساتذۂ کرام نے آپ کی تدریسی صلاحیت کی مکمل ضمانت بخشی اور دوسروں کو تعلیم دینے کی تاکید بھی فرمائی۔

ازدواجی زندگی

آپ کی شادی محلہ نورالدین پورہ ضلع غازی پور میں منشی راحت علی کی بڑی صاحبزادی علیمن بی بی سے ہوئی۔

آپ کی اہلیہ محترمہ کا انتقال کب ہوا۔ تلاش بسیار کے باوجود اس کا علم نہ ہو سکا؛ لیکن قرائن سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے وصال سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ آپ کو کئی اولاد ہوئیں مگر ہر ایک کا صغر سنی میں ہی انتقال ہو گیا۔ صرف بڑی صاحبزادی جنت بی بی بقید حیات رہیں۔ ان کی شادی مولوی عبد الرشید محلہ سجاول پور غازی پور سے ہوئی تھی۔ ابھی ان کو ایک ہی بچی بنام عزت بی بی عرف بہنی صاحبہ پیدا ہوئی تھیں۔ یہ چھ سال کی ہوئیں کہ جنت بی بی بھی عالم شباب میں ہی انتقال کر گئیں۔ اس آخری چشم وچراغ کی جدائی سے آپ کو کیسا صدمہ لاحق ہوا ہوگا خدا ہی بہتر جانے۔ مگر آپ نے صبر وتحمل کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور اپنی ہر دل عزیز نواسی عزت بی بی کو گلے لگایا۔ اولاد کے قائم مقام سمجھا اور انہیں اپنی شفقتوں سے نوازا۔ ان کی شادی آپ کے ماموزاد بھائی مفتی عبد الوحید قادری قاضی پوری کے چھوٹے صاحبزادے مولانا غلام قادر قاضی پوری کے ساتھ مورخہ ۱۱/ ذی قعدہ ۱۳۲۳ھ کو ہوئی تھی۔

آپ نے پہلے اپنا تخلص عاصؔی منتخب کیا تھا؛ لیکن آپ کے شیخ نے عاصؔی کی جگہ آسؔی استعمال کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد سے آپ نے آسؔی ہی استعمال کرنا شروع کر دیا، یہ تخلص آپ کے لیے اسم بہ مسمیٰ ثابت ہوا کیوں کہ لفظ آسؔی کا معنی ''غمزدہ'' اور آپ کی پوری زندگی غمزدہ ثابت ہوئی۔ ابتداً آپ کی والدہ ماجدہ کے سایہ کا اٹھ جانا، گھر میں رہنے کا اتفاق کم ہونا اور غربت کی طرح زندگی گزارنا، پے در پے تمام اولاد کا انتقال کر جانا، بڑی بیٹی کا شادی کے بعد عالم شباب ہی میں انتقال کر جانا، نواسی کا بیوہ دیکھنا یہ ساری باتیں آپ کے لیے باعث رنج وغم بنی رہیں۔

ارادت وخلافت

محرم راز، عاشق پاک باز، قطب الہند ابو الخیر حضرت شاہ غلام معین الدین جون پوری سے آپ نے ۱۷/ سال کی عمر کے بعد سلسلۂ قادریہ احمدیہ میں شرف ارادت حاصل کیا۔ بعد ارادت حضرت پیر دستگیر کے زیر سایہ عاطفت رہنے لگے اور ان کی تعلیم وتربیت سے فیض یاب ہونے لگے۔ درسیاتی تعلیم حاصل کرنے کے بعد سفر وحضر میں طویل رات تک حضرت کی ہی خدمت میں رہے۔ پہلے تو آپ کے پیر ومرشد نے آپ کو اشغال واذکار اور اوراد ووظائف کی تلقین فرمائی۔ جب انہوں نے آپ میں اہلیت پائی تو آپ کو تمام سلاسل کی اجازت وخلافت عطا فرمادی۔ اس

طرح آپ نے ان کی عطا کردہ تمام نعمتوں سے شرف یاب ہو گئے جب تک آپ منصب سجادگی پر فائز نہیں ہوئے، ارادت وخلافت کے باوجود آپ نے کسی کو مرید نہیں کیا۔ حضرت قطب الہند نے اپنے اعزہ ومریدین کا انتخابی جائزہ لیا کہ آخرکار سجادگی کا اہل کون ہو سکتا ہے۔ مگر ہزار غور وفکر کے بعد نگاہ آپ ہی پر جا رہی تھی مگر بارہا آپ کی معذرت خواہی نے حضرت کو مجبور کر دیا اور انہوں نے حضرت شاہ سراج الدین رشیدی کو ۱۳۰۷ھ میں سجادگی عطا کی۔ ابھی ان کے سات سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ ۷/ذی قعدہ ۱۳۱۴ھ بروز سنیچر کو واصل بحق ہو گئے۔

حضرت شاہ سراج الدین کے وصال کے بعد آپ نے سجادگی قبول کی۔ اس کے بعد آپ کی ذمے داری بڑھ گئی۔ آپ نے پہلے طبابت کا سلسلہ جاری رکھا تھا مگر ذمے داری بڑھ جانے کے سبب یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ آپ خانقاہ شریف کی دیکھ ریکھ میں سرگرم ہو گئے۔ جون پور شریف میں آپ کے قیام کا سلسلہ دراز ہونے لگا۔ خانقاہی مصروفیات، پیران کرام کی امانت کی حفاظت اور اہل طلب کی کثرت نے آپ کو اس قدر فعال ومتحرک بنا دیا کہ بہت کم آرام کر پاتے۔ اس خانقاہ کے تقدس پر آپ کی گہری نگاہ ہوتی، اس کے کسی بھی معاملے میں قدم پھونک کر رکھتے کہ کہیں کوئی اسراف نہ ہو جائے۔ مال وقف کا کوئی ناجائز یا بے جا خرچ واقع نہ ہو جائے ورنہ آخرت میں مجھ سے مواخذہ ہو گیا تو کیا جواب دوں گا، یہ سوچ کر سہم جاتے، اس لیے بے پناہ احتیاط سے کام لیتے۔

درس وتدریس

آپ نے باضابطہ کسی مدرسہ یا دار العلوم میں مدرس بن کر درس نہیں دیا۔ صرف کاشف لکھنوی کے اصرار پر ان کے شاگردوں کو علم طب پڑھانے کے لیے لکھنؤ تشریف لے گئے تھے مگر قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ وہاں زیادہ دن نہیں رہے چوں کہ آپ اپنے پیر کے ہاتھ بک چکے تھے۔ ان کا منشا نہیں تھا کہ اپنی خانقاہ چھوڑ کر کہیں اور جگہ رہیں۔ تعلیمی دور میں بھی حضرت قطب الہند کے زیر شفقت رہے۔ حصول علم کے بعد بھی حضرت کی ہی صحبت میں رہنے لگے اور ان سے علم معرفت حاصل کرنے اور راہ سلوک طے کرنے میں مصروف ہو گئے۔ الغرض حضرت باحیات رہے تو آپ خود ہی استفادہ کی منزل میں رہے۔ البتہ ایسا ممکن ہے کہ حضرت کا اشارہ ہوا ہو تو خانقاہ میں رہنے والے بچوں کو پڑھا دیتے ہوں۔ جب حضرت شاہ سراج

الدین کی سجادگی آئی تو آپ نے انہیں تعلیم سے آراستہ کرنے کی پوری ذمے داری اپنے سر لے لی۔ آپ کا قیام بیشتر خانقاہ رشیدیہ جون پور میں ہونے لگا۔ آپ بڑے انہماک سے حضرت شاہ سراج کو صبح وشام تعلیم دینے لگے۔ آپ نے سات سال کی مدت میں انہیں مخزن علم وحکمت کا حامل بنادیا تھا مگر ان کی زندگی نے زیادہ وفا نہ کی، آخر کار جدائی کی نوبت آہی گئی اور سجادگی کا پورا بار آپ کے سر آگیا۔ جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ اب آپ خانقاہ شریف میں مستقل رہنے لگے۔ خانقاہی فرائض کو انجام دینے کے ساتھ ساتھ طلبہ کو تعلیم دینے لگے اور تربیت سے آراستہ کرنے لگے۔ جو خانقاہ شریف کی خدمت کو اپنے لیے باعث سعادت اور سرمایۂ حیات سمجھتے تھے۔

اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ خانقاہ شریف میں طالبان علوم نبویہ ہر دور میں رہے۔ اور صاحب سجادہ خود یا اپنے متعلقین کے ذریعے علوم دینیہ اور آداب شرعیہ سے انہیں نوازتے رہے۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد کیا ہے؟ بالکلیہ علم نہ ہوسکا۔ ۱۹۰۹ء میں شہود الحق حضرت سید شاہ شاہد علی سبز پوش گورکھپوری بغرض استفادہ آپ کی خدمت میں آئے اور مستقل آپ کے زیر شفقت وعنایت رہنے لگے۔ باطنی علوم کے ساتھ ساتھ انہیں علم العروض میں بھی آپ کو شاگردی نصیب ہوئی۔ جیسا کہ ذیل سے واضح ہوتا ہے۔

''ضیافت اور فیض صحبت سے کمالات کا اثر پڑا، یہ بھی خیال ہوا کہ سلسلۂ بیعت سے شاگردی جدا نہ ہو، اس غزل کے واقعے کی طرف ذہن منتقل ہوا جس کو یہ ایمائے شاگردی سمجھتے۔ پس مولانا کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنا اپنے لیے فخر سمجھتے''۔ [دیوان نانی]

ان کے علاوہ درسیات کے شاگردوں میں حضرت شاہ سراج الدین، مولانا عبد المجید کاتبؔ (صاحب سمات الاخیار)، مولانا گوہر علی پھلواری، مولانا قاضی محمد صدیق سیوانی، مولانا سکندر علی علیمی پورنوی، مولانا تفضّل حسین علیمی پورنوی، مولانا یوسف پورنوی اور حکیم احمد حسین سکندر پوری علیہم الرحمہ صف اول کے شمار کیے جاتے ہیں۔ آپ نے ان شاگردوں کو وہ کمال علم بخشا کہ وہ سب کے سب اپنے وقت کے بے مثال عالم دین اور بے نظیر عاملین کاملین گزرے ہیں جن کے بے لوث علمی کارنامے کبھی نظر انداز نہیں کیے جاسکتے۔

تالیف و تصنیف

آپ کا تصنیفی طریقہ بڑا والہانہ رہا۔ آپ جب کسی طالب علم کو کوئی فن پڑھاتے تو خود لکھ کر یا اسی سے لکھوا کر بالترتیب پڑھاتے، جب اس فن کی تعلیم مکمل ہوتی تو اس کو کتابی شکل دے دی جاتی اور اس کتاب کے نام کو اس طالب علم سے موسوم کر دیا جاتا۔ مثلاً آپ نے شاہ سراج الدین معینی کو جس نوشتہ کے ذریعے "علم صرف" کی تعلیم دی، اس کا نام "سراج الصرف" رکھا گیا۔ قاضی صدیق سیوانی کو "علم نحو" پڑھائی تو اس کا نام "فوائد صدیقیہ" رکھا۔ اور مولوی گوہر علی پھلواری کو "منطق" پڑھائی تو اس کا نام "فوائد جوہریہ" تجویز کیا۔ ان تصنیفات کے علاوہ کئی حواشی اور متعدد شرحیں بھی تحریر کیں۔ جو خانقاہ کی لائبریری میں بعض تو محفوظ ہیں اور بعض کا پتہ نہیں۔

اخلاق و کردار

آپ کا اخلاق بڑا اعلیٰ تھا۔ صاحب عین المعارف نے لکھا ہے کہ آپ کا اخلاق "انک لعلی خلق عظیم" کا مظہر تھا۔ آپ اس اخلاق پر خود بھی گامزن رہے جس کا آپ نے یہ تاثر دیا۔

اخلاق سب سے کرنا تسخیر ہے تو یہ ہے
خاک آپ کو سمجھنا اکسیر ہے تو یہ ہے

آپ کی محفل تمام لغویات سے بالکل پاک وصاف رہتی۔ اس میں کسی کی غیبت، چغلی یا کسی کی برائی نہیں بیان کی جاتی۔ اس میں کسی قسم کے دنیاوی جھگڑے اور خرافات والی باتیں نہ ہوئیں بلکہ اس میں خالص رشد وہدایت، ترغیب وتربیت، اصلاح وتنبیہ اور بزرگان دین اور پیران سلاسل کے تذکرے بکثرت ہوا کرتے جن کو سن کر سامعین کی زندگی میں انقلاب آتا اور آپ کے گرویدہ اور جانثار ہو جاتے۔

آپ کی خدمت میں مصیبت زدہ اور غمزدہ انسان برابر آیا کرتے، آپ خندہ پیشانی سے ہر ایک کی دلجوئی کرتے۔ کوئی بھی صاحب غرض آتا کسی کو مایوس نہ کرتے اور نہ کوئی آپ سے محروم واپس جاتا۔ آپ حکیم حاذق تھے۔ اپنی حکمت کے ذریعے مریضوں کی خدمت کرتے اور اسی حکمت کے پردے میں اپنی ولایت کو چھپایا کرتے چوں کہ آپ کے پیر نے آپ کو یہی ہدایت فرمائی تھی کہ ولایت چھپانے کی چیز ہے۔ اور اس کو طرح چھپانا چاہیے کہ جیسے عورت

کرسف کو چھپاتی ہے۔ آپ صاحب کرامت تھے مگر کرامتوں کو ظاہر نہ ہونے دیتے۔ آپ میں ضبط کا مادہ اتنا قوی تھا کہ آپ سے کوئی راز فاش نہ ہوتا۔ گویا اخفائے راز اور کتمان اسرار میں اپنے شیخ کے نقش قدم پر ثابت رہے۔

آپ روشن ضمیر تھے۔ حاجت مندوں کے دلوں کے خطرات سے آگاہ ہوجاتے۔ ابھی وہ زبان سے کچھ عرض نہیں کرپاتے کہ آپ دوران گفتگو ان کا جواب دے دیتے۔

آپ خانقاہ رشیدیہ کے تقدس کا بڑا احترام کرتے۔ اگر اپنا ذاتی کام کرنا ہوتا تو اس میں خانقاہ کی چیز استعمال نہ کرتے۔ اپنے مقصد کے لیے اگر خط لکھتے تو اپنا قلم، اپنا کاغذ اور اپنا لفافہ ہوتا۔ اگر رات میں اپنا کام کرتے تو اپنا چراغ جلاتے۔ الغرض بڑے محتاط تھے اور اپنے متعلقین سے بار بار خوف خدا کا اظہار کرتے کہ کل محشر میں مواخذہ ہوا تو پھر کیا جواب دوں گا۔ آپ دعا، تعویذ اور دواؤں کے ذریعے بھی خدمت خلق کرتے، اپنے کردار و عمل اور زبان سے ہرگز ہرگز کسی کی دل آزاری نہیں کرتے اور نہ کبھی کسی سے کوئی چیز طلب کرتے اور آپ کا معمول تھا کہ بغیر بلائے کسی کے گھر نہیں جاتے۔ حتیٰ کہ بن بلائے کسی مرید کے بھی گھر نہیں جاتے۔ کسی مریض کے مرض پر خاص توجہ فرما کر ہاتھ رکھتے، وہ مرض فوراً کافور ہوجاتا۔ کسی کو تعویذ عنایت کرتے تو سحر، آسیب وغیرہ دور ہوجاتا۔ کسی مقدمہ میں کوئی گرفتار شخص آپ سے رجوع کرتا تو آپ اس پر خصوصی نگاہ فرماتے۔ کبھی اس کی پیشانی پر کچھ لکھتے تو عدالت کا فیصلہ اسی کے حق میں ہوتا اور وہ بری ہوجاتا۔ آپ مزاجاً صاحب جلال تھے۔ آپ کے شیخ نے آپ کو "حلیم" کہتے کہتے آپ کو حقیقتاً "حلیم" بنا دیا تھا۔ اخیر وقت میں آپ پر چشتیت کا غلبہ ہوگیا تھا۔ معرفت کے اشعار بلا مزامیر نوا سنجی کے ساتھ سنا کرتے۔ کبھی کبھی حضرت خواجہ غریب نواز سے خطاب کرتے ہوئے شعر کہتے اور ان کی بارگاہ میں جانے والوں کی معرفت بھیج کر پڑھواتے۔ عموماً سوتے وقت خوش الحان لوگوں سے اشعار سنا کرتے اور جب عرس طبی میں گاگر اٹھتا تو اس میں باقاعدہ قوالی سنا کرتے، بے خودی تو نہیں آتی مگر آنکھیں سرخ ہوجاتیں۔ عجز و انکساری آپ کی عادت بن چکی تھی۔ خود کو گنہ گار اور خطا کار تصور کرتے۔ بارگاہ الٰہی میں اپنے کو ناقابل بخشائش گردانتے جیسا کہ آپ کے کلام سے واضح ہے۔

حشر میں منہ پھیر کر کہنا کسی کا ہائے ہائے
آسی گستاخ کا ہر جرم نابخشیدہ ہے

شعروشاعری

آپ شاعری کی دنیا میں ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری، عارف ہسوی، فراق گورکھپوری، مولانا محمد علی جوہر اور کاشف لکھنوی جیسے ادبا و شعرا آپ کی مدح سرائی کا خطبہ پڑھا کرتے تھے۔ آپ کے اندر شاعری کا مذاق بچپن ہی سے تھا۔ مگر اس کا عروج اس وقت ہوا جب غازی پور کے دوران قیام اہل فن کا اجتماع ہونے لگا۔ پے در پے مشاعرے ہونے لگے۔ حاذق موہانی، شمشاد لکھنوی اور مولوی عبدالصمد غازی پوری جیسے باذوق حضرات آپ کی محفل میں ہوتے۔ اردو شاعری کا دور چلتا ہر ایک اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے۔ رات بیت جاتی مگر ذوق طبیعت میں آسودگی نہیں آتی۔ آپ میں تغزل کا رنگ غالب تھا۔ آپ نے شاعری کے تمام اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ مگر عارفانہ غزل گوئی آپ کا مخصوص میدان رہا۔ حقیقت ومجاز استعارات وکنایات اور ندرت بیانی آپ کے کلام کی بنیادی صفات ہیں۔ آپ کا کلام تمام لغویات سے پاک وصاف ہے۔ جب محو فکر ہوتے تو الہامی طور پر اشعار کی آمد ہوتی۔ عروج عشق کا کمال، ذوق طبیعت کی مستی اور سچی محبت کی دیوانگی جیسے عناصر آپ کے کلام میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

آسی مست کا کلام سنو
وعظ کیا، بند کیا، نصیحت کیا

شاعری یہ ایسا وسیع وعریض میدان ہے جس کی حد بندی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ دور رسالت سے لے کر اب تک بڑے بڑے شاعروں نے حمد ونعت اور غزل گوئی کے ذریعے عشق ومحبت کے گوہر لٹائے اور اہل ذوق کو حقیقت وصداقت کا صحیح پیغام پہنچایا کہ

فضائے عقل کی وسعت عظیم ہے کہ جہاں
نسیم فکر کو مجبوری خرام نہیں

یہ حقیقت ہے کہ اس میدان کی وسعت نہایت عظیم ہے۔ اس مختصر مضمون میں کما حقہ روشنی

ڈالنا مشکل ہے۔ اس کو یہیں ترک کر دیا جاتا ہے۔

وصال

آپ ۲ر جمادی الاولی ۱۳۳۵ھ مطابق ۲۵ فروری ۱۹۱۷ء بروز یک شنبہ ایک بج کر بیس منٹ پر اہل عقیدت کو داغ مفارقت دے کر اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون.

اہل عقیدت نے وصال مبارک کی کئی تاریخی قطعات نکالی اور کہی ہیں۔ آپ کے جانشین و خلیفۂ اکبر حضرت شہود الحق نے اس آیت قرآنیہ سے کیا خوب تاریخ نکالی ہے۔

"اولئک علیهم صلوات من ربهم ورحمه"

۱۳۳۵ھ

حضرت آسی کے برادر زادہ مولانا محمد احمد ایمن سکندر پوری نے بھی بہتر قطعہ تاریخ نکالی ہے۔

"لقد رضی الله عنه"

۱۳۳۵ھ

☆☆☆

حضرت آسی کی حیات کے چند نمایاں پہلو

ابرار رضا مصباحی☆

علم وتصوف کی دنیا میں قطب عالم حضرت سیدنا شاہ عبد العلیم آسی غازی پوری قدس سرہ کی شخصیت بڑی اہمیت وحیثیت کی حامل ہے، آپ چودھویں صدی ہجری کے نامور عالم وفقیہ، جلیل القدر عارف وصوفی، عظیم المرتبت داعی و مصلح، کامل الفن حکیم وطبیب، قادر الکلام شاعر وسخن ور اور اخلاق وتصوف کے عظیم ترجمان وعلم بردار تھے۔

آپ فطری طور پر انتہائی ذہین وفطین تھے، خدائے تعالیٰ نے بلا کی ذکاوت وذہانت آپ کے اندر ودیعت فرمائی تھی، ''قوت حافظہ کا یہ عالم تھا کہ کوئی کتاب ایک مرتبہ پڑھ جاتے تو وہ حفظ ہوجاتی اور ابتدائی کتابیں تو آپ نے محض دوسروں کو پڑھتے ہوئے سن کر ہی یاد کرلی تھیں۔''(۱) آپ اپنی ابتدائی تعلیم یعنی فارسی وعربی کی کچھ کتابیں اپنے پرنانا حضرت مفتی احسان علی قاضی پوری سے پڑھتے ہوئے قطب الاقطاب حضرت شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری (متوفی ۱۰۸۳ھ) کے مئے کدہ علم ومعرفت میں حاضر ہوئے اور یہاں آستانہ عالیہ رشیدیہ اور مدرسہ رشیدیہ میں رہ کر اس سلسلہ وخانقاہ کے جامع کمالات بزرگ اور شیخ طریقت قطب الہند

☆رکن شاہ عبد العلیم آسی فاؤنڈیشن، دہلی

حضرت شیخ غلام معین الدین رشیدی جون پوری (متوفی ۱۳۰۷ھ) سے تعلیم شریعت وطریقت حاصل کیے، اس کے بعد حضرت مولانا سخاوت علی جون پوری کی تحریک پر قائم کردہ ادارہ ''مدرسہ حنفیہ'' جون پور میں مشہور عالم وفاضل حضرت مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی لکھنوی کی خدمت میں پہنچے اوران سے علوم معقولات ومنقولات کی تمام کتابیں پڑھیں، اس کے بعد جب یہ اپنے وطن فرنگی محل لکھنؤ واپس چلے گئے اوران کی جگہ پہ حضرت مفتی یوسف فرنگی محلی لکھنوی تشریف لائے تو ان سے بھی آپ نے استفادہ فرمایا۔

اساتذہ کو شاگرد پر ناز

آپ کے اساتذہ میں پیر ومرشد حضرت قطب الہند، نانا حضرت مفتی احسان علی قاضی پوری، علامہ عبدالحلیم فرنگی محلی لکھنوی، حضرت مفتی محمد یوسف فرنگی محلی لکھنوی جیسے نامور علما وفضلا اور مصنفین ومحققین شامل ہیں۔ آپ اپنے اساتذہ کے ہمیشہ محبوب نظر رہے؛ بلکہ ان حضرات کو آپ کی کمال ذکاوت اور اپنے شاگرد پر بڑا فخر تھا، آپ کے فہم رسا اور ذہنی استعداد پر سب حیران اور رطب اللسان تھے۔

چناں چہ جب علامہ عبدالحلیم فرنگی محلی لکھنوی تدریس کے لیے مدرسہ حنفیہ میں تشریف لائے اور آپ کی شہرت سن کر اِدھر اُدھر سے طلبہ کثرت سے جمع ہونے لگے تو آپ بھی ان کی خدمت میں پہنچے'' مگر جو کتاب آپ پڑھتے تھے، وہاں نہ ہوتی تھی، آپ نے یہ ترکیب نکالی کہ ''ملا جلال'' کے پڑھنے والوں کے ساتھ بیٹھ کر سماعت فرمانے لگے، کئی روز کے بعد ایک دن مولانا نے اجنبی آدمی دیکھ کر پوچھا کہ تم کون ہو، کیا پڑھتے ہو؟، آپ نے اپنا نام بتایا اور'' قطبی'' کا نام لیا۔ مولانا نے فرمایا کہ ''قطبی'' تو پڑھتے ہو اور'' ملاحسن'' چھوڑ کر کے'' ملا جلال'' سنتے ہو، کچھ سمجھتے بھی ہو؟ آپ نے فرمایا کہ سبق کے متعلق آپ پوچھ لیں۔ مولانا نے مطلب پوچھا، آپ نے نہایت شرح وبسط کے ساتھ تقریر کی، مولانا بہت خوش ہوئے اور'' ملاحسن'' کا سبق اپنے یہاں مقرر فرمایا۔ (۲) آپ کے سبق میں ردوقدح کی وجہ سے گھنٹوں گزر جاتے تھے،'' نصف سطر اور ایک سطر کے سبق میں چھ سات گھنٹے صرف ہوتے تھے، استاد شاگرد دونوں پسینہ پسینہ ہو جاتے تھے، نصف صفحہ ایک صفحہ کے بعد مولوی عبدالحلیم صاحب قدس سرہ کتاب بند

کرادیتے اور فرماتے کہ اب کتاب ختم ہوگئی دوسروں کو پڑھاؤ مگر حضرت خود کتاب کا مطالعہ کر کے ختم کر لیتے۔'' (۳) مولوی وکیل احمد صاحب سکندر پوری بھی جو حضرت کے چچازاد بھائی تھے اور حیدر آباد دکن میں جج تھے، مولوی عبدالحلیم صاحب سے پڑھتے تھے، وہ جب کوئی اعتراض کرتے تھے تو مولوی عبدالحلیم صاحب غور وفکر کے بعد اس کا شافی جواب دے دیتے تھے، مگر جب حضرت ڈوب کر کوئی اعتراض کرتے تھے تو مولوی عبدالحلیم صاحب دو دو ہفتہ غور وفکر کے بعد کوئی کمزور سا جواب دیتے تو حضرت فرماتے کہ ''حضرت آپ استاد ہیں کہیے تو مان لوں مگر میرے اعتراض کا جواب نہ ہوا۔'' مولوی عبدالحلیم صاحب فرماتے کہ'' کہتے تو صحیح ہو جواب نہیں ہوا، اب تم خود اپنے اعتراض کا جواب دو!'' اس کے بعد حضرت خود اپنے اعتراض کا جواب دیتے تو مولوی عبدالحلیم صاحب خوشی سے پھولے نہ سماتے'' (۴)، ''جب مدرسہ حنفیہ جون پور سے مولوی عبدالحلیم صاحب لکھنؤ چلے گئے اور ان کی جگہ پہ حضرت مولانا مفتی محمد یوسف صاحب تشریف لائے تو حضرت (آسیؔ) ہدایہ پڑھنے کے لیے مفتی صاحب کے پاس تشریف لے گئے، مفتی صاحب نے فرمایا کہ فقیر کا معمول شمس بازغہ کے بعد ہدایہ پڑھانے کا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ میں شمس بازغہ پڑھ چکا ہوں، مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مثل عامی شاگردوں کے پڑھانا چاہا، حضرت نے فرمایا کہ میں تین سطروں کا مطالعہ کر کے آیا ہوں، میں نے جو باتیں ان تین سطروں میں پیدا کی ہیں، اس کو سن لیجیے۔ حضرت نے تین گھنٹے تک ان تین سطروں پر تقریر کی۔ مفتی صاحب دم بخود سنتے رہے، جب حضرت تقریر ختم کر چکے تو مفتی صاحب نے فرمایا کہ صاحبزادے! میں آپ کی ذہانت کی تعریف مولوی عبدالحلیم صاحب سے سن چکا ہوں۔ جب مجھے ایسے شاگرد کی تلاش تھی تو کوئی ملا نہیں، اب ضعیف ہو چکا ہوں، آپ کے پڑھانے کے لائق نہیں رہا اور آپ کو اس کی حاجت بھی نہیں ہے خود کتاب دیکھ جایئے اور دوسروں کو پڑھایئے۔ (۵)''

ذوق مطالعہ

آپ کے اندر کتب بینی اور مطالعے کا شوق وذوق حد درجہ تھا، انہماک واستغراق کا یہ عالم کہ کتابوں کے علاوہ آپ کی توجہ کہیں جاتی ہی نہ تھی ''ایک بار محلّہ میں کسی حلوائی کی دکان پر

مطالعہ کے لیے کتاب لے کر بیٹھ گئے۔ اس سڑک سے ایک دھوم دھام بارات گزر گئی اور خبر نہ ہوئی۔ فجر کی آذان پر چونکے کہ صبح ہو گئی'' (۶)، استعداد بڑھانے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ مطالعہ کے وقت پہلے شرح و حاشیہ پر نظر نہیں ڈالتے تھے، متن سے غور و خوض کر کے مطالب و اعتراضات و جوابات کی ترتیب دے لیتے تھے، تب حواشی و شروح پر نظر اٹھاتے تھے۔ اگر اپنے اعتراض و جواب کو لکھا ہوا پاتے تھے تو بہت خوش ہوتے تھے۔ بڑے بڑے منتہی طلبہ آپ سے شوقیہ پڑھتے تھے'' (۷)، رات کی رات مطالعے میں گزر جاتی تھی، مطالعے میں نئے مطالب پیدا کرتے تھے اور اعتراضوں کے جواب نکالتے تھے اور جو جواب کتاب میں لکھے ہوئے ہوتے تھے، ان پر اعتراض پیدا کر کے ان کو بگاڑتے تھے۔ (۸)''

درس وتدریس

آپ جب علوم وفنون کی تحصیل سے فارغ ہوئے تو اب درس وتدریس میں مشغول ہوئے اور مدرسہ رشیدیہ جون پور کے طلبہ کو درس دینے لگے۔ ''تدریس کے وقت کتاب آپ کے سامنے نہ ہوتی بلکہ اسی طرح زبانی لڑکوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ خانقاہ رشیدیہ جون پور کا مدرسہ آپ ہی کے زیر اہتمام تھا، آپ جو ایک بار پڑھا دیتے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ذہن نشیں ہو جاتا، پڑھانے کا طریقہ ایسا جاذب تھا کہ ایک بار حضرت سے درس لینے کے بعد کوئی لڑکا کسی دوسرے استاد کی طرف رجوع نہ ہوتا، یہاں تک کہ حکیم سید جعفر حسین کاشف لکھنوی جب کچھ دنوں کے لیے لکھنؤ جانے لگے تو اپنے شاگردوں کو حضرت کے سپرد کر گئے کہ ان کو طب پڑھا دیجیے، حضرت فرماتے تھے کہ میں شب کو مطالعہ کیا کرتا تھا اور صبح کو درس دیا کرتا تھا۔ جب حکیم صاحب واپس آئے تو کوئی شاگرد ان کے پاس جانے کو تیار نہیں ہوا۔ (۹)''

طلبہ واساتذہ کے لیے ایک نمونۂ عمل قول زریں

آج کے مدارس و جامعات میں مسند درس وتدریس پہ فائز ہونے والے اساتذہ اور ان کی صحبت میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے والے طلبہ کے لیے آپ نے ایک دستور العمل کے طور پر ارشاد فرمایا ہے جو یقیناً قابل تقلید اور نمونۂ عمل ہے: ''جس نے علوم عربیہ پڑھیں اور اس قابل نہ ہوا کہ دوسروں کو طب پڑھا سکے تو اس نے خاک نہیں پڑھا۔ (۱۰)''

مذکورہ قول زریں اپنے اندر بے پناہ جامعیت و معنویت رکھتا ہے، یہ جہاں طلبہ کے اندر علمی گہرائی و گیرائی اور فنی صلاحیت ولیاقت پیدا کرنے کی دعوت دیتا ہے، وہیں علوم دینیہ وعربیہ کی اہمیت وافادیت کو بخوبی واضح کرتا ہے۔

طبابت میں کمال اور حیرت انگیز تشخیص

آپ کی خداداد صلاحیت، انتہائی ذکاوت اور کمال بصیرت کا ہی نتیجہ ہے کہ محض علم طب کی کتابوں کے مطالعے سے ہی اتنی زبردست استعداد اور معلومات بہم پہنچائی کہ ایک کہنہ تجربہ کار اور ماہر حکیم کی طرح مطب چلانے لگے جب کہ آپ نے طب کا ایک حرف بھی کسی استاد سے نہیں پڑھا اور نہ ہی کبھی کسی مطب میں بیٹھے۔ آپ کی تشخیص اعلیٰ پایے کی ہوتی تھی، قلم سے جو نسخہ نکلتا تھا تیر بہدف ثابت ہوتا تھا اور شفا کا یہ حال کہ جو مریض بھی آتا وہ بامراد اور کامیاب ہو کر واپس ہوتے۔ ”آپ کی طبابت کا یہ حال تھا کہ بارہ سو پندرہ سو آدمیوں کا مجمع مطب میں جمع ہوا کرتا تھا، اشراق کے بعد مطب میں بیٹھا کرتے تھے اور ظہر کے وقت فرصت ملی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے نبض دیکھتے جاتے تھے اور چار چار کاتب نسخہ لکھتے جاتے تھے۔ ہندوستان بھر سے جو مریض مایوس ہو کر آپ کے پاس آتے تھے چند روز ہی میں شفایاب ہو کے خوشی خوشی واپس جاتے تھے۔ یہ بھی خصوصیت تھی کہ حضرت (آسی) فیس نہیں لیتے تھے۔ (۱۱)“

معمولات وروایات کی پابندی

بحث ومباحثے میں کبھی نہ پڑے بلکہ اس سے سخت گریز کرتے، نام ونمود اور شہرت وعزت سے نفور رہے، تواضع وانکساری پر قائم رہے اور دوسروں کو اس کی تعلیم وتلقین کرتے، آپ نے بزرگان دین اور سلاسل طریقت کی زیارت اور ان سے کسب فیض کے لیے دور دراز مقامات کے سفر کیے، دعوتی وتبلیغی امور کی انجام دہی کے لیے کئی اہم دورے کیے، لوگوں کو ہمیشہ اخلاق وتعلیم اور انسانیت ومحبت کا درس دیا، مریدین کے گھر بن بلائے کبھی نہ جاتے، زندگی بھر فقر وقناعت پر قائم رہے، اپنی ولایت وبزرگی کو طبابت کے پردے میں چھپائے رکھا، اظہار کرامت سے سخت پرہیز کیا، تاحیات درس وتدریس کے فرائض انجام دے کر علوم وفنون کی اشاعت میں حصہ لیا، امانت ودیانت داری سے رشد وہدایت اور خانقاہی امور کو انجام دیا، مریدین ومتوسلین

کی تربیت وتزکیہ کرکے کمالات سے سرفراز کیا، سلسلہ رُشیدیہ جون پور کی تعمیر وتوسیع کرکے خاطر خواہ اسے ترقی دیا۔

سلسلہ رُشیدیہ کا فروغ

آپ نے علمی و دینی اور اخلاقی وروحانی ہر اعتبار سے سلسلہ رُشیدیہ کے فروغ میں نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ اس سلسلے کے نامور بزرگوں اور مشائخ میں آتے ہیں، آپ نے باکمال خلفا ومریدین پیدا کیے جو ملک و بیرون ملک میں جا کر رشد وہدایت کے فرائض انجام دیے اور سلسلہ رشیدیہ کے دائرۂ دعوت وتبلیغ اور رشد وہدایت کو دور دور تک پھیلائے۔

تصوف وطریقت کی اشاعت

صوفیہ کا طریقہ ہمیشہ سے رشد وہدایت، تربیت وتزکیہ، محبت وانسانیت، صبر وقناعت اور خدمت خلق کا رہا ہے، ان کے یہاں انسانیت نوازی اور دل جوئی سے بڑھ کر کوئی ثواب نہیں ہے۔ آپ چودھویں صدی ہجری میں تصوف وطریقت کے عظیم علم بردار اور متقدمین صوفیہ کے مشن کے بڑے ترجمان تھے، آپ کی اہم شناخت علم وتصوف کے حوالے سے ہی زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ایک عظیم عالم وفقیہ ہونے کے باوجود دنیائے علم وتصوف میں ایک عارف کامل، شیخ وقت اور صوفی شاعر کی حیثیت سے زیادہ متعارف ہیں، اور آپ کے القابات عالیہ بحر الاسرار، قاسم الانوار، قطب العرفا والعشاق اسی کے غماز ہیں۔ آپ نے زندگی بھر رشد وہدایت کا اہم فریضہ نبھایا، لوگوں کو اخلاق ومحبت کی تعلیم وتلقین کی، حسن سلوک اور خدمت خلق پر کافی زور دیا، خاص طور پر آپ نے تصوف کو قالب شعر وادب میں ڈھال کر اس کی اہمیت کو اور اجاگر کر دیا ہے اور اپنی صوفیانہ وعارفانہ شاعری کو کمال وتمام تک پہنچا دیا ہے۔ غرض کہ آپ نے علمی وروحانی صلاحیت، صوفیانہ شاعری، حکمت ومصلحت اور خاموش مزاجی کے ساتھ عملی اور نظری ہر اعتبار سے تصوف کے فروغ میں اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔

شعر وادب

آپ کی خداداد صلاحیت، علمی لیاقت، فنی بصیرت، اخاذ طبیعت اور زبان وبیان پر قدرت نے آپ کو ایک فقید المثال اور قادر الکلام شاعر بنا دیا تھا، شعر وادب میں کمال و درک حاصل کر

نے ساتھ ساتھ اس فن میں آپ نے بڑی یادگار اور قابلِ قدر چیزیں بھی چھوڑیں ہیں۔ روایتی انداز میں آپ نے عاصی تخلص اختیار کر کے شعر گوئی شروع کر دی تھی؛ لیکن اپنے شیخ و مرشد کے حکم سے آسی کا تخلص اپنایا اور پھر باقاعدگی سے اس فن میں اپنی علمی و فکری جولانیت کا مظاہرہ کیا۔ شاعری میں شاگردی کا شرف حضرت شاہ غلام اعظم افضل الہ آبادی قدس سرہ، سجادہ نشیں دائرہ شاہ اجمل الہ آباد (ارشد تلمیذ شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی) سے حاصل ہے۔ ''حضرت آسی نو برس کی عمر میں فارسی پڑھ کر عربی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے، اسی وقت سے آپ کا میلان طبع شعر گوئی کی طرف راغب تھا، چند سالوں کے اندر بے تکلف ایسے اشعار کہنے لگے کہ جب حضرت شاہ غلام اعظم جون پور تشریف لائے تو ان کو اپنا کلام دکھایا، انہوں نے کل ڈھائی غزلیں دیکھ کر انعام میں اپنا خاص مصرفی قلم دان عطا کیا اور فرمایا کہ تمہیں اصلاح کی چنداں ضرورت نہیں (۱۳)'' تاہم آپ ادباً اپنی غزلیں اپنے استاد کی خدمت میں بھیجتے رہتے اور وہ اکثر یہ کہہ کر واپس کر دیتے کہ اب اصلاح کی گنجائش نہیں ہے۔

آپ کے کلام مسائل تصوف کے رموز و نکات سے مزین و معمور ہیں، جذبات و خیالات کی پاکیزگی، زبان و بیان کی صفائی اور شعر و ادب کی تمام تر جلوہ سامانیاں موجود ہیں۔ آپ کی تخلیقات اور اشعار کے مجموعے کو آپ کے مرید و خلیفہ شہود الحق حضرت سید شاہ شاہد علی علیمی سبز پوش فانی گورکھپوری قدس سرہ (متوفی ۱۳۷۲ھ) نویں سجادہ نشیں خانقاہ عالیہ رشیدیہ جون پور نے ''عین المعارف'' معروف بہ ''دیوان آسی'' کے نام سے شائع کیا ہے جس کو علمی ادبی حلقوں میں بے حد سراہا گیا ہے، اس نے ارباب زبان و ادب اور صاحبان سلوک و معرفت کو حیرت و تعجب میں ڈال دیا ہے۔

معاصرین کا اعتراف

اپنے عہد کے مشاہیر علما و مشائخ نے آپ کی علمی و روحانی شخصیت اور ممتاز شعرا و ادبا اور نقاد و حکما نے آپ کی شعری و ادبی حیثیت کو بھی تسلیم کیا ہے۔ علامہ عبدالحلیم فرنگی محلی لکھنوی، مفتی یوسف فرنگی محلی لکھنوی، مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، مولانا محمد علی جوہر، مجاہد آزادی عارف ہسوی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا خیر بہوروی سمیت نامور علما و دانشوران نے آپ کی علمی

شوکت اور شاعرانہ عظمت کو سراہا ہے۔

حکیم محمد اسحاق حاذقؔ موہانی جو آپ کے خاص احباب میں سے تھے اور ان کے دیوان ''مدینۂ نعمت'' کو حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی قدس سرہ اپنی آنکھوں سے لگاتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ دیوان بارگاہ رسالت میں مقبول ہو چکا ہے'' حکیم صاحب سے جب کوئی کہتا تھا کہ حضرت آسیؔ نے نہ تو کسی سے طب پڑھی نہ کسی کے مطب میں بیٹھے اور شفا کا یہ حال ہے، جو مریض ان کے ہاتھ میں آیا وہ آناً فاناً صحت یاب ہوا تو وہ فرماتے کہ ارسطو اور بوعلی سینا کو کس نے طب پڑھائی تھی؟ یہ ان دماغ کے لوگوں میں ہیں جو طب ایجاد کریں، ان کو استاد کی کیا ضرورت ہے؟ (۱۴)'' اور علامہ کیفیؔ چریاکوٹی نے آپ کی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے بہترین انداز میں خراج عقیدت پیش کیا ہے کہ ''حضرت آسی اپنے وقت کے سجادۂ شاعری کے شیخ اعظم تھے، تصوف کی شاعری میں ان کا جو رنگ ہے، ان سے پہلے اور ان کے بعد کوئی ان کا مثل نظر نہیں آتا۔ (۱۵)''

غالب کا اعتراف واستعجاب

آپ کی ادبی وفکری جولانیت، زبان وبیان قدرت ومہارت، کلام کی معنویت واہمیت اور اس میں شگفتگی وسنجیدگی کو سن کر غالبؔ بھی عالم استعجاب میں پڑ گئے اور آپ کی ہمہ صفات شخصیت کا برملا اظہار واعتراف کیا۔ چناں چہ آپ نے اپنی چند غزلیں مولوی عبدالصمد صمدؔ غازی پوری کو دے دی، مولوی صاحب خود دہلی گئے تو غالبؔ سے ملے اور وہ غزلیں سنائیں۔ غالبؔ دم بخود سنتے رہے، اس کے بعد فرمایا کہ ''اللہ اللہ ایسے لکھنے والے اب بھی ہندوستان میں موجود ہیں؟ (۱۶)'' چودھویں صدی ہجری میں تصوف، صوفیہ اور صوفیانہ شاعری کے حوالے سے جب جب تذکرہ ہوگا، اس میں حضرت آسیؔ غازی پوری کا نام نمایاں ہو کر آئے گا، بلکہ تاریخ تصوف ان کے بغیر نامکمل سمجھی جائے گی۔

ارباب علم وادب سے تعلقات

آپ کی ذات شریعت وطریقت کا حسین سنگم تھی اور شخصیت انتہائی نرالی و پرکشش تھی، آپ کی بارگاہ عالیہ میں مریدین ومعتقدین کے علاوہ ادبا وشعرا کا ہجوم رہتا جو آپ کے شمع علم و

روحانیت پر پروانوں کی طرح گردش کرتے رہتے، حلقہ احباب بھی بڑا وسیع تھا، ان میں ارباب علم وتصوف اور اصحاب ذوق وادب زیادہ ہوا کرتے، جن کے دلوں میں آپ کے تئیں حد درجہ محبت واحترام کا جذبہ موجزن تھا، جن میں سید جعفر حسین کاشف لکھنوی، حکیم محمد اسحاق حاذقؔ موہانی، مولانا رحمت اللہ غازی پوری (بانی مدرسہ چشمہ رحمت کالج غازی پور)، میر محمد جان صدقؔ جون پوری، حکیم جمیل الدین دہلوی، حفیظ جون پوری، اکبر دانا پوری، شادؔ عظیم آبادی، نواب محمد خاں ذکی، منشی امیر احمد مینائی لکھنوی وغیرہ شامل ہیں۔

شعروادب کا فروغ

شعروادب کی دنیا میں آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، آپ نے بڑے کاملین فن اور ماہرین شعروادب تلامذہ پیدا کیے جن میں سے اکثر صاحب دواوین گزرے ہیں، آپ کے بعد آپ کے تلامذہ نے شعروادب کی بزمیں آراستہ کیں اور اپنی شعری وادبی جولانیتوں سے شعرو ادب کے دائرے کو بہت دور دور تک پھیلایا۔

تصانیف

آپ نے اپنی ہمہ گیر مصروفیات کے باوجود کچھ نقوش قلم بھی چھوڑے ہیں جو کافی اہم اور قیمتی ہیں، دوران تدریس اپنے تلامذہ کی تعلیم کے لیے خود انہی کے نام سے منسوب نحو، صرف، منطق مختلف علوم وفنون پر مشتمل کتابیں تصنیف وتالیف فرمائیں، جن میں مکاتبات عارفین، فوائد جوہریہ، سراج الصرف، فوائد محمدیہ، فوائد سراجیہ، رسالۂ فریدیہ، رسالۂ احمدیہ وغیرہ شامل ہیں، ساتھ ہی درسی کتابوں پر حواشی وشروح بھی لکھی ہیں جو غیر مطبوعہ اور نایاب ہیں۔ خالص صوفیانہ اسرار وکنایات اور فوائد نکات پر مبنی عین المعارف (دیوان آسی) کے نام سے شعروادب میں ایک اہم اضافہ فرمایا۔

کمالات وکارنامے

آپ عالم وفقیہ، منطقی وفلسفی، عارف وصوفی، واعظ ومصلح، داعی ومبلغ، حکیم وطبیب، مصنف وشاعر اور خانقاہ رشیدیہ جون پور کے آٹھویں سجادہ نشیں غرض کہ مختلف خوبیوں اور کمالات کے جامع تھے، آپ نے دینی ومذہبی، علمی وادبی، سماجی ومعاشرتی مختلف میدانوں میں اپنی گراں قدر خدمات

پیش کیں، جن کی علمی و درسی صلاحیت کی علامہ عبدالحلیم فرنگی محلی لکھنوی، مفتی یوسف فرنگی محلی لکھنوی جیسے نامور اور باکمال اساتذہ نے داد و تحسین فرمائی۔ درس و تدریس اور تربیت و تزکیہ کے ذریعے صاحب فضل و کمال خلفا و مریدین اور نامور شعرا و تلامذہ پید کیے، مختلف علوم و فنون پر مشتمل قابل قدر رسالے تحریر فرمائے، عین المعارف کی شکل میں شائقین علوم طریقت و معرفت کو عمدہ سامان اور تحفہ عطا فرمایا، ادبی ذخیروں اور قابل قدر دواوین میں ایک اہم اضافہ کیا اور عارفانہ و صوفیانہ شاعری کو فروغ دے کر ایک ممتاز اور نمایاں مقام حاصل کیا، چودھویں صدی ہجری میں تصوف و سلوک کی بہترین ترجمانی و علم برداری کر کے تصوف و صوفیہ کے مشن کو آگے بڑھایا، سلسلۂ رشیدیہ جون پور کی تعمیر و توسیع اور اس کے دائرۂ دعوت و ارشاد کو خلفا و مریدین کے ذریعے ملک و بیرون ملک میں خوب وسیع و عام کیا۔

خدمات کی سند و قبولیت

وصال سے چار پانچ برس پہلے حضرت آسی پر نسبت چشتیت کا بہت زیادہ غلبہ ہو گیا تھا۔ چناں چہ سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بارگاہ میں مندرجہ تین شعر اپنے مرید و خلیفہ شاہ عبدالسبحان قدس سرہ کی معرفت اجمیر حاضری پر کہلوایا۔

بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا	ادا سے دیکھ لو جاتا رہے گلہ دل کا
تلچھٹ بھی اگر دے کرم پیر مغاں ہے	میں اور مئے ناب میرا منہ یہ کہاں ہے
سگ کہ شد منظور نجم الدین را سرور است	یک نظر فرما کہ مستثنیٰ شوم زابنائے جنس

ایک مرتبہ صوفی شاہ عبدالسبحان مراقبے میں تھے تو حضرت سلطان الہند خواجہ غریب نواز کی زیارت سے مشرف ہوئے اور انھوں نے یہ ارشاد فرمایا:

”میں محمد عبدالعلیم کا ہوں اور محمد عبدالعلیم میرے ہیں۔“

اسی طرح حضرت سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی رضی اللہ عنہ کے مزار پر مراقب تھے کہ حضرت محبوب الٰہی نے یہ زریں قول ارشاد فرمایا:

”محمد عبدالعلیم کو میرا اسلام کہنا اور کہنا کہ میرے سلسلے کا رواج ان اطراف میں تمہاری ذات سے قائم ہے۔(۱۷)“

یہ قبولیت اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مقبول صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم نے آپ کی دینی و دعوتی خدمات کو قبول فرمالیا ہے اور آپ بانی سلسلۂ رشیدیہ حضرت قطب الاقطاب جون پوری قدس سرہ، پیران کرام، صوفیہ اسلام اور سلاسل طریقت کے مشن و مقصد کے سچے امین و جانشیں اور ترجمان و علم بردار تھے۔حکمت و بصیرت، امانت و دیانت اور خاموش مزاجی کے ساتھ قابل قدر دینی و علمی خدمات اور خانقاہی روایات و معمولات کو نہایت احسن طریقے پر انجام دے کر آپ ۱۳۳۵ھ کو پچاسی برس کی عمر میں وابستگان سلسلۂ رشیدیہ سے ہمیشہ کے لیے پردہ فرما کر واصل بحق ہو گئے۔

کتابیات

(۱) عین المعارف، مرتبہ سید شاہ شاہد علی فانی گورکھپوری، ص:۴۱
(۲) سمات الاخیار، عبدالمجید کاتب مصطفیٰ آبادی، ص:۲۵۱
(۳) نفس مصدر، ص:۴۱
(۴) نفس مصدر، ص:۴۱
(۵) نفس مصدر، ص:۴۲
(۶) نفس مصدر، ص:۴۲
(۷) نفس مصدر، ص ۲۵۱
(۸) سمات الاخیار، ص ۲۵۱
(۹) عین المعارف، ص:۴۷-۴۸
(۱۰) نفس مصدر، ص:۴۷
(۱۱) نفس مصدر، ص:۴۷
(۱۲) سمات الاخیار، ص ۲۵۱
(۱۳) حضرت آسی غازی پوری: حیات اور شاعری، ص:۱۷
(۱۴) عین المعارف، ص:۴۷
(۱۵) نیا دور دہلی، شمارہ اگست، ۱۹۸۳ء
(۱۶) عین المعارف (ص:۵۷)
(۱۷) نفس مصدر (ص:۶۷-۶۸)
(۱۸) مجلہ 'الاحسان' الہ آباد-۳

حضرت آسی کا علمی وروحانی مقام

مولانا محمد عارف اللہ فیضی ☆

۱۹ شعبان ۱۲۵۰ھ کو واقف اسرار طریقت، قطب العارفین، محبوب سید الکونین حضرت شیخ قنبر حسین علیہ الرحمہ کے دولت کدے پر ایک فرزند ارجمند سریر آرائے بزم عالم ہوا۔ تاریخی نام ظہور الحق اور عرفی نام محمد عبد العلیم قرار پایا۔ باپ کی طرف سے یہ بچہ انصاری تھا تو والدہ کی طرف سے اسے حضرت مولانا مظفر بلخی علیہ الرحمہ سے نسبت تھی۔ والد حضرت شیخ قنبر حسین قطب العالمین قیام الحق محی الدین حضرت شاہ امیر الدین رشیدی جون پوری سے بیعت تھے۔ جن کی صحبت میں رہ کر انھوں نے خود کو تعلیم ظاہر و باطن سے آراستہ کیا اور خلافت سے نوازے گئے۔ والدہ ماجدہ حضرت مفتی احسان علی کی پوتی تھیں جو نماز تہجد کے اتنے پابند تھے کہ ۱۲/برس کی عمر سے آخرِ عمر تک وہ کبھی قضا نہیں ہوئی۔ مفتی صاحب کی اہلیہ کو حضرت خاتون جنت رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا وہ قرب حاصل تھا کہ کوئی ادنیٰ کام بھی خاتون جنت سے دریافت کیے بغیر نہیں کرتی تھیں۔ والدہ کا انتقال آپ کی کم سنی ہی میں ہوگیا اس لیے پرورش اور تربیت و پرداخت کی ذمہ داری آپ کی نانی صاحبہ نے سنبھالی۔ آپ کی شادی غازی پور میں منشی راحت

☆ استاذ: مدرسہ عربیہ فیض العلوم، محمد آباد گوہنہ، ضلع مئو

علی کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی۔ ان سے آپ کی کئی اولادیں ہوئیں مگر صرف بڑی صاحبزادی جنت بی بی ہی سن بلوغ کو پہنچیں۔ بقیہ ساری اولادیں کم سنی ہی میں اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ گیارہ برس تک ننہال میں رہے جہاں اپنے حقیقی نانا مفتی احسان علی مرحوم سے فارسی کی کتابیں پڑھیں ، جب ۱۲۶۸ھ میں جون پور تشریف آوری ہوئی تو عربی کی کچھ ابتدائی کتابیں بھی پڑھ چکے تھے۔ پھر آستانۂ رشیدی میں قیام ہوا تو بخت بیدار کی یاوری سے پیرومرشد قطب الہند ابوالخیر حضرت شاہ غلام معین الدین رشیدی جون پوری کی صحبت وخدمت گزاری کی ایسی سعادت نصیب ہوئی کہ پورے پچاس برس تک ان کی روحانی تعلیم وتربیت سے فیض یاب ہونے ، اسرار معرفت وحقیقت سے آگاہ ہونے اور ظاہر وباطن کو آراستہ وپیراستہ کرنے کا زریں موقع نصیب ہوا۔ کچھ برسوں تک علم ظاہر حاصل کرنے کی سعادت بھی ملی۔ چناں چہ قطبی تک کی تعلیم اپنے پیرومرشد ہی سے حاصل کی پھر مدرسہ حنفیہ، جون پور میں فرنگی محل لکھنو کے مشہور ومعروف عالم دین حضرت علامہ عبدالحلیم فرنگی محلی سے بھی درسیات کی تعلیم حاصل کی۔ حضرت علامہ فرنگی محلی درسی کتابوں کے مشہور محشی مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کے والد ماجد اور مشہور درسی کتاب ''نورالانوار'' پر معلوماتی تحقیقی حاشیہ ''قمرالاقمار'' کے جامع ومرتب اور دوسری کئی اہم دینی وتاریخی کتابوں کے مصنف تھے۔

آپ کی تحصیل علم کی شان بڑی حیرت انگیز ہے کہ آپ نے کبھی کوئی کتاب ایک یا نصف صفحہ سے زیادہ نہیں پڑھی۔ مطالعہ میں استغراق وانہماک کا یہ عالم تھا کہ ایک یا نصف سطر کے مطالعے میں پوری رات گذر جاتی۔

اس کا اندازہ اس واقعے سے بخوبی ہوتا ہے کہ ایک بار آپ رات میں محلے کے ایک حلوائی کی دکان پر بغرضِ مطالعہ بیٹھے تو ایک برات پوری دھوم دھام کے ساتھ گذر گئی اور آپ کو مطلق خبر نہ ہوئی۔ جب اذان فجر کی صدائے دل نواز فضائے دہر میں گونجی تو سلسلۂ محویت واستغراق ٹوٹا۔

کبھی کبھار استاذ وشاگرد کے افادہ واستفادہ کا سلسلہ اتنا دراز ہوتا کہ نصف یا ایک سطر کے درس میں چھ سات گھنٹے صرف ہوجاتے اور استاذ وشاگرد دونوں پسینہ سے شرابور ہوجاتے۔ آخر کار علامہ عبدالحلیم فرنگی محلی کتاب بند کرادیتے اور فرماتے کہ تمہیں مزید پڑھنے کی ضرورت

نہیں اور میری طرف سے اجازت ہے کہ تم دوسروں کو کتاب پڑھاؤ مگر حضرت اس کے باوجود پوری کتاب کا غائرانہ مطالعہ ضرور فرما لیتے۔

کبھی ایسا بھی ہوا کہ حضرت نے انتہائی غور وفکر کے بعد کوئی ایسا اعتراض قائم کیا کہ مولانا عبدالحلیم رحمہ اللہ کو اس کا تسلی بخش جواب تلاش کرنے میں دو ہفتوں تک کتابوں کی ورق گردانی اور غور وفکر کرنا پڑا مگر جو جواب انھوں نے نکالا وہ اتنا کمزور اور پھسپھسا تھا کہ حضرت کو نہایت ادب سے عرض کرنا پڑا ''حضرت آپ استاذ ہیں۔ کہیے تو مان لوں مگر یہ میرے اعتراض کا جواب نہ ہوا''۔

تحصیل تعلیم کا سلسلہ ابھی جاری ہی تھا کہ حضرت مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی لکھنؤ چلے گئے اور ان کی جگہ حضرت مولانا مفتی محمد یوسف صاحب علیہ الرحمہ تشریف لائے۔ جب آپ ہدایہ پڑھنے کے لیے مفتی صاحب کی خدمت میں آئے تو انہوں نے فرمایا کہ میرا معمول ہے کہ شمس بازغہ کے بعد ہی میں ہدایہ پڑھاتا ہوں۔ حضرت نے عرض کی میں شمس بازغہ پڑھ چکا ہوں۔ اس پر حضرت مفتی صاحب نے عام شاگردوں کی طرح آپ کو پڑھانا چاہا۔ آپ نے عرض کی ''میں تین سطروں کا مطالعہ کر کے آیا ہوں، میں نے ان تین سطروں میں جو باتیں پیدا کی ہیں، انہیں سن لیجیے۔ اجازت ملنے پر حضرت نے ان سطروں پر تین گھنٹے تک ایسی تقریر فرمائی کہ حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ دم بخود سنتے رہے۔ جب تقریر ختم ہوئی تو فرمایا کہ صاحبزادے میں آپ کی ذہانت کی تعریف مولانا عبدالحلیم سے سن چکا ہوں۔ جب ایسے شاگرد کی تلاش تھی تو کوئی نہیں ملا۔ اب ضعیف ہو چکا ہوں۔ آپ کو پڑھانے کے لائق نہیں رہا اس لیے خود کتاب کا مطالعہ کر کے پڑھایئے اگر کوئی شبہہ ہو تو پوچھ لیجیے گا۔

تحصیل علم سے فراغت کے بعد درس وتدریس کا مشغلہ بھی اختیار کیا اور جب تک اس مشغلے سے وابستہ رہے، معمول یہ رکھا کہ جو کچھ پڑھانا ہوتا اسے لکھ لیتے اس طرح آخر تک پہنچتے پہنچتے ایک رسالہ تیار ہو جاتا اور جس کو پڑھاتے رسالے کا نام اسی کے نام پر رکھ دیتے۔ اسی طرح اکثر شروح وحواشی لکھے مگر اشاعت نہ ہونے کی وجہ سے کسی کو معلوم نہیں۔

آپ بڑے قادر الکلام اور پر گو شاعر تھے۔ آپ کی شاعری عمدہ تراکیب، شوکتِ الفاظ، انوکھے اور بلند خیالات، نادر واردات وجذبات، مضامینِ قرآن وسنت، حقائق ودقائق تصوف

اور عقائد و معمولات اہل سنت کے بیان پر مشتمل ہونے کے ساتھ انتہائی نرالا عاشقانہ و متغزلانہ انداز بھی لیے ہوئے ہے جس میں سنجیدگی و دردمندی ہے تو متین گداز بھی، حقیقت و مجاز کی ہم آہنگی ہے تو تشبیہات و استعارات اور رموز و کنایات کا بکثرت استعمال بھی۔ غرض آپ کی شاعری اس لائق ہے کہ اردو ادب میں اسے نمایاں مقام دیا جائے اور اسے اردو ادب کی زریں تاریخ کا جزوِ لاینفک قرار دیا جائے۔

آپ ایک عظیم اور باکمال طبیب بھی تھے۔ حال یہ تھا کہ بارہ پندرہ سو آدمیوں کا مجمع آپ کے مطب پر ہوتا۔ نماز اشراق کے بعد سے وقت ظہر تک مطب میں بیٹھتے، دونوں ہاتھوں سے نبض دیکھتے اور چار چار کاتب نسخے لکھتے۔ آپ کے دستِ شفا سے سنگین بیماریوں میں مبتلا اور زندگی سے مایوس مریض چند دنوں میں شفایاب ہو کر خوشی خوشی اپنے گھروں کو واپس ہوتے۔ لیکن یاد رہے کہ حضرت آسی نے علم طب کی تحصیل کے لیے کسی استاذ کے سامنے زانوے ادب تہ نہ کیا۔ اس لیے اسے فضل خداوندی سے فیض مشائخ سلسلہ ہی سمجھنا چاہیے۔

حضرت آسی فرائض و واجبات کے پابند اور حرام و ناجائز کاموں حتی کہ خلاف شرع امور سے سخت گریزاں تھے۔ زندگی کے آخری دور میں انہوں نے ایسے سخت مجاہدے اور شاق ریاضتیں کیں جن کی نظیر صوفیۂ امت آخرین میں نہیں ملتی۔

جس طرح صوفیۂ کرام کا اہل سنت کے تمام ثابت شدہ عقائد پر غیر متزلزل اعتقاد ہوتا ہے اسی طرح حضرت آسی بھی ان عقائد پر سختی سے قائم اور معمولات و شعائر اہل سنت پر مضبوطی کے ساتھ کاربند تھے۔ وہ صوفیہ کے اوصاف و کمالات کا پرتو جمیل اور ان کی سیرت و کردار کا عمدہ نمونہ تھے۔ ان کے اندر محبت الٰہی، عشق رسالت، عقیدت اولیا، تواضع و خاکساری، قناعت و استغنا، توکل علی اللہ، ایثار، غیبت سے نفرت، شکایت سے گریز، غصہ سے احتراز، خلق خدا کے ساتھ محبت و شفقت اور حسن خلق، حسد و کینہ سے اعراض، دنیاوی بکھیڑوں اور جھگڑوں سے بے تعلقی، صبر و ضبط، زہد، صحو و سکر، اخلاص و ادب، معرفت الٰہی، خوف و رجا، محبوب ازلی سے وصل و ملاقات کا شوق، صدق، حیا اور فراست وغیرہ اوصاف پوری قوت کے ساتھ موجود ہیں۔

جس طرح اہل عرفان صوفیۂ کرام وحدت الوجود یعنی "لا موجود الا اللہ" کے قائل

ہوتے ہیں کہ اللہ کے سوا حقیقی وجود کسی کا نہیں مانتے اسی طرح حضرت آسی بھی وحدت الوجود کے قائل تھے۔

وحدت الوجود کیا ہے؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے امام احمد رضا رحمہ اللہ تعالیٰ ارقام فرماتے ہیں: ''مرتبہ وجود میں صرف حق عز وجل ہے کہ ہستی حقیقۃً اسی کی ذات پاک سے خاص ہے۔ وحدتِ وجود کے جس قدر معنی عقل میں آسکتے ہیں یہی ہیں کہ ''کل شیء ھالک الا وجھہ'' اور حاشا یہ معنی ہر گز نہیں کہ من وتو زید وعمرو ہر شی خدا ہے۔ یہ اہل اتحاد کا قول ہے جو ایک فرقہ کافروں کا ہے۔ اور پہلی بات اہل توحید کا مذہب ہے جو اہل اسلام وایمان حقیقی ہیں''۔

[کشف حقائق واسرار دقائق بحوالہ امام احمد رضا اور تصوف، ص: ۱۷)

حضرت آسی نے اپنے اشعار میں اس مضمون کو اتنی خوش اسلوبی اور چابک دستی کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ طبیعت وجد کرنے لگتی ہے۔ فرماتے ہیں:

پوچھتے ہو کہ سر وحدت کیا
ماسوا کی بھلا حقیقت کیا

یعنی وحدۃ الوجود یہ ہے کہ اللہ کے سوا تمام چیزیں حقیقی وجود سے محروم ہیں کیوں کہ حقیقی وجود سے متصف صرف ذات الٰہی ہے کوئی اور ہستی نہیں۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

غیر ظاہر نہ مظاہر کی حقیقت سمجھوں
اتنی تمیز میان حق و باطل دینا

اے اللہ! تو مجھے حق وباطل کے درمیان خط امتیاز کھینچنے کی اتنی توفیق عطا فرما کہ میں مظاہر کائنات کی حقیقت صرف یہ سمجھوں کہ ان کا وجود ان کی محض ظاہری حالت ہے، حقیقی وجود سے ان کا کوئی تعلق نہیں کیوں کہ حقیقی وجود تو تیرے ساتھ خاص ہے۔

فنا: صوفیہ کرام کے یہاں فنا کی درج ذیل صورتیں ہیں:

(۱) کسی شخص کا ان افعال کو ترک کر دینا جو شریعت کے اندر مذموم قرار دیے گئے ہیں۔ یہ خواہشات۔ سے فنا ہونا ہے۔

(۲) بندہ کا دل سے دنیا سے روگردانی کرنا۔ یہ ہر طرح کی رغبت سے فنا ہونا ہے۔

(۳) کسی شخص کا اپنے اخلاق کو ٹھیک کر لینا اور اپنے دل سے حسد، کینہ، بخل، غصہ، تکبر اور اسی طرح کی دیگر رعونتوں کو دور کر دینا۔ یہ اخلاق بد سے فنا ہونا ہے۔

(۴) کسی بندے کا احکام کے ردو بدل میں اللہ کی قدرت کے جاری ہونے کا مشاہدہ کرنا۔ یہ حوادثات کو مخلوق کی طرف سے خیال کرنے سے فنا ہونا ہے۔

(۵) کسی پر سلطانِ حقیقت کا ایسا غلبہ ہونا کہ وہ کسی چیز کو غیر اللہ کی طرف سے نہ دیکھے نہ اصل کو نہ اس کے نشان کو۔ یہ مخلوق سے فنا ہونا ہے۔ [ملخصاً از رسالہ قشیریہ، ص: ۲۳۹، ۲۴۰]

انہیں صورتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت آسی یوں گویا ہیں:

سلوک راہِ وفا میں فنا کے طور ہیں اور
جو آپ مار کے تیشہ مرا تو جھک مارا

یعنی راہ وفا پر چلنے میں فنا کے جو طور طریقے سالکان راہ وفا اختیار کرتے ہیں، وہ اس طریقے سے بالکل مختلف ہیں جو اہل دنیا اپناتے ہیں کہ خود سے اپنی نہایت قیمتی جان کو تلف کر کے اپنی حیاتِ مستعار کا خاتمہ کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگ عقل و دانش سے محروم اور احمق و نادان ہوتے ہیں۔

''فنا کے طور'' سے حضرت آسی نے فنا کی مذکورہ بالا صورتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ خود کشی کر کے فنا ہونا بے فائدہ اور بے نتیجہ عمل ہے۔ جب کہ کار آمد فنا یہ ہے کہ انسان اپنی قیمتی جان کو محفوظ رکھتے ہوئے، خواہشاتِ نفسانی، ہر طرح کی رغبت، حسد، کینہ، بخل، غصہ، تکبر، دیگر رعونتوں، حوادث کے مخلوق کی طرف سے ہونے کے خیال اور مخلوق سے اسے دور رکھے اور یہ نسخۂ کیمیا صرف راہ وفا پر چلنے والے صوفیۂ کرام ہی کے پاس ہے۔

فقر: صوفیۂ کرام نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق ''فقر'' کی مختلف تفسیریں کی ہیں:

یحییٰ بن معاذ کہتے ہیں: فقر کی تعریف یہ ہے کہ دنیا کی کسی قسم کے اسباب و ذرائع پر اعتماد نہ کیا جائے۔ [رسالۂ قشیریہ ص ؟ ۲۲۵]

رویم نے کہا: نفس کو احکام الٰہیہ میں چھوڑ دینا ''فقر'' ہے۔ [رسالہ قشیریہ، ص: ۵۲۳]

امام قشیری نے اس کی اہمیت وفضیلت ومرتبہ کا بیان یوں فرمایا:

''فقر اللہ کے ولیوں کا شعار اور خواص کا زیور ہے اور اسے اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں مثلاً اتقیا اور انبیا کے لیے پسندیدہ قرار دیا ہے''۔ [رسالہ قشیریہ، ص: ۵۲۱]

''فقرا'' کی فضیلت اور ان کا مرتبہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فقرا وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے منتخب کر رکھا ہے اور یہ لوگ مخلوق میں اللہ کے راز کے متحمل ہوتے ہیں۔ انہی کی بدولت اللہ تعالیٰ مخلوق کی حفاظت کرتا ہے اور انہی کی برکت سے اللہ رزق میں وسعت دیتا ہے اور صابر فقیر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ہم نشین ہوں گے۔'' [رسالہ قشیریہ، ص: ۵۲۱]

حضرت آسی نے اپنے مندرجہ ذیل شعر میں اسی ''فقر'' کے رتبوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

خرقہ فقر کے رتبے فقرا جانتے ہیں
یہ وہ جامہ ہے جسے آلِ عبا نے بھیجا

فقر کے کیا مرتبے ہیں؟ ان سے صرف فقرا آگاہ ہیں اور انھیں یہ دولتِ بے بہا حضرت علی ، حضرت فاطمہ اور حضرات حسنین سے ملی ہے۔

شوق: صوفیہ کے نزدیک شوق کا مطلب ہے ''محبوب کی ملاقات کے لیے دلوں کا جوش مارنا۔'' [رسالہ قشیریہ، ص: ۶۰۸]

اس تعلق سے فرماتے ہیں:

اب تو دیدار دکھا دیجیے تقصیر معاف
ہو گیا وعدۂ فردا ہی قیامت مجھ کو

خیر آجاتی قیامت ، تو قیامت ہی سہی
دیکھ لینا تو کسی طرح میسّر ہوتا

ساتھ چھوڑا سفر ملکِ عدم میں سب نے

لپٹی جاتی ہے مگر حسرت دیدار ہنوز

یہ اشعار جو سہل ممتنع کا ایک خوبصورت مرقّع ہیں، ان کے پہلے شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت آسی کا دل محبوب کے دیدار و ملاقات کے لیے اس قدر جوش پر ہے کہ ملاقات کے وعدۂ فردا کو وہ اپنے لیے مصیبت اور عذاب قرار دے رہا ہے۔ دوسرے شعر میں حضرت آسی قیامت کو اس کے حقیقی معنی میں ۔لے کر پر زور تمنا کر رہے ہیں کہ جب دیدار محبوب ازلی قیامت کے آنے پر ہی ٹھہری ہے تو اے کاش قیامت ہی آ جاتی تاکہ دلِ بے قرار کو دولت دیدار نصیب ہو جانے سے قرار آ جاتا۔ تیسرے شعر میں فرماتے ہیں کہ جب اس دنیا سے ملک عدم کے لیے میرا رخت سفر بندھا تو تمام اعزہ واقربا اور دوست احباب نے میرا ساتھ چھوڑ دیا اور مجھے دفن کر کے سب واپس چلے آئے مگر شوق دیدار تھا جو اب بھی لپٹا جا رہا تھا۔

● صوفیاے کرام، سلف صالحین ہی کی طرح اللہ تعالیٰ کو واحد، واجب الوجود، قدیم، ازلی، ابدی، بے پروا اور فہم و ادراک سے ماورا مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کی صفات نہ عین ذات ہیں نہ غیر ذات اور ذات ہی کی طرح وہ بھی قدیم، ازلی، ابدی ہیں۔ وہ اسے جسم، جوہر، عرض، مکان اور جہت سے منزّہ اور تمام صفات عیب و نقص سے پاک مانتے ہیں۔

[ماخوذ از رسالہ قشیریہ]

اہل سنت کے مطابق استواء علی العرش کے بارے میں صوفیہ بھی یہی کہتے ہیں کہ:

قرآن کریم میں اس کے لغوی معنی چڑھنا یا بیٹھنا اور ٹھہرنا مراد نہیں ہیں، کیوں کہ اس سے ذات باری تعالیٰ کا مکان پر ہونا لازم آئے گا جو قرآن و حدیث کی تصریحات کے خلاف ہے۔

حضرت ذوالنون مصری فرماتے ہیں:

''الرحمن علی العرش استوی'' سے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کا ثبوت دیا ہے اور اپنے مکان کی نفی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے ساتھ موجود ہے اور اشیا اس کے حکم سے جیسا اس نے چاہا موجود ہیں۔

حضرت شبلی مذکورہ آیت کریمہ سے متعلق ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

رحمٰن تو ازل سے موجود ہے اور عرش حادث ہے۔ لہٰذا یہاں مراد یہ ہے ''العرش

بالرحمٰن استوی'' عرش کا قیام اللہ سے ہے۔[رسالۂ قشیریہ،ص:۱۴۱]

حضرت آسی اسی عقیدہ کی ترجمانی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

عرش پر کہیے تو اثباتِ مکاں ہوتا ہے
کیا فلک بھی مرے سینے کے برابر ہوتا

یعنی اگر اللہ تعالیٰ کے لیے کہیے کہ وہ عرش پر ہے تو اس سے اللہ کا مکان پر ہونا ثابت ہوتا ہے جب کہ وہ لامکانی ہے۔اس لیے عرش میرے دل کے برابر نہیں ہوسکتا کیوں کہ اللہ تعالیٰ تو مجھ سے میرے دل کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے جب کہ عرش کا حال ایسا نہیں۔

ارشاد ربانی ہے:''ونحن اقرب الیہ من حبل الورید''[ق:۱۶]

''ہم اس سے اس کی شہِ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں''۔

حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

دوست نزدیک تر از من بمن ست
ویں عجب ترکہ من ازوے دورم

● ہل سنت کا عقیدہ ہے کہ اللہ ایک ہے،اس کا کوئی شریک نہیں،عبادت کا وہی مستحق ہے اور غیر اللہ کی عبادت شرک وکفر ہے۔

حضرت آسی اس عقیدہ کا بیان اس طرح فرماتے ہیں:

سجدۂ در جو تمھارا نہ میسر ہوتا
وہی ہم ہوتے وہی سر وہی پتھر ہوتا

یعنی اگر محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دعوت توحید کے طفیل میں ہمیں خدائے واحد وبرحق کی معرفت نصیب نہ ہوتی تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہم پتھر کے سامنے سربسجود ہوتے اور اس کی عبادت سے محروم رہتے۔

● اللہ تعالیٰ ہمہ وقت کام میں ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''کل یوم ھو فی شان ''[رحمٰن:۲۹]''وہ ہر وقت کام میں ہے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ اپنی تقدیرِ ازلی کیمطابق عالم میں ہر وقت کسی کو زندگی دیتا ہے تو کسی کو

موت، کسی کو عزت بخشتا ہے تو کسی کو ذلت، کسی کو مال وزر سے نوازتا ہے تو کسی کو محروم، کسی دعا کرنے والے کی دعا کو قبول فرماتا ہے تو کسی مانگنے والے کو اپنی عطاؤں سے شاد کام کرتا ہے۔وغیرہ وغیرہ۔

علامہ جلال الدین محلی آیت مذکورہ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"(کل یوم)وقت(هو فی شان) امر یظهره فی العالم علیٰ وفق ما قدره فی الازل من اعطاء سائلٍ وغیر ذالک۔" [تفسیر جلالین، پ:۲۷، رحمٰن:۵۵]

اسی مضمون کو حضرت آسی یوں بیان کرتے ہیں:

مزا ہر آن میں ہے شانِ نو کا
مگر جب دل نہ ہو غافل ہمارا

● کچھ لوگ انبیاے کرام واولیاے امت سے توسل واستغاثہ کو شرک قرار دیتے ہیں حالاں کہ یہ مقدّس ومحترم بندے محض وسائل ہیں اور وسائل کو ذریعہ بنانا اوران کی مدد لینا یقیناً جائز ودرست ہے اور ایسا وہ لوگ بھی کرتے ہیں جو وسیلہ واستغاثہ کا بڑی شدت سے انکار کرتے ہیں۔

قرآن کریم اور فرامین رسول اس کے جواز کا اظہار واعلان یوں کرتے ہیں۔

ارشادربانی ہے:و انهم اذ ظلموا انفسهم جاء وک فاستغفروا الله و استغفر لهم الرسول لوجدوا الله توابا رحیما۔" [نساء:۶۴]

"اگر لوگ اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھنے کے بعد اے محبوب تمھاری بارگاہ میں آجائیں اور اللہ سے مغفرت طلب کریں اور اے رسول تم بھی ان کے لیے مغفرت طلب کرو تو وہ اللہ کو بڑا توبہ قبول فرمانے والا نہایت مہربان پائیں گے۔"

جلیل القدر صحابی حضرت عثمان بن حنیف کی حدیث ہے کہ:

ایک نابینا نے بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کی یارسول اللہ! اللہ سے دعا فرمادیجیے کہ وہ مجھے بینائی عطا فرمادے۔ یہ سن کر حضور نے فرمایا: جاؤ اور وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھو۔ پھر یوں کہو:اللهم انی اسئلک و أتوجه الیک بنبی محمد،نبی الرحمة،یا محمد!

اِنی اتوجه بک الیٰ ربک أن یکشف عن بصری ،اللهم شفعه فی قال:فرجع و قد کشف الله عن بصره۔"

یا اللہ! میں رحمت والے اپنے نبی کے وسیلے سے تجھ سے سوال کرتا اور تیری طرف توجہ کرتا ہوں، یا محمد ﷺ! میں آپ کے وسیلے سے آپ کے رب کی جانب اس لیے متوجہ ہوں کہ وہ مجھے بینائی عطا فرمادے۔اے اللہ! میرے بارے میں اپنے رسول کی شفاعت کو قبول فرما۔"

حضرت عثمان فرماتے ہیں کہ وہ شخص بینا ہو کر اپنے گھر واپس ہوا۔

اس حدیث پاک سے نہ صرف وسیلہ واستغاثہ کا جواز ثابت ہوا بلکہ حضور کا اس کی تعلیم دینا بھی ثابت ہوا۔[سنن ترمذی ج ،ص:۵۶۹،حدیث ۳۵۷۸۔کتاب الدعوات،سنن ابن ماجہ، کتاب الصلوٰۃ، دلائل النبوۃ للبیہقی ،ج ،۶/۱۶۶اور مابعد،شفائے قاضی عیاض،ص:۲۵۴]

پھر یہ وسیلہ واستغاثہ حضور کی حیات مبارک کیساتھ ہی خاص نہیں بلکہ اس اس کارگاہ حیات میں آپ کی تشریف آوری سے پہلے اور بظاہر پردہ فرما کر رفیق اعلیٰ سے جا ملنے کے بعد بھی جائز ودرست ہے۔چناں چہ حضرت علامہ تاج الدین فاکہانی (متوفی:۷۳۴ھ) اور دوسرے اکابر علمانے اپنی تصنیفات میں تینوں حالتوں میں حضور سے استغاثہ اور حضور کو وسیلہ بنانے کا جواز ثابت کیا ہے۔اسی طرح دوسرے محبوبان خدا سے بھی ان کی زندگی میں اور بعد وفات وسیلہ واستغاثہ جائز وثابت ہے۔

حضرت آسی وسیلے کے عدم جواز کے باطل و بے بنیاد موقف کا رد اور اس کے جواز کے قائل لوگوں کی طرف شرک کی نسبت کو تہمتِ بے جا قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

نسبتِ شرک بجز تہمتِ بے جا کیا ہے
دل ہے جب اس کی طرف رخ ہے وسائل کی طرف

یعنی جب مومن کا دل اللہ کی طرف ہے،وہ اسی کو مستعانِ حقیقی مانتا ہے اور صرف اس کا رخ اللہ کے مقرب ومعظم بندوں کی طرف ہے جنہیں وہ محض وسیلۂ بارگاہِ الٰہی تصور کرتا ہے تو پھر اسے شرک ٹھہرانا تہمت بے جا کے سوا کیا ہے۔

● حضور کا پسینہ مہکتا تھا۔حضرت مالک بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں:

''دخل علینا النبی صلی ﷺ فقال عندنا فعرق وجاء ت آمی بقارورة فجعلت تسلت العرق فیھا فاستیقظ النبی ﷺ فقال: یا أم سلیم! ماھٰذا الذی تصنعین قالت: ھٰذا عرقک نجعله فی طیبنا وھو من الطب۔''

[صحیح مسلم باب طیب عرق النبی والتبرک به]

''اللہ کے رسول ﷺ ہمارے گھر تشریف لائے اور یہیں قیلولہ فرمایا۔ دورانِ قیلولہ آپ کے جسم اطہر سے جو پسینہ نکلا اسے میری والدہ ایک شیشی میں جمع کرنے لگیں تو حضور بیدار ہو گئے اور فرمایا: ام سلیم! یہ کیا کر رہی ہو؟ انہوں نے عرض کی: یہ آپ کا پسینہ ہے، اسے ہم لوگ اپنی خوشبو میں شامل کریں گے کیوں کہ یہ سب سے اچھی خشبو ہے''۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ روایت کرتے ہیں:

''آن النبی صلی اللہ علیه وسلم لم سلک طریقا فیتبعھا أحد الاعرف أن قدسلکه من طیب عرفه اوقال: من ریح عرقه.''

[مشکوۃ، باب اسماء النبی وصفاته، الفصل الثانی/ص:۵۱۷]

''سرکار علیہ الصلوٰۃ والتسلیم جب کسی راستے سے گذر جاتے تو بعد میں اس راستے سے گذرنے والا راستے میں پھیلی ہوئی خوشبو سے یہ جان لیتا تھا کہ حضور اس راستے سے گذرے ہیں''۔

حضرت آسیؔ نے اسی مضمون کو اس شعری قالب میں ڈھالا ہے:

وہ جسم تھا یا کوئی گل تر شمیم جس کی وہ روح پرور
جدھر سے گذرے بسا وہ رستہ بہا پسینہ گلاب ہو کر

● حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے محبت جنت میں جانے کا سبب ہے۔ حضرت یعلی بن مرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''حسین منی و آنا من حسین آحب اللہ من آحب حسینا۔''

یعنی حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں۔ جس نے حسین سے محبت کی اس سے اللہ نے محبت کی۔ [مشکوٰۃ، باب مناقب اہل البیت/ص ۱۵۷)

اور ظاہر ہے کہ جسے اللہ اپنا محبوب بنالیا وہ یقیناً جنت میں جائے گا۔

اسی عقیدت کو عقیدت ومحبت کی بنا پر حضرت آسی یوں گویا ہوتے ہیں:

آسی نامہ سیہ لائق دوزخ بھی نہ تھا

خلد میں الفت شاہِ شہدا نے بھیجا

● اب میں حضور ختمی مرتبت ﷺ کے اول خلق ہونے کے عقیدے کے بیان پر مشتمل حضرت آسی کے شعر اور اس کی تشریح پر مضمون ختم کرتا ہوں۔

امام عبدالرزاق نے اپنی سند سے حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ انہوں نے حضور اکرم ﷺ سے پوچھا:

یارسول اللہ بابی و أمی اخبرنی عن اول شیء خلقه الله تعالیٰ قبل الاشیاء .قال:یاجابران الله تعالیٰ قد خلق قبل الاشیاء نور نبیک من نوره فجعل ذلک النور یدور بالقدرة حیث شاء الله تعالیٰ،ولم یکن فی ذلک الوقت لوح ولاقلم ولاجنة ولانار ولاملک ولاسماء ولا أرض ولا شمس ولاقمر ولاجنی ولاانسی فلما أراد الله تعالیٰ أن یخلق الخلق قسم ذلک النور أربعة اجزاء فخلق من الجزء الاول القلم،ومن الثانی اللوح ومن الثالث العرش ثم قسم الجزء الرابع أربعة آجزاء فخلق من الجزء الاول حملة العرش ومن الثانی الکرسی ومن الثالث باقی الملائکة ثم قسم الجزء الرابع آربعة أجزاء فخلق من الا ول السمٰوات ومن الثانی الارضین ومن الثالث الجنة والنار ثم قسم الجزء الرابع آربعة آجزاء فخلق من الاول نور أبصار المؤ منین ومن الثانی نور قلوبهم—وهی المعرفة بالله—ومن الثالث نور [انسهم وهو التوحید لا إله الاالله محمدرسول الله.

[المواهب اللدنية باالمنح المحمديه، ج:اول/ص ۴۸]

"یارسول اللہ: آپ پر میرے ماں باپ قربان! آپ مجھے بتائیے کہ وہ سب سے پہلی چیز کون ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تمام اشیا کی تخلیق سے پہلے پیدا فرمایا؟ حضور نے جواب دیا۔ اے

جابر! اللہ تعالیٰ نے تمام اشیا سے پہلے تیرے نبی کے نور کو اپنے نور سے پیدا کیا پھر وہ نور قدرتِ الٰہی سے جہاں جہاں اللہ نے چاہا گردش کرنے لگا اور اس وقت نہ لوح تھی نہ قلم، نہ جنت تھی نہ دوزخ، نہ کوئی فرشتہ تھا نہ آسمان و زمین، نہ سورج تھا نہ چاند اور نہ کوئی جن تھا نہ انسان۔ پھر جب اللہ نے مخلوق کو پیدا کرنا چاہا تو اس نور محمدی کے چار حصے کر کے اول سے قلم، دوم سے لوح اور سوم سے عرش کی تخلیق فرمائی، پھر چوتھے کے چار حصے فرما کر اول سے حاملین عرش، دوم سے کرسی، سوم سے باقی فرشتوں کو پیدا فرمایا۔ اس کے بعد چوتھے جز کے چار اجزا فرما کر اول سے مومنین کی بصیرتوں کے نور کو، دوم سے ان کے دلوں کے نور یعنی معرفت الٰہی کو، سوم سے ان کے نورِ "انس" یعنی توحید کو پیدا فرمایا۔ یہ توحید لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے جس کے معنی ہیں: اللہ کے سوا وجود میں کوئی معبودِ برحق نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔"

حدیث میں نور محمدی (ﷺ) کی چار اجزا میں تقسیم سے مراد ہے، اس میں زیادتی کرنا۔

علامہ زرقانی فرماتے ہیں:

"قسم ذلک النور اربعة اجزاء، أی: زادفیه، لا أنه قسم ذلک النور الذی هو نور المصطفیٰ." [شرح الزرقانی علی المواہب ج اول/ص: ۹۰]

یہ حدیث صحیح ہے اور بہت سے معتمد و معتبر سیرت نگاروں نے اسے اپنی اپنی کتابوں میں درج فرمایا ہے۔ مثلاً شیخ اکبر حضرت ابن عربی حاتمی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "تلقیح الاذہان" میں اور علامہ دیار بکری نے "کتاب الخمیس فی انفس نفیس" میں اس حدیث کو امام عبدالرزاق کی طرف منسوب کیا ہے۔

علامہ عیسیٰ بن عبداللہ بن محمد بن مانع حمیری مدظلہ العالی سابق مدیر عام دائرۂ اوقاف وامور اسلامیہ دبئی نے تلاش بسیار کے بعد مصنف عبدالرزاق سے حذف کردی جانے والی اس حدیث کو مصنف ہی کی دوسری حذف شدہ احادیث کے ساتھ "الجزء المفقود من الجزء الاول من المصنف" کے نام سے شائع کردیا ہے اور اس حدیث پر وارد ہونے والے تمام اعتراضات کا مُسکت جواب دیا ہے۔

حضرت آسی اپنے اس عقیدہ کا اظہار یوں فرماتے ہیں:

تھا نہیں کچھ بھی نشان عالم
آپ تھے جب سلطان عالم
صدقے آپ کے جان عالم
صلی اللہ علیک وسلم

حضرت شیخ سعدیؔ نے بھی اسی مضمون کو یوں بیان فرمایا ہے:

تو اصلِ وجود آمدی از نخست
دگر ہر چہ موجود شد فرع تست

علم وعمل اور رشد ہدایت کا یہ آفتابِ جہاں تاب ۲ر جمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ کو اتوار کے دن ایک بج کر بیس منٹ پر ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ فاِنا للہ اِنا الیہ راجعون۔

☆☆☆

حضرت آسی کا فقہی مقام

مفتی مبشر رضا مصباحی☆

کرۂ ارض پر ہر عہد میں کچھ ایسی ہستیاں پیدا ہوئیں کہ جن کے وجود مسعود سے کاروبار حیات میں روشنی ملی اور تاریخ کا مینارہ، عظمت و رفعت کی بلندی کو پہنچ گیا، یہ وہ ہستیاں تھیں جن کے دل و دماغ، فکر و نظر اور قوت و دانائی کو رب ذوالجلال نے ظاہری جمال اور باطنی کمال سے آراستہ فرما کر اپنے بندوں کے اصلاح اعمال، تزکیۂ نفس اور تربیت وہدایت کے لیے منتخب فرمایا پھر وہی نفوس قدسیہ آفتاب و ماہتاب بن کر اپنے منازل طے کرتی رہیں اور بندگان خدا ان کی علمی و روحانی شعاؤں سے اپنے وجود کو منور کرتے رہے۔

چودھویں صدی ہجری کی تاریخ جن نفوس قدسیہ اور عباقر اسلام کی ضیابار کرنوں سے روشن ہوئی، ان میں ایک ذات جمال صورت اور کمال سیرت کا آئینہ بن کر سکندر پور کی سرزمین پر نمودار ہوئی، جن کا اصلی نام محمد عبدالعلیم تجویز ہوا اور پھر بعد میں آسی تخلص کا اضافہ ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہی برصغیر ہندو پاک کے علمی، ادبی اور روحانی حلقوں میں ایک جید عالم وفقیہ، عظیم صوفی

☆صدر و شیخ الحدیث دارالعلوم شیخ احمد کھٹو، احمد آباد، گجرات

شاعر، مردِ حق آگاہ کی حیثیت سے مشہور ہوئے اور عارف باللہ، فنا فی اللہ، عاشق صادق، بحرالاسرار، قاسم الانوار، قطب العرفا و العشاق جیسے عظیم اور باوقار القابات سے ملقب ہوئے۔ اس لیے حضرت سرکار آسی کا نام ذہن میں آتے ہی ایک ایسے عارف حق، درویش کامل، نوع بنوع محامل اوصاف وکمالات اور مختلف الجہات شخصیت کا تصور ابھر کر سامنے آتا ہے جن کے چہرے سے خشیت الٰہی، عشق مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور خوف آخرت ظاہر ہوتی تھی، جنہوں نے حکیمانہ اسلوب، عارفانہ طرز اور فقر وقناعت اختیار کر کے امت مسلمہ کی خیر خواہی اور سالکین تربیت وہدایت میں اپنی گراں قدر زندگی وقف کردی، ”من عرف نفسه فقد عرف ربه“ کا درس دے کر ہزاروں گم گشتگان حق کو حق کی معرفت اور اہل ایمان کو ایمان کی سلامتی کا شعور وادراک عطا کیا، شائقین سلوک وطریقت کو روحانی استعداد اور عرفانی مقام بخشا، ہزاروں افراد آپ کے دست حق پرست پر ارادت و بیعت اور اجازت و خلافت کی نوازشات سے سرفراز ہوکر عشق وعرفان اور حقیقت ومعرفت کے سمندر میں غوطہ زن ہوگئے۔

حضرت آسی چوں کہ بیش تر لمحات امت مسلمہ کی خیر خواہی، رشد وہدایت، خدمت خلق اور دعوت وتبلیغ میں لگے رہے، اس لیے ان کی حیات مستعار میں علمی، روحانی اور تبلیغی خدمات کے علاوہ بظاہر فقہی خدمات کا ذخیرہ نہیں ملتا۔ لیکن اگر ان کی صوفیانہ وعارفانہ شاعری اور زاہدانہ و عابدانہ زندگی کے مختصر گوشوں پر غائر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں وہ ایک صوفی شاعر اور بے مثل زاہد تھے وہیں ایک صاحب بصیرت عالم وفقیہ اور دقیق نظر محقق ومتکلم بھی تھے اور ایسا کیوں نہ ہو کہ ایک عابد صادق اور مردِ حق آگاہ کی یہی علامت وشعار ہوا کرتی ہے۔

حدیث شریف میں ہے:

”المتعبد بغير فقه كا لحمار في الطاحون.“

[کنز العمال ۹/۶۸۷، الباب الاول فی الترغیب]

یعنی علم شریعت کے بغیر عابد ایسا ہے جیسے چکی میں گدھا۔

حضرت امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

”من تفقه و لم يتصوف فقد تفسق و من تصوف و لم يتفقه

فتزندق“

یعنی جس نے شریعت کی تعلیم لی؛ لیکن اس نے صوفیہ کا طریقہ اختیار نہ کیا تو بلاشبہ وہ گنہ گار ٹھہرا اور جس نے صوفیہ کا طریقہ اختیار کیا اور شریعت کی تعلیم نہیں لی تو اس کے ایمان کا بھروسہ نہیں۔

دانشورانِ علم و ادب جانتے ہیں کہ اصناف شعر و سخن میں سے حمد و نعت گوئی ایک ایسا صنف نازک اور وصف دقیق ہے کہ شریعت و طریقت اور علم الکلام سے نا آشنا اگر دونوں کے درمیان خط امتیاز کھینچ نہ سکے تو بسا اوقات شاعر اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی میں راہ حق سے برگشتہ معلوم ہوتا ہے؛ کیوں کہ مقام نعت گوئی دو حدوں کے درمیان محیط ہے، ایک حد کا نام افراط ہے اور دوسرے کا نام تفریط۔ شاعر نعت گوئی میں افراط کی منزل کو پہنچ جائے تو انجام شرک ہو جاتا ہے اور تفریط کی راہ تک پہنچ جائے تو کفر ہو جاتا ہے۔ یہی وہ بنیادی وجہ تھی اور ہے کہ جس کی وجہ سے بے شمار اربابِ زبان و بیان اس میدان سے دور رہے۔

لیکن حضرت آسی ایک ایسے عابد و زاہد اور صوفی شاعر رہے کہ جن کی زندگی اور شاعری میں شریعت و طریقت اور علم الکلام کے جلوے بھی نظر آتے ہیں اور حدیث دانی اور حدیث فہمی کے جواہر پارے بھی۔ میں آئندہ سطروں میں صرف ایک شعر بطور مثال پیش کروں گا جس سے قارئین کو اندازہ ہوگا کہ حضرت آسی نہ صرف عابد صادق اور عاشق رسول شاعر تھے، بلکہ وہ فقہ و حدیث پر بھی بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔

آیئے سب سے پہلے ہم قارئین کی عدالت میں آپ کے زمانۂ طالب علمی کا ایک اہم نمونہ پیش کرتے ہیں جس سے نہ صرف آپ کا فقہی ذوق معلوم ہوتا ہے بلکہ آپ کا فقہی مقام اور فقیہانہ شان اور فقہ سے حد درجہ دل چسپی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

شیخ الاسلام علامہ برہان الدین مرغینانی کی معرکۃ الآرا تصنیف ”ہدایہ“ جو جامع دلائل عقلیہ و نقلیہ اور حسن ترتیب کی بنیاد پر فقہ حنفی کا متن و ماخذ اور مسلم الثبوت انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ برصغیر ہندو پاک کی حنفی درس گاہوں میں ”ہدایہ“ پڑھے بغیر عموماً کسی کو عالم و فاضل کی سند نہیں دی جاتی ہے۔

”عین المعارف“ کے مقدمہ میں ہے:

''جب مدرسہ حنفیہ جون پور سے مولوی عبد الحلیم صاحب لکھنو چلے گئے اور ان کی جگہ پر حضرت مولانا مفتی محمد یوسف صاحب تشریف لائے، تو حضرت ''ہدایہ'' پڑھنے کے لیے مفتی صاحب کے پاس تشریف لے گئے، مفتی صاحب نے فرمایا کہ فقیر کا معمول ''شمس بازغہ'' کے بعد ''ہدایہ'' پڑھانے کا ہے، حضرت نے فرمایا ''میں ''شمس بازغہ'' پڑھ چکا ہوں''، مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مثل عامی شاگردوں کے پڑھانا چاہا۔ حضرت نے فرمایا ''میں تین سطروں کا مطالعہ کر کے آیا ہوں، میں نے جو باتیں ان تین سطروں میں پیدا کی ہیں، ان کو سن لیجیے۔''، حضرت نے تین گھنٹے تک ان تین سطروں پر تقریر کی۔ مفتی صاحب دم بخود سنتے رہے۔ جب حضرت تقریر ختم کر چکے تو مفتی صاحب نے فرمایا کہ: ''صاحب زادے میں آپ کی ذہانت کی تعریف مولوی عبد الحلیم سے سن چکا ہوں۔ جب مجھے ایسے شاگرد کی تلاش تھی تو کوئی ملا نہیں، اب ضعیف ہو چکا ہوں آپ کے پڑھانے کے لائق نہیں رہا اور آپ کو اس کی حاجت بھی نہیں ہے خود کتاب دیکھ جایئے اور دوسروں کو پڑھایئے، اگر کہیں کوئی شبہ واقع ہو تو پوچھ لیجیے گا''۔ [عین المعارف، ص:۴۲]

مذکورہ بالا اقتباس اس بات پر روشن دلیل ہے کہ حضرت آسی کو بچپن ہی سے نہ صرف فقہ سے لگاؤ تھا، بلکہ ہدایہ جیسی عظیم فقہی شاہکار کے دلائل نقلیہ وعقلیہ پر کافی عبور تھا، ورنہ ایک طالب علم صرف تین سطروں پر تین گھنٹے وہ بھی ایک استاذ کے سامنے کیوں کر تقریر کر سکتا۔ ایام طالب علمی میں اتنا بڑا کارنامہ وہی انجام دے سکتا ہے جو آنے والے وقت میں اپنے وقت کا عظیم فقیہ و محقق ہوگا۔

فقہ وافتا سے شغف رکھنے والے جانتے ہیں کہ آج جس نے بھی فقہ میں کمال پیدا کیا یا جو کمال پیدا کرتا ہے وہ ''ہدایہ'' ہی کی مرہون منت ہوا کرتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ حضرت آسی کا فقہی ذوق بچپن ہی سے ظاہر ہو چکا تھا اور ایسا کیوں نہ ہو کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے دین کی سمجھ بھی عطا فرماتا ہے۔

حدیث پاک میں ہے:

''من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین'' [کنز العمال، رقم:۲۸۰۴۰، ج:۱۰]

حضرت آسی کے درج ذیل شعر سے آپ کی جلالت علمی، حدیث فہمی، سیرت دانی اور فقہی

تبحر واضح ہوتا ہے، فرماتے ہیں کہ

پوچھتے ہو شہِ جیلاں کے فضائل آسی
ہر فضیلت وہ کے جامع ہیں نبوت کے سوا

مذکورہ شعر کا مطلب واضح ہے کہ حضرت غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبوت کے علاوہ تمام محامد و فضائل، کمالات و تصرفات اور علم و عرفان کی حامل شخصیت ہیں۔

اعتراض: ارباب علم و دانش عموماً یہ سوال کرتے ہیں کہ مذکورہ شعر شرعی نقطۂ نظر سے درست نہیں ہے؛ کیوں کہ اس شعر میں حضرت غوث الاعظم کو صحابی کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ جب کہ صحابی وہی ہے جس نے حالت ایمان میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد آپ کی ظاہری حیات میں حالت بیداری میں زیارت کی اور حالت ایمان ہی میں وفات پایا۔ جیسا کہ ''صحابۂ رسول ﷺ'' میں ہے:

''(الصحابی) ھو من لقی النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مؤمنا بہ، بعد بعثتہ، حال حیاتہ، یقظۃ، ومات علی الایمان'' [صحابہ ﷺ، ص:۱۷]

شارح بخاری حضرت حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

''ان الصحابی من لقی النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مؤمنا بہ ومات علی الاسلام فیدخل فیمن لقیہ من طالت مجالستہ بہ او قصرت ومن روی عنہ او لم یرو ومن غزا معہ او لم یغز ومن رآہ رویۃ ولو لم یجالسہ ومن لم یرہ لعارض کالعمی'' [الاصابہ فی تمیز الصحابہ، ج:۱،ص:۷]

یعنی: صحابی وہ شخص ہے جس نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ایمان لاتے ہوئے آپ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا اور حالت اسلام پر ہی اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ لہٰذا صحابی کی اس تعریف میں وہ تمام خوش نصیب افراد شامل ہیں، جنہوں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ملاقات کی۔ خواہ وہ آپ کی صحبت بابرکت میں زیادہ دن رہے ہوں یا کم، آپ سے روایت کی ہوں یا نہ کی، آپ کے ساتھ جہاد میں گئے ہوں یا نہ گئے ہوں، اور جس نے صرف آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زیارت کی اور آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھنے کا بھی موقع ملا؛ لیکن

کسی عارضہ کی وجہ سے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دیدار سے مشرف نہ ہو سکے، جیسے نابینا صحابی تو یہ بھی صحابی ہیں۔

اور یہ امر بھی متفق علیہ اور مسلم الثبوت ہے کہ حضرت غوث اعظم صحابی نہیں ہیں، بلکہ سردار اولیا اور غوث زمن ہیں، اور کوئی غوث، قطب، ابدال اور ولی تا قیامت صحابی کا مقام نہیں پا سکتا ہے، خود پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانی ایک مقام پر عظمت صحابی یوں بیان فرماتے ہیں کہ:

معمولی درجہ کا صحابی (یعنی جس نے حالت ایمان میں بہت مختصر وقت پایا) جس سواری پر بیٹھ کر سفر کرے اس سواری کے قدم کا دھول مل جائے تو اسے میں آنکھوں کا سرمابناؤں گا"

مذکورہ اقتباس سے اندازہ لگائیں کہ حضرت غوث الاعظم ایک صحابی کے تعلق سے فرمائیں کہ جس سواری پر بیٹھ کر سفر کرے اس سواری کے قدم کا دھول مل جائے تو اسے میں آنکھوں کا سرما بناؤں گا،، تو پھر ان کو صحابی کا درجہ دینا اور "ان کی شان میں کہنا" ہر فضیلت کے وہ جامع ہیں نبوت کے سوا" کیوں کر صحیح ہوگا؟

جواب: حدیث پاک میں ہے:

"طوبیٰ لمن رآنی" (بشارت ہو اس کو جس نے مجھے دیکھا)

حدیث مذکور میں خوشخبری (فضیلت) کا پیغام ہر اس مرد مؤمن کے لیے ہے جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا دیدار کرے اور یہ دیدار جس طرح حیات ظاہری میں ثابت ہے اسی طرح حیات باطنی میں بھی واقع ہے۔

بخاری شریف میں ہے:

"ان ابا هريرة قال: سمعت النبی صلی الله تعالیٰ علیه وسلم يقول من رآنی فی المنام فسيرانی فی اليقظة ولا يتمثل الشيطان بی"

[بخاری شریف، رقم الحدیث ۶۹۹۳]

حدیث پاک "طوبیٰ لمن رآنی" سے یہ بات واضح ہو چکی کہ دیکھنے والوں کے لیے بہر حال فضل وکمال اور عظمت ورفعت ثابت ہے اور عالم خواب میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا دیدار کرنا در حقیقت حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہی کا دیدار ہے۔ اس لیے اس دیدار کے ثمرات

(فضیلت) کی دو نوعیت ہو سکتی ہے: (۱) دیکھنے والوں پر صحابی کا اطلاق ہو۔ (۲) دیکھنے والوں پر صحابی کا اطلاق نہ ہو بلکہ صحابی کی فضیلت کا اطلاق ہو۔

اس بات پر تمام ائمہ مسلمین کا اجماع و اتفاق ہے کہ حقیقۃ صحابی وہی ہے جو حالت ایمان میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد آپ کی ظاہری حیات میں حالت بیداری میں زیارت کرے اور حالت ایمان ہی میں وفات پایا، کوئی شخص جو صحابی نہیں ہے، چاہے وہ کتنا ہی عظیم ولی، غوث و قطب اور ابدال کیوں نہ ہو، وہ صحابی کے مقام کو نہیں پہنچ سکتا ہے۔

دوسرا معنی یہ ہے کہ عالم خواب میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زیارت کرنے والوں پر فضیلت صحابی کا اطلاق ہو، اور حدیث پاک سے یہی مراد بھی ہے کیوں کہ خواب میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زیارت کرنے والوں پر دوسرا معنی بھی صادق نہ آئے تو حدیث پاک ''طوبیٰ لمن رآنی'' اور ''من رآنی فقد رای الحق فان الشیطان لا یتکوننی'' کا کوئی معنی نہیں رہے گا اور یہ باطل ہے کہ حدیث پاک بے معنی و بے مطلب باقی رہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ خواب میں دیدار کرنے والوں کے لیے فضیلت صحابیت ثابت ہو گی اور یہی حدیث کا مفہوم ہے۔

یہاں کسی کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنے والا صحابی نہ ہو اور صحابی کی فضیلت پائے؟

اس سلسلے میں میں یہ عرض کروں گا کہ کسی شے کے لیے کسی شے کی فضیلت کا ثبوت اس شے کے لیے شے کے حکم کو لازم نہیں ہے، فقہی میدان میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں کہ شے کی فضیلت شے کے لیے ثابت ہے، لیکن اس کا حکم ثابت نہیں ہے۔ جیسے طاعون میں مرنے والے، ڈوب کر مرنے والے، ذات الجنب میں مرنے والے، پیٹ کی بیماری میں مرنے والے، جل کر مرنے والے، جس کے اوپر دیوار وغیرہ گر پڑے اور مر جائے، عورت کہ بچہ ہونے یا کنواری پن میں مر جائے ان سب کو حدیث پاک میں شہید کہا گیا ہے۔ مگر یہ مطلب نہیں کہ وہ حقیقۃ شہید ہیں، ''شہید حقیقی تو وہی ہیں جو اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کرتے ہوئے راہ خدا میں قتل کیے جائیں'' بلکہ حکماً شہید ہیں کہ یہ سب شہدا کی فضیلت پائیں گے؛ لیکن شہید کا حکم نہیں

پائیں گے۔ تو یہاں شے کی فضیلت تو ثابت ہوئی؛ لیکن شے کا حکم ثابت نہیں ہوا کیوں کہ شہید کا حکم یہ ہے کہ وہ جس لباس میں شہید ہوا ہے، اسے اسی لباس میں اسی خون میں دفن کیا جائے۔ اس کے علاوہ اور بھی مثالیں ہیں کہ شے کی فضیلت تو ثابت ہوتی ہے؛ لیکن اس کا حکم نہیں ملتا ہے، جیسے جماعت کا حکم اور جماعت کا ثواب، یہ دونوں ایک دوسرے کو مستلزم نہیں، اسی طرح حج کا حکم اور حج کا ثواب یہ دونوں ایک دوسرے کو مستلزم نہیں وغیرہ وغیرہ۔

مذکورہ تمام تفصیلات سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ شئے کا اطلاق ہونا الگ امر ہے اور شے کی فضیلت کا اطلاق الگ امر ہے۔ اسی طرح سے صحابی ہونا یہ الگ حکم ہے اور صحابی کی فضیلت پانا الگ حکم ہے، لہٰذا جو خواب میں دیدار مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مشرف ہو، وہ صحابی تو نہیں ہوگا؛ لیکن صحابی کی فضیلت ضرور پائے گا۔

اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ حضور غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بارہا سرکار دوجہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے۔

تذکرۂ مشائخ قادریہ برکاتیہ رضویہ میں ہے:

''تلخیص قلائد الجواہر میں حضرت ابوزکریا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منقول ہے کہ حضرت محبوب سبحانی، قطب ربانی نے ارشاد فرمایا کہ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایک تخت مرصع پر جلوہ گر ہو کر تشریف لائے اور مجھے الفت ومحبت سے اپنے پاس بٹھایا اور میری پیشانی پر بوسہ دیا اور اپنے جسم انور سے پیراہن مبارک اتار کر مجھ کو پہنایا اور ارشاد فرمایا: ''**ھذہ خلعۃ الغوثیۃ علی الاقطاب والابدال والاوتاد**'' [تذکرۂ مشائخ قادریہ، ص: ۲۳۰]

مذکورہ تفصیلات سے یہ واضح ہوا کہ غوث پاک کے لیے فضیلت صحابی کا حکم لگانا صحیح ہے۔ حضرت آسی کے کلام میں غور فرمائیں کہ آپ نے صحابی کا حکم نہیں لگایا ہے بلکہ فضیلت صحابی کا حکم لگایا ہے، جو حدیث اور فقہ کے حوالے سے جائز ہے۔

مذکورہ شعر کے پس منظر اور پیش منظر پر محققانہ نظر ڈالنے اور اس کی گیرائی اور گہرائی میں غور کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت آسی جہاں کثیر العبادات، شب بیدار، عارف حق اور

روحانی و عرفانی شیخ تھے، وہیں حدیث، علم حدیث، فقہ، اصول فقہ اور حضرت غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اوصاف و کمالات، فضائل و برکات سے بھی خوب واقف تھے۔

آپ کا فقہی تبحر اور علم شریعت سے آشنائی ہی واحد سبب تھا کہ شب و روز کے معاملات و مسائل میں بھی غایت درجہ احتیاط ملحوظ رکھتے تھے، صاحب سمات الاخیار رقم طراز ہیں کہ:

''احتیاط کا عالم یہ تھا کہ خانقاہ کی رقم کا خریدا ہوا کاغذ یا لفافہ اپنے نج کے خطوط میں صرف نہیں فرماتے تھے، اپنے ذاتی اخراجات میں نذر و فتوح سے کام لیتے تھے۔ صرف خانقاہ کی طرف سے روٹی کھاتے تھے باوجود یہ کہ آپ کے ذاتی مصارف کے لیے وقف نامہ میں سو روپیہ سالانہ درج تھا؛ لیکن اس میں سے ایک پیسہ بھی نہ لیتے تھے'' [سمات الاخیار، ص: ۲۵۵]

مذکورہ بالا اقتباس پر غور فرمائیں کہ خانقاہ کی رقم سے خریدا ہوا کاغذ یا لفافہ اپنے ذاتی کام میں وہی شخص استعمال نہیں کرے گا جو خیانت، تولیت اور وکالت جیسے فقہی احکام، اصول اور ابواب سے واقف ہوگا۔ بلاشبہ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ آپ کی فقاہت، جلالت شان، فقہی تبحر، طبیعت کی نفاست، مزاج کی پاکیزگی، اور تطہیر نفس پر روشن دلیل ہے۔

☆☆☆

حضرت آسی سرچشمۂ رشد و ہدایت

مولانا غلام انور قادری ☆

جن نامور سجادگان خانقاہ رشیدیہ نے سرزمین ہند پر علم وفن، صدق وصفا، تحسین اخلاق وکرداراور فضل وکمال کے گل لالہ اگائے اوراپنی شبانہ روزی کی محنت شاقہ سے اس کے حسن و جمال اور دل کشی میں چار چاند لگائے، ان میں ایک عبقری شخصیت حامل اسرار شریعت، واقف رموز طریقت حضرت شیخ محمد عبدالعلیم آسی رشیدی غازی پوری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بھی ہے۔

آپ خوش فکر سخن وراور فن شناس شاعر ہی نہیں بلکہ باکمال صوفی بھی تھے۔ آپ کے کلام سے کبھی افسردگی یا بے دلی پیدا نہیں ہوتی۔ آپ کا سوز وگداز دل میں ایک نئی تاب پیدا کردیتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری رقم طراز ہیں:

"آسی کے شعر کا یہی اثر ہوتا ہے کہ ہم خود اپنی واقعی یا امکانی حالت سے آگاہ ہوکر اس پر عبور پا جاتے ہیں۔ آسی اس منزل پر فائز تھے جہاں نہ محض صوفی پہنچ سکتا ہے نہ محض شاعر بلکہ صرف وہی شخص پہنچ سکتا ہے جو صوفی اور شاعر دونوں ہو اور جس نے تصوف اور شاعری کو ملا کر ایک آہنگ بنالیا ہو۔"(۱)

☆ دارالعلوم جائس، امیٹھی

لیکن آپ کی اصل بزرگی اور برگزیدگی یہ تھی کہ آپ خانقاہ رشیدیہ کے سجادہ نشیں اور ایک صاحب باطن مرشد تھے۔ آپ کا عہدہ اور منصب، دعوت و تبلیغ، رشد و ہدایت اور اصلاحِ فکر و عمل کا متقاضی تھا۔ آپ نے اپنے اخلاق و کردار، افعال و اقوال اور اشعار و افکار کے ذریعے اس تقاضے کو بحسن وخوبی پورا کیا۔ توحید و رسالت، دنیا و آخرت، عبادت و ریاضت، معاشرت و معیشت، امانت و دیانت، عاجزی و انکساری، ایثار و قربانی، اصلاح فکر و اعتقاد غرض کہ ہر موڑ پر آپ نے امت مسلمہ بالخصوص مریدین و متوسلین کی رہبری و رہنمائی کی۔ آپ کے اشعار و افکار اور افعال و اقوال اس بات پر شاہد عدل ہیں۔

توحید و رسالت

عقیدۂ توحید و رسالت ایمان کا ایک ایسا مضبوط ستون ہے جس پر پورے اعمال کی عمارت قائم ہے۔ اگر اس میں کسی طرح کا نقص پیدا ہوا تو اعمال کی عمارت ریت کی دیوار سے بھی زیادہ کمزور ثابت ہوگی۔ قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کے لیے جو عقائد اور تصورات پیش کیے ہیں، حضرت آسی نے ان کی ترویج و اشاعت کس طرح سے کی ہے۔ چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

قرآن کریم میں ہے:

''اور اللہ کے ساتھ دوسرے خدا کو نہ پکار، اس کے سوا کوئی خدا نہیں، ہر چیز فانی ہے سوا اس کی ذات کے۔'' (۲)

حضرت آسی اس آیت کے مفاہیم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

تیرے کوچے میں جسے ہو ہوس حور و قصور
کس جہنم میں اسے حرص و ہوس نے بھیجا
اک ہستی کے سوا کچھ بھی نہ جانا ہم نے
اے نکیرین پھر اور اس کے سوا کیا کہیے

فقدان علم کی وجہ سے بعض نے یہ نظریہ پیش کیا کہ خدا بہت سخت گیر ہے، جس سے بندوں کو بہت ڈرنا چاہیے۔ اگر کسی سے کوئی غلطی ہوگئی تو معافی کی گنجائش نہیں۔ اس نظریہ میں برائی یہ ہے کہ بندے سے ایک بار گناہ ہو جائے تو سمجھتا ہے کہ اب چاہے نیک کام کروں یا برا، انجام تو

براہی ہونے والا ہے۔ لہٰذا جی کھول کر کے عیش کرو اور مزے لیا کرو۔ اور کسی نے یہ تصور پیش کیا کہ اللہ تعالیٰ کے عشق و پیار اس کی رحمت کا پورا بھروسہ دلاتا ہے۔ اگر کوئی گناہ بھی ہو جائے تو وہ کوئی سزا نہ دے گا بلکہ اپنے فضل سے ہمیں معاف کر دے گا۔ اس نظریہ میں یہ کمی ہے کہ انسان بے خوف ہو کر غلطیاں کر گزرتا ہے اور معافی تک مانگنے کی فکر نہیں کرتا۔ لیکن اسلام نے جو تصور پیش کیا۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی متعدد صفات بیان کی گئیں جہاں اللہ تعالیٰ کو قرآن کریم میں الرحمن ،الرحیم ،الولی ،العفو جیسے ناموں سے پکارا گیا ، وہیں البصیر ،السمیع ، الجبار ،القھار سے بھی مخاطب کیا گیا۔ اسلامی نظریے سے یہ تصویر ابھرتی ہے کہ خدائے تعالیٰ رحم کرنے والا ، محبت کرنے والا ، بندوں کو دوست رکھنے والا ، بہت معاف کرنے والا ہے اور اسی کے ساتھ دیکھنے سننے والا اور جبار و قہار بھی ہے۔ اطمینان بھی دلایا گیا اور ڈر بھی پیدا کیا گیا یعنی اسلام کا نظریہ بہت ہی معتدل ہے۔ اسی معتدل نظریے کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کراتے ہوئے حضرت آسی نے اللہ تعالیٰ کی رحمت بیکراں کا ذکر کیا ہے۔

غلط ہے حکم جہنم کسے ہوا ہوگا
کہ مجھ سے بڑھ کے تو کوئی گنہ گار نہ تھا

اور جب قہر و غضب کو بیان کیا تو یوں بیان کیا ہے۔

نہ گرے اس نگاہ سے کوئی
اور افتاد کیا مصیبت کیا

توحید کے بعد رسالت کو سب سے اہم مقام حاصل ہے، بندے کو توحید کی معرفت اور اس تک رسائی بھی بالواسطہ رسالت ہی سے ہوتی ہے بلکہ اطاعت رسول اطاعت الٰہی میں ہے۔

کلام پاک میں ہے "من یطع الرسول فقد اطاع الله." (۳)

حضرت آسی نے اس کی اہمیت واضح کی اور فرمایا۔

عشق باز جو شد شد ہر دوسرا تک پہنچا
وہ خدا تک وہ خدا تک پہنچا

موجودہ ترقی یافتہ اور سائنسی دور میں بھی یہ بات بلاتردید کہی جاسکتی ہے کہ کائنات اپنی

تمام وسعتوں کے باوجود محدود ہے اور حضور سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فضائل وکمالات اعداد وشمار سے باہر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ''انا اعطیناک الکوثر'' اور ''و کان فضل اللہ علیک عظیما'' کے تمغے سے نوازا ہے۔ حضرت آسی نے لوگوں کے ذہن ودماغ میں یہی بات ثابت کی کہ زبان وعلم کمالات نبوی کو کما حقہ بیان کرنے سے قاصر اور حقیقی خدوخال پیش کرنے سے عاجز ہیں۔

تمہارے حسن کی تصویر کوئی کیا کھینچے
نظر ٹھہرتی نہیں عارض منور پر

جو کچھ بھی بیان ہوتا ہے، وہ ان کی عظمتوں اور رفعتوں کی محض ایک مختصر جھلک ہے اور عشاق بھی انہیں اپنے قلوب کی نورانیت میں اضافہ کرنے کے لیے بیان کرتے ہیں۔

آیئے ہم بھی حضرت آسی کے اشعار سے اپنے دلوں کی نورانیت کو دوچند کریں۔

قصر دل میں جب کسی دن آپ کا آنا ہوا
یہ ہوئی رفعت کہ بام عرش تہ خانہ ہوا
تو محو گلبن وگلزار ہو گیا آسی
تیری نظر میں جمال خیال یار نہ تھا
ان کے رخساروں سے کہتا ہے چراغ خورشید
صورت شمع کریم سحر ہم کو بجھاتے کیوں ہو

آخرت ومابعد الموت

ایمان اور اعمال صالحہ کا مقصود اصلی یہی ہے کہ آخرت کی کامرانی اور فلاح حاصل ہو۔ قرآن مجید نے عقیدۂ آخرت کو بنیادی اہمیت کی چیز قرار دیا ہے اور اس کا ذکر بڑی شدومد کے ساتھ کیا ہے، کیوں کہ کفار اور منکرین قیامت کہا کرتے تھے:

''کیا ہم ہڈی اور چور چور ہو جائیں گے کیا ہم از سر نو دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔''

قرآن کریم نے ان کے فاسد عقیدے کو باطل قرار دیتے ہوئے عقیدۂ آخرت کو ثابت کیا۔ کہیں کہا گیا ''اصل زندگی عالم آخرت ہے۔'' اور کہیں فرمایا ''اے منکرو! تم دنیوی زندگی کو مقدم

رکھتے ہو، حالاں کہ آخرت دنیا سے بدر جہا بہتر اور پائیدار ہے۔''

حضرت آسی نے قرآن مجید کے اس پیغام کو اپنی بھر علمی و روحانی قوت کے ساتھ نہایت ٹھوس انداز میں لوگوں تک پہنچایا۔ فانی دنیا سے آگاہ و خبر دار کیا اور خدارخی اور آخرت رخی کی ترغیب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا

کار امروز بہ فردا مگذار اے آسی
آج ہی چاہیے اندیشۂ فردا دل میں
انجام کی منزل ہے کڑی دیکھیے کیا ہو
دنیا میں جو آئے یہ آغاز سفر ہے
لحد کو کھول کے دیکھو تو اب کفن بھی نہیں
کوئی لباس نہ تھا جو کہ مستعار نہ تھا

مجاہدہ وتزکیۂ نفس

ارباب طریقت کا اس پر اتفاق ہے کہ نفس درحقیقت تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''بے شک نفس تو برائی کا بڑا حکم دینے والا ہے۔''[۴]

اسی لیے مجاہدہ وتزکیۂ نفس کی بڑی اہمیت ہے، بلکہ تمام عبادتوں کی جڑ اور فلاح وکامرانی کی اصل ہے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد بھی۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے: ''بے شک وہ کامیاب ہوا جس نے نفس کو ستھرا کیا۔''[۵] ''اور نفس کو خواہش سے روکا تو بے شک جنت ہی ٹھکانہ ہے نفس کا''[۶]

حضرت آسی نے مجاہدۂ نفس کے رموز واسرار اور طریقوں کو مثلاً توبہ واستغفار، ذکر وفکر اور صبر وتوکل کی طرف دعوت دی اور فرمایا

سلوک راہ وفا میں فنا کے طور ہیں اور
جو آپ مار کے تیشہ مرا تو جھک مارا
صلاحیت بھی تو پیدا کر اے دل مضطر
پڑا ہے نقش کف پائے یار پتھر پر

اس کے بعد حضرت آسی نے مجاہدۂ نفس کا ثمرہ اور نتیجہ بھی لوگوں کے سامنے رکھ دیا کہ

انسان نفس کے ساتھ جہاد کرتے کرتے اللہ تعالیٰ کا اتنا مقرب ہوجاتا ہے کہ خدائے تعالیٰ اس کا ہاتھ ہوجاتا ہے جس سے وہ پکڑتا ہے، کان ہوجاتا ہے جس سے وہ سنتا ہے، آنکھ ہوجاتا ہے جس سے وہ دیکھتا ہے، زبان ہوجاتا ہے جس سے وہ بولتا ہے، جیسا کہ حدیث میں وارد ہے۔

حضرت آسی فرماتے ہیں:

کسی میں جو کوئی فنا ہوگیا
نہ کچھ پوچھ آسی وہ کیا ہوگیا
انا الحق بھلا قول منصور تھا
بتاؤ تو بندہ خدا ہوگیا

اطاعت وعبادت

قرآنی ارشاد "وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون" کے مطابق انسان کی پیدائش کا مقصد اللہ رب العزت کی اطاعت وعبادت ہے، اور اصل عبادت وہ ہے جس میں صرف تصور باری تعالیٰ ہو اور رضائے الٰہی مرکز نگاہ، نہ جنت کی خواہش ہو نہ جہنم کا خوف۔ ایسی ہی عبادت مومن کو اللہ تعالیٰ کا مقرب اور محبوب بنادیتی ہے۔ روایت ہے کہ:

"حضرت خواجہ ابراہیم علیہ الرحمہ سفر حج میں ہر قدم پر دوگانہ ادا کرتے ہوئے چودہ سال کے عرصے میں خانہ کعبہ پہنچے، دیکھا کہ کعبہ اپنی جگہ پر نہیں ہے۔ حیرت ہوئی، آواز آئی، صبر کر! "کعبہ ایک ضعیفہ کی زیارت کے لیے گیا ہوا ہے، ابھی آجائے گا" اور زیادہ حیرت ہوئی اور انہیں تلاش کرتے ہوئے جوں ہی جنگل پہنچے، دیکھا کہ کعبہ رابعہ بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گرد طواف کر رہا ہے۔ حضرت خواجہ نے آواز دی: "تونے یہ کیا شور برپا کر رکھا ہے"۔ حضرت رابعہ نے کہا: "میں نے یہ شور برپا نہیں کیا بلکہ تونے کیا ہے چودہ سال کے بعد خانہ کعبہ پہنچا ہے اور دیدار نصیب نہیں ہوا کیوں کہ تیری خواہش خانہ کعبہ کی زیارت تھی اور میری غرض خانہ کعبہ کے مالک سے تھی۔" (۸)

حضرت آسی نے اسی نکتے کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرائی اور بڑے حسین انداز میں کئی مقامات میں اس کو بیان کیا ہے۔

مانگوں جو میں بہشت تو دوزخ نصیب ہو
تیرے سوا ہو کچھ بھی اگر مدعائے دل

اصل فتنہ ہے قیامت میں بہار فردوس
جز تیرے کچھ بھی نہ چاہے مجھے وہ دل دینا
اور ہمت بلند کر اے شیخ
طمع و خوف کی عبادت کیا

عاجزی وانکساری

قلب وروح کو بیمار کرنے والی چیزوں میں حسد وکینہ، غیض وغضب اور تکبر ونخوت بھی ہے جو فرد وبشر ان میں سے کسی ایک کا شکار ہوگا وہ روحانی طور پر بیمار ہوگا۔ صوفیۂ کرام نے ان بیماریوں کو ختم کرنے کے لیے عاجزی وانکساری اور تواضع وخاکساری کی دوا اختیار کی ہے۔ ان ادویہ کے ذریعے روح کو تازگی اور قلب کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے اور صفات مذمومہ کافور ہوجاتی ہیں اور ان کی جگہ صفات حسنہ لے لیتی ہیں۔

حضرت آسی نے عجز وانکساری کی تبلیغ واشاعت اس طرح کی ہے:

عاقبت میں وہ نہیں جن کے فلک پر ہیں دماغ
خاک میں ملنے کو دنیا میں خدا نے بھیجا
کہیں اکسیر سے بڑھ کر ہے دولت خاکساری کی
جہاد نفس کا شاید یہی مال غنیمت ہو
خاکساری سبب آبروئے مسالک ہے
جو ملا خاک میں آنسو در نایاب ہوا

صحبت بزرگان

صحبت کی تاثیر کا ہر فرد قائل ہے، اس کی تاثیر سے انکار کی گنجائش نہیں۔

صحبت صالح ترا صالح کند
صحبت طالع ترا طالع کند

یہ صحبت ہی کی تاثیر تھی کہ اصحاب کہف کے کتے کو عظمت ورفعت ملی، یہ صحبت ہی کی کارفرمائی ہے کہ آقائے دو عالم ﷺ کی ایک ساعت کی صحبت نے صحابۂ کرام کو صحابیت کے اس عظیم مقام پر

فائز کر دیا جہاں بڑا سے بڑا ولی بھی رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ:

''جو کسی عالم کی صحبت میں بیٹھا وہ میری صحبت میں بیٹھا'' او کما قال۔

حضرت آسی اس راز سے بخوبی واقف تھے کہ صحبت صالح فلاح و کامرانی کی ضامن ہے، اپنے اشعار میں لوگوں کی ہدایت کے لیے اس راز کو واضح بھی کر دیا، فرماتے ہیں:

جو دانا ہے تو دیوانوں کے قدموں سے تو لپٹا رہ
مسلسل یہ صدا دیتا ہے ہر زنجیر کا دانا
راہ حق کی ہے اگر آسی تلاش
خاکِ رہ ہو مرد حق آگاہ کی
جھومتا جاتا ہے آسی حشر میں
عاشقان سرور عالم کے ساتھ

کسب مال و معیشت

دستور حیات میں نظام معیشت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اسی بنا پر متعدد آیات کریمہ میں کسب معاش کی ترغیب دی گئی ہے کہ ''تم پر کوئی گناہ نہیں کہ معاش تلاش کرو'' ۹، تو زمین میں جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو'' (۱۰)

قرآن پاک نے نظام معاش میں حلال و حرام کا معیار بھی قائم کیا جس کی بنیاد قوم و معاشرے کے مفاد پر ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

''اے ایمان والو آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ مگر یہ کہ کوئی سودا تمہاری باہمی رضامندی کا ہو۔'' (۱۱) ''اے ایمان والو سود دونا دونی نہ کھاؤ'' ۱۲

حضرت آسی نے قرآن کے پیش کیے ہوئے اس دستور حیات کو کیا خوب عام کیا ہے۔

مقدر میں ہو یوں سب کچھ مگر تدبیر لازم ہے
کہ ایک قطرہ نہیں ملتا ہے بے تدبیر پانی کا
مزا کیا جب کہ دانے کے لیے ہو آبرو ریزی
ہمیشہ مجھ کو دینا اے خدا توقیر کا دانا

ایثار و قربانی

ایثار کا مفہوم ہے دوسرے کے مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح دینا یا دوسرے کو نفع پہنچانا۔

آج مسلمانوں کے جسموں سے ایثار کی روح نکل چکی ہے، حتیٰ کہ اس لفظ سے بھی اکثریت نا آشنا ہے۔ حضرت آسی نے اسلام کے درس ایثار کا اعادہ و تکرار اپنے اعمال و گفتار کے ذریعے بارہا کیا ہے۔

شہود الحق حضرت شیخ سید شاہد علی سبز پوش گورکھپوری فرماتے ہیں:

"چاہے کوئی کیسا ہی مصیبت زدہ اور مغموم ہوتا، حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے ہی کل رنج و غم بھول جاتا۔ ہر ادنیٰ و اعلیٰ پر ایسی شفقت تھی کہ ہر ایک کا دعویٰ ہوتا کہ مجھے زیادہ چاہتے ہیں۔ جو جتنا گنہ گار ہوتا اس پر اتنا ہی زیادہ رحمت کا جوش ہوتا۔ حضرت کی خدمت سے میں نے کسی صاحب غرض کو محروم جاتے نہیں دیکھا۔ بشرطیکہ حضرت کے قول پر اس نے عمل کیا ہو۔" (۱۳)

امانت و دیانت

امانت جس طرح کی بھی ہو، شریعت نے ہر حال میں اسے ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے: "بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں جنکی ہیں انہیں سپرد کرو۔ (۱۴)

اسلام نے امانت اور اس کی ادائیگی کو کس قدر اہمیت دی ہے۔ شب ہجرت حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اہتمام اور طرز عمل سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

امانت صرف اس کا نام نہیں کہ ایک شخص کے پاس دوسرے کا مال بطور امانت رکھا ہو اور وہ اس کو ادا کر دے بلکہ امانت کا مفہوم اس سے وسیع تر ہے اور اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً کسی مجلس میں کسی سے متعلق کوئی بات چل رہی ہو، جس کو آپ نے سن لیا تو اس مجلس کی تمام باتیں امانت ہیں بغیر اجازت دوسروں تک پہنچانا سراسر خیانت ہے۔ کوئی کسی کے پاس ملازم ہے۔ بغیر اجازت کچھ وقت چرا لینا، کام میں چوری کرنا، دیر سے آنا، وقت سے پہلے جانا، اپنی صلاحیت کا صحیح استعمال نہ کرنا، سب امانت کے خلاف یعنی خیانت ہے۔ سرکار آسی نے اپنے اعمال و افعال، رفتار و گفتار سے امانت اور اس کے وسیع مفہوم کو لوگوں پر واضح کیا۔ خود عمل کیا اور لوگوں کو اس پر عمل کرنے کی طرف راغب بھی کیا۔

خانقاہ رشیدیہ کے موجودہ سجادہ نشیں شیخ طریقت حضرت مفتی عبید الرحمٰن رشیدی دامت برکاتہم العالیہ کو راقم الحروف نے منڈواڈیہہ میں ایک مجلس میں یہ فرماتے ہوئے سنا کہ:

"حضرت آسی علیہ الرحمہ خانقاہ کی تمام آمدنی واخراجات کا مکمل حساب رکھتے ہوئے پوری دلجمعی وایمان داری سے خانقاہی امور کو انجام دیتے، پورے دور سجادگی میں ایک آنہ اور ایک پائی بھی حساب میں فرق نہ آیا۔ ان تمام کے باوجود خانقاہ کی طرف سے جو تنخواہ مقرر تھی وہ یا تو نہیں لیتے تھے یا پھر اقل قلیل۔"

ردفرق باطلہ وضالہ

باطل عقائد ونظریات کی تردید ایک اہم دینی فریضہ ہے، کسی عالم یا کسی شیخ طریقت کو اس سے مفر نہیں۔ سرکار آسی نے اس میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے، وہ نہ صرف زریں لفظوں میں لکھے جانے کے قابل ہیں بلکہ ہمارے لیے نمونۂ عمل بھی ہیں۔

جب ناموس رسالت پر حملے ہو رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا، رسول بڑے بھائی کی طرح ہیں، کہیں سے آواز آ رہی تھی کہ نعوذ باللہ رسول کا علم ملک الموت وشیطان ابلیس سے کم ہے۔ کوئی رسول کے علم کو بچے اور مجنوں کی طرح بتا کر علم غیب مصطفیٰ کا انکار کر رہا تھا۔ کوئی رسول کی عزت وعظمت کی تنقیص کر رہا تھا۔ ایسے پر فتن دور میں آپ ناموس رسول کے تقدس اور تحفظ اسلام وسنیت کی حفاظت وصیانت کے لیے سینہ سپر ہو گئے۔ آپ نے امت مسلمہ کو آگاہ کیا کہ رسول علیہ السلام کی شان ملک الموت کی شان سے مرجوح اور کم نہیں ہے، بلکہ اتنی اعلیٰ وارفع ہے کہ خدائے تعالیٰ کے مظہر اتم ہیں اور رسول کی عزت وعظمت بیان کرتے ہوئے وہ شعر ارشاد فرمایا جس کی جامعیت ووسعت کو دیکھ کر آج بھی اہل علم وعقل ورطۂ حیرت میں ہیں ؎

وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہو کر
اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

حضرت آسی کو اندازہ تھا کہ بعض کو اس شعر پر شبہ ہو سکتا ہے، لہٰذا قبل از وقت اس کا ازالہ کرتے ہوئے اس کے مفہوم کو واضح کیا کہ:

"مدینہ میں اترنا باعتبار نزول صفات کے ہے جیسے آفتاب آئینہ میں اترتا ہے۔ (۱۵)

تقریباً اسی طرح کی تعریف محقق علی الاطلاق شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے بھی منقول ہے۔

حضرت شیخ محقق فرماتے ہیں:

''ایک بڑے آئینے میں طرح طرح کی مرصع کاری کی گئی ہو، اس کا ہر گوشہ نقش ونگار سے جڑا ہوا ہو اور اس بڑے آئینے کے مقابل ایک سادہ آئینہ رکھا جائے تو جس قدر نقش ونگار بڑے آئینے میں ہوں گے، ان سب کا عکس سادہ آئینے میں بھی اتر آئے گا۔ اسی طرح آئینۂ الوہیت کے مقابل آئینہ نبوت ہے، اس کا حسن وجمال اس آئینے میں نظر آرہا ہے۔'' (۱۶)

آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم منصب شفاعت کبریٰ پر فائز ہیں۔ محشر میں گنہ گاروں کی شفاعت کریں گے۔ اہل باطل نے جب اس پر سوال اٹھایا اور اس کا انکار کیا تو اس موقع پر بھی آپ نے قوم کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ عقیدۂ شفاعت کی حقانیت واضح کی اور لوگوں کے دلوں میں اس کا یقین پیدا کرتے ہوئے فرمایا:

گنہ گار ہوں میں واعظو تمہیں کیا فکر　　میرا معاملہ چھوڑو شفیع محشر پر
حشر میں بیٹھیں گے زیر قدم پاک نبی　　بے ٹھکانے کہیں ہوتے ہیں ٹھکانے والے

حدیث شریف میں ہے: ''یا ابابکر لم یعرفنی حقیقۃ غیر ربی''
(اے ابوبکر! میری حقیقت کو میرے رب کے سوا کسی نے نہیں جانا)

حضرت آسی نے مذکورہ حدیث پر فلاسفہ ومناطقہ کے امکانی اعتراض کا جواب بھی دیا کہ مناطقہ حقیقت انسانی کو دریافت کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کی حقیقت حیوان ناطق ہے اور رسول بھی نوع انسانی سے ہیں تو ان کی حقیقت بھی حیوان ناطق ہوئی۔ لہٰذا حدیث کا مفہوم کیسے درست ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ حقیقت محمدی کو کوئی نہیں جانتا۔ آپ نے جو جواب دیا، اس سے نہ صرف حدیث کی حقانیت برقرار رہی بلکہ امت مسلمہ کا اس پر یقین اور مستحکم ہوگیا۔

آپ فرماتے ہیں کہ یہ دعویٰ اگر تسلیم بھی کرلیا جائے کہ فلاسفہ حقیقت انسان کو جانتے ہیں تو اس انسان کی حقیقت کو بھی جانتے ہیں جو خاکی ہے خاک سے پیدا ہوا ہے اور ہمارے رسول اکرم ﷺ تو نوری ہیں اور آپ نور سے پیدا ہوئے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''قد جاء کم من اللہ نور'' (۱۷)۔ بھلا رسول کی حقیقت کیسے جان سکتے ہیں، فرماتے ہیں:

اے نور خدا کیا تیری اعلیٰ نسبی ہے اللہ سے ملتی ہے تیری اصل مکرم
کھینچے کوئی تصویر تیری بوالعجبی ہے کھینچ نہ سکے دوسرے نقاش ازل سے

وہابیت ہو یا دیو بندیت، قادیانیت ہو یا نیچریت ہر ایک کے مکر و فریب سے امت مسلمہ کو آپ نے بچایا اور ایسے مدلل و مبرہن طریقے سے ان کی گمرہی و ضلالت کا پردہ چاک کیا کہ ہر منصف مزاج اور عقل سلیم رکھنے والا شخص نہ صرف ان گمرہ گروں کے دام فریب سے نکل آیا بلکہ نور حق سے اس کا دل روشن و تابناک ہو گیا۔

حضرت شہود الحق گورکھ پوری خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں:

''میں ۱۹۰۹ء میں جب حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو میرے خیالات کچھ وہابیت اور نیچریت لیے ہوئے تھے جو خیال دل میں آتا تھا۔ دوسروں پر رکھ کر اس کا جواب فوراً دے دیتے تھے۔ جب تک میرے عقائد بالکل درست نہ ہو لیے۔ اس وقت تک میرے ہر خطرے کا جواب فوراً ملتا رہا۔ اخیر میں اکثر یہ خطرات آئے کہ حضرت پر خطرات مکشوف ہوتے ہیں جب جواب ملتا ہے یا حضرت کی تقریر ہی اتنی جامع ہوتی ہے کہ سب کے خیالات کے جواب ہو جاتے ہیں۔'' ۱۸

یہ حضرت سرکار آسی کے رشد و ہدایت، تربیت و تزکیہ اور رہبری و رہنمائی کے محض چند نمونے ہیں ورنہ تو آپ نے ہر گوشوں اور ہر جہتوں سے اصلاح وارشاد کا فریضہ انجام دیا ہے۔

حوالے

(۱) عین المعارف، ص: ۸ (۲) سورۂ قصص، آیت: ۸۸ (۳) سورۂ نسا (۴) سورۂ یوسف، آیت ۵۲ (۵) سورۂ الشمس (۶) سورہ النازعات، آیت: ۴۰ (۷) سورۂ الذاریات (۸) انیس الارواح، ص: ۱۶ (۹) سورۂ بقرہ، آیت: ۱۹۸ (۱۰) آیت: ۱۰ (۱۱) نساء، آیت: ۲۹ (۱۲) آل عمران، آیت: ۱۳۰ (۱۳) عین المعارف، ص: ۶۰ (۱۴) نساء، آیت: ۵۸ (۱۵) عین المعارف، ص: ۵۸ (۱۶) خطبات نظامی، ص: ۶۷ (۱۷) المائدہ، آیت: ۶۰ (۱۸) عین المعارف ص ۶۰

☆☆☆

حضرت آسی: جامع اوصاف وکمالات

مولانا محمد الیاس عالم مصباحی☆

اس دنیائے فانی میں ایسی کتنی بے شمار ہستیاں صفحۂ ہستی پر نمودار ہوئیں اور دینی و مذہبی اور علمی وفکری قابل قدر خدمات انجام دے کر پردۂ عدم میں روپوش ہوگئیں۔

انہیں اہم اور عظیم ہستیوں میں شیخ طریقت، راز دار شریعت، غواص بحر معرفت، داعی رشد وہدایت، منبع کشف وکرامت، نور چشم بصیرت، بہار رشیدیت، قادر الکلام، صاحب دیوان، بحر الاسرار، قاسم الانوار، قطب العرفا والعشاق، عارف باللہ حضرت علامہ الشاہ محمد عبد العلیم آسی معینی رشیدی سکندر پوری ثم غازی پوری قدس سرہ کے نام نامی اسم گرامی بھی نمایاں ہے۔ جن کے افعال واقوال، کردار واعمال، اذکار واشغال، ارشاد واحوال اور پند ونصائح ہمارے لیے مشعل راہ اور باعث تقلید ہیں۔ آپ نے نصف صدی تک اسلام وسنیت کی حفاظت وپاسبانی کا بحسن وخوبی فریضہ انجام دیا۔ شہرت ونا موری کو ترک کر کے خلوت وتنہائی اختیار کی۔ سلسلۂ رشیدیہ کو اپنے حسن کردار وعمل سے اوج ثریا تک پہنچایا اور قصبہ سکندر کو ’’زلف صحرا‘‘ سے تعبیر کر کے اس کے مقام بلند تک پہنچادیا۔ ولایت وبزرگی اور درویشی کو چھپا کر اسلام وایمان کی شمع فروزاں

☆استاد دار العلوم سرکار آسی، سکندر پور، بلیا، یوپی

کی۔ جب وہ دنیا کی نظروں کے سامنے تھے یہی درس دیتے رہے اور جب نگاہوں سے دور جانے لگے تو یہی پیغام دیتے ہوئے اوجھل ہو گئے۔

آسی شہید عشق ہوں مردہ نہ جانیو
مر کر ملی ہے زندگی جاوداں مجھے

خاندانی ونانیہالی فضل وکمال

حضرت آسی کا خاندان اور نانیہال بہت ہی ارفع واعلیٰ اور نہایت فضل وکمال والا ہے۔ چوں کہ آپ جس خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس خاندان ونانیہال کے سارے افراد صاحب فضل وکمال تھے۔ چناں چہ عین المعارف [ص:۳۸] میں ہے۔

''آپ کی والدہ ماجدہ قاضی پور ضلع آرہ کی تھیں، جو حضرت مفتی احسان علی صاحب قدس سرہ کی پوتی تھیں۔ حضرت مفتی احسان علی صاحب قدس سرہ حضرت شاہ غلام حیدر صاحب بلیاوی قدس سرہ کے اجل خلفا میں تھے۔ بارہ سال کی عمر سے تا وفات مفتی صاحب قدس سرہ کی نماز تہجد کبھی قضا نہیں ہوتی تھی۔ مفتی صاحب کی اہلیہ صاحبہ کو حضرت خاتون جنت رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حضوری اس طرح حاصل رہتی تھی کہ ادنیٰ ادنیٰ سی بات میں بغیر خاتون جنت سے دریافت کیے ہوئے کوئی کام نہیں کرتی تھیں۔ کسی نے کوئی بات پوچھی۔ آپ نے فرمایا کہ حضرت بی بی سے دریافت کرلوں تو جواب دوں۔ آنکھیں بند کرتیں اور فوراً پوچھ کے جواب دے دیتیں۔''

اللہ اکبر! ایک طرف حضرت آسی کے پرنانا حضرت مفتی احسان علی آروی کا یہ عالم تھا کہ نوعمری ہی سے ''نماز تہجد'' کی پابندی فرما رہے تھے اور تا وفات ''نماز تہجد'' قضا نہ ہونے دیا۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ آپ کے پرنانا کس شان وعظمت کے مالک تھے اور دوسری طرف آپ کی پرنانی صاحبہ کی رفعت وبلندی، شرف وبزرگی اور فضل وکمال بے مثال نظر آتا ہے کہ آپ کو سیدہ، زاہدہ، طیبہ، طاہرہ خاتون جنت حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کس قدر قربت حاصل تھی کہ ان سے پوچھے بغیر کوئی کام نہیں کرتی تھیں۔

حضرت آسی فرماتے ہیں کہ:

''میرے پیر ومرشد اور والد ماجد کے مراتب میں صرف اس قدر فرق تھا کہ والد ماجد سے

ایک راز وقت وصال فاش ہوا۔ اور پیرو مرشد وقت وصال بھی ضبط کر لے گئے۔''

[عین المعارف، ص: ۳۸]

یہ ہے حضرت آسی کے والد بزرگوار کی عظمت وفضیلت جن کی حیات طیبہ عشق رسول پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام میں سرشار رہتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وقت وصال نبی اکرم ﷺ اپنے سچے عاشق کو اپنے ہمراہ لے جانے کے لیے جلوہ فگن ہوئے۔ آپ نے فرماتے ہیں:

''حضرت سید الکونین علیہ السلام مع کل صحابہ اور سید الشہدا اور جملہ پیرانِ کرام کے مجھ کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تشریف لائے ہیں۔ اب میں ان لوگوں کے ساتھ جاتا ہوں، سب سے رخصت ہوئے، کلمہ طیبہ پڑھا اور روح پرواز کر گئی۔ چہرۂ مبارک کے سامنے دیوار پر سفید دائرہ روشنی کا اندھیری رات میں اس طرح سے نمودار تھا کہ جیسے آفتاب کا عکس پڑتا ہو، جب صبح ہوئی اور روشنی بڑھتی گئی تو وہ عکس گھٹتا گیا۔ [عین المعارف، ص: ۳۸]

حضرت آسی بلا کی ذہانت وفطانت اور خداداد صلاحیت کے مالک تھے۔ ابتدائی کتابیں تو محض دوسروں کو پڑھتے ہوئے سن کر ہی یاد کر لی تھیں۔ آپ فرماتے تھے کہ میں نے کوئی کتاب نصف صفحہ اور ایک صفحہ سے زیادہ استاد سے نہیں پڑھی۔ نصف سطر یا ایک سطر کا مطالعہ فرمایا کرتے تھے۔ اس میں رات کی رات گزر جاتی تھی۔ درسیات کی تکمیل فرنگی محل کے مشہور علامہ حضرت مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی سے کی تھی۔

حضرت آسی کی علمی ذہانت وفطانت اور تعلیمی ذوق وشوق کہ ''میر قطبی'' تک پہنچ کر ''ملا حسن'' چھوڑ کے ''ملا جلال'' پڑھنے والے طلبہ کے ساتھ سبق میں شریک ہو رہے ہیں۔ اور کما حقہ سمجھ کر پوری شرح وسط کے ساتھ استاد کے سامنے تقریر بھی فرما رہے ہیں اور پھر کیوں نہ ہو کہ آپ کو قدرت نے ابتدا ہی سے اپنی نعمت عظمیٰ، فضل وکمال اور کشف وکرامت سے نوازا تھا۔ آپ کی ذکاوت کی وجہ سے تمام اساتذہ بے حد خوش تھے اور دلوں کی اتھاہ گہرائیوں سے دعائیں دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے ساتھ پڑھنے والے طلبہ بھی فخر کرتے تھے اور بڑے بڑے منتہی طلبہ آپ سے شوقیہ پڑھتے تھے۔

آپ کے فضل وکمال میں سے یہ بھی ہے کہ مطالعہ کے وقت نئے نئے اعتراضات

وجوابات پیدا کر کے انہیں ترتیب دیتے تھے۔ تب شروح وحواشی پر نظر ڈالتے تھے۔ وہی سوال وجواب موجود پاتے اور بے انتہا خوش ہوتے تھے اور اگر کبھی ڈوب کر اعتراض کرتے تھے تو استاذ کو جواب دینے میں کئی دن لگ جاتے تھے اور تشفی بخش جواب بھی نہیں ہو پاتا تھا۔

آپ فرماتے تھے کہ:

''جب میں شرح مسلّم' پڑھتا تھا تو مطالعہ میں 'ملا بحر العلوم' کا حاشیہ نہیں دیکھتا تھا۔ مطالعہ کے بعد حاشیہ دیکھتا تو اکثر یہی ہوتا تھا کہ ''ملا بحر العلوم'' سے زیادہ اعتراضات وجوابات دیتا۔ اگر کبھی ایسا ہوتا کہ میں نے اعتراض کرنے تو پیدا کر لیا اور جواب نہ دے سکا اور ''ملا بحر العلوم'' کا جواب حاشیہ میں موجود ہوتا تو جب تک ان کے جواب کو رد نہ کر لیتا کھانا نہ کھاتا۔'' [عین المعارف۔ص:۶۰]

قوت حافظہ

پروردگار عالم جل وعلا نے آپ کو غضب کی قوت حافظہ عطا فرمایا تھا اور ایسی قوت فکریہ سے نوازا تھا کہ کوئی کتاب ایک مرتبہ پڑھ لیتے تو بالکل عقل میں محفوظ و مستحضر ہو جاتی تھی۔ عین المعارف میں ہے:

''حضرت کی قوت حافظ کا یہ عالم تھا کہ جو کتاب ایک مرتبہ پڑھ جاتے حفظ ہو جاتی تھی۔ اس بڑھاپے میں وصال سے قبل جب اکثر اوقات استغراق کا غلبہ رہتا تھا جب بھی بعض اوقات اپنے بچپن کے حالات اور واقعات اس طرح بیان کرتے کہ سب باتیں پیش نظر معلوم ہوتیں۔''

[عین المعارف، ص:۴۱]

طبابت

آپ کے فضل وکمال میں سے یہ بھی ہے کہ آپ فن ''طبابت'' میں یکتائے روزگار تھے، دور دور تک نہ آپ کا کوئی ہمسر اور نہ ہی کوئی برابر نظر آرہا تھا۔ چوں کہ یہ ایک ایسا فن ہے جو بغیر استاد اور بغیر محنت ومشقت کے حاصل ہونا ناممکن امر ہے۔ مگر حضرت آسی یقیناً فضائل وکمالات کے آئینہ دار تھے کہ بغیر استاد کے صرف طب کی کتابیں مطالعہ کر کے فن طب کے ماہر استاد اور ماہر طبیب بن گئے جیسا کہ سمات الاخیار میں ہے کہ:

''آپ نے طب کا ایک حرف بھی کسی سے نہیں پڑھا اور نہ کسی مطب میں ایک دن بھی

بیٹھے۔ طب کی کتابیں دیکھ بھال کر استعداد بہم پہنچائی اور نہایت دھڑلے سے مطب کرنے لگے۔ تشخیص ایسی اعلیٰ درجہ کی تھی کہ کبھی رائے کا خطا کرنا یا دواؤں کا مضر ہونا سنا نہیں گیا۔ قلم سے جو نسخہ نکلتا تھا تیر بہدف ہوتا تھا'' [سمات الاخیار: ۱۷۶]

شہود الحق شاہ شاہد علی سبز پوش گورکھپوری فرماتے ہیں:

''حکیم محمد اسحاق کا جو مجرب نسخہ نکلتا تھا۔ وہ اس کی نقل حضرت کے پاس بھیج دیا کرتے تھے اور حضرت کا جو نسخہ نکلتا تھا، وہ حکیم صاحب کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔ حکیم صاحب سے جب کوئی کہتا تھا کہ حضرت آسی نے نہ تو کسی سے طب پڑھی، نہ کسی کے مطب میں بیٹھے اور شفا کا یہ حال ہے کہ جو مریض ان کے ہاتھ میں آیا وہ آناً فاناً صحت یاب ہوا۔ تو وہ فرماتے کہ ''ارسطو اور بو علی سینا کو کس نے طب پڑھائی تھی؟ یہ ان دماغ کے لوگوں میں ہیں جو طب ایجاد کریں۔ ان کو استاد کی کیا ضرورت ہے؟'' حضرت کا قول تھا کہ جس نے علوم عربیہ پڑھے اور اس قابل نہ ہوا کہ دوسروں کو طب پڑھا سکے تو اس نے خاک نہیں پڑھا۔ [عین المعارف، ص: ۴۷]

حسن اخلاق

حضرت آسی عظیم اخلاق کے مالک تھے۔ ہر ایک کے ساتھ خندہ پیشانی سے ملتے تھے اور حاجت مندوں کی حاجت روائی فرماتے اور دردمندوں کی تکلیفیں دور فرما دیتے تھے۔ چناں چہ سمات الاخیار میں ہے:

''غربا اور مساکین کی امداد اور خبر گیری سب پر مقدم رکھتے تھے۔ عجز و انکسار زیادہ تھا۔ ایثار نفسی مزاج میں بہت تھا۔ غیبت اور شکایت سے نفرت تھی۔ غصہ نام کو نہ تھا۔ بذلہ سنجی اور خوش طبعی بہت تھی۔ چھوٹے بڑے، امیر غریب، مرید و غیر مرید کے ساتھ یکساں محبت سے پیش آتے تھے اور ملاقات کے وقت نام بنام ان کے بچوں کی خیریت اور حالت استفسار فرماتے، کسی ملنے والے کو یہ پتہ نہیں چلا کہ آپ مجھ سے زیادہ کسی کو چاہتے ہیں۔ اخلاق محمدی سے آراستہ تھے۔ ہر کس و ناکس آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کو ذریعۂ سعادت سمجھتا تھا اور سب کے دل میں آپ کی محبت اور وقعت اسی قدر تھی جتنی کسی مرید کے دل میں۔ یہ آپ کے اخلاق کا فیض تھا! جس نے دوست و دشمن سب کو مسخر کر لیا تھا اور کوئی دائرہ اطاعت سے باہر نہ تھا

اخلاق سب سے کرنا تسخیر ہے تو یہ ہے
خاک آپ کو سمجھنا اکسیر ہے تو یہ ہے

[سمات الاخیار:۱۷۶]

اور عین المعارف میں ہے:

''حضرت کا خلق ''انک لعلیٰ خلق عظیم'' کا مجسم مظہر تھا۔ چاہے کوئی کیسا ہی مصیبت زدہ اور مغموم ہوتا۔ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے ہی صورت مبارک دیکھ کر کل رنج وغم بھول جاتا۔ ہر ادنیٰ واعلیٰ پر ایسی شفقت تھی کہ ہر شخص کو یہی دعویٰ تھا کہ مجھ ہی کو سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔ حضرت کی خدمت میں رہ کر لڑکے، بالے، ماں، باپ، گھر بار سب بھول جاتا اور جو جتنا ہی زیادہ گنہ گار ہوتا تھا اس پر اتنا ہی زیادہ رحمت کا جوش ہوتا تھا''۔

[عین المعارف:۵۹]

غلبۂ چشتیت و بشارت

حضرت آسی کی رحلت سے تقریباً ۵ رسال قبل آپ پر ''چشتیت'' کا غلبہ کافی ہو گیا تھا جس کی وجہ سے انہوں نے حضرت عطائے رسول خواجۂ خواجگاں سیدنا معین الدین چشتی اجمیری حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا رضی اللہ عنہما کی مدح سرائی میں شاہ عبدالسبحان غازی پوری کی معرفت ان کے مزاروں میں اشعار کہلوائے اور انہوں نے اپنے مراقبے میں ان اشعار کو ان کی بارگاہوں میں پیش کیے تو ان نفوس قدسیہ نے حضرت آسی کو مژدۂ جانفزا سنایا تھا کہ ''میں محمد عبدالعلیم کا ہوں اور محمد عبدالعلیم میرے ہیں'' اور ''محمد عبدالعلیم کو میرا اسلام کہنا اور کہنا کہ میرے سلسلہ کا رواج ان اطراف میں تمہاری ذات سے قائم ہے''۔ پھر ان جگہوں سے خطوط بھی موصول ہوئے تھے۔ جو بلاشبہ اولیا اللہ اور مشائخ وصوفیہ میں آپ کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

عشق رسول

جو مؤمن ہو اور اس کے نہاں خانۂ دل میں عشق رسالت کی شمع فروزاں نہ ہو، یہ ہو نہیں سکتا، کیوں کہ ایمان اور عشق رسالت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ عشق رسول ہر مؤمن کی حرز جاں ہے۔ گنج گراں مایہ اور دولت بے بہا ہے۔ پھر عارف باللہ حضرت آسی جیسے مؤمن صادق

کا دل اس وصف سے کیسے خالی رہ سکتا تھا۔ آپ کا دل عشق رسول پاک سے جل تھل تھا۔ دل کی زمین پر ہر دم عشق رسالت کی رم جھم بارش ہوتی رہتی تھی۔ آپ رسول پاک سے بے پناہ محبت رکھتے تھے اور علم و عمل دونوں کے ذریعے بارگاہ رسالت مآب میں عقیدت کے پھول نچھاور کرتے رہتے تھے۔ آپ کے عشق اور محبت رسول کی معراج پر ذیل کے اشعار بھرپور شاہد ہیں۔

دل عاشق میں قلق حد سے سوا ہوتا ہے ذکر محبوب بھی اندوہ فزا ہوتا ہے
انہیں کانوں سے انا الحق کے سنے ہیں دعوے آدمی عشق میں کیا جانیے کیا ہوتا ہے
مرتا ہوں میں جس پر وہ جوان عربی ہے مکی مدنی ہاشمی و مطلبی ہے
اے پائے نظر ہوش میں آ کوئے نبی ہے آنکھوں سے بھی چلنا تو یاں بے ادبی ہے
تو ادھر آئے تو عاشق تیرے اے نور نظر پتلی کی طرح ہیں آنکھوں میں بیٹھانے والے

مذکورہ اشعار اس بات کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ حضرت آسی کتنے زبردست عاشق رسول اور مداح نبی تھے کہ ان کا ہر شعر عشق رسول پاک سے لبریز ہے۔ وہ تو عشق کی بشارت لے کر آئے تھے اور ان کا پیغام یہ ہے کہ بے عشق زندگی بے کیف ہے، کیوں کہ عشق وہ ہے جس میں ''درد سر'' نہیں بلکہ ''درد دل'' اور ''درد جگر'' درکار ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں

عشق میں اے کوہ کن کیا زخم سر درکار تھا
زخم دل درکار تھا، زخم جگر درکار تھا

شاعری

حضرت آسی اپنے زمانے کے جلیل القدر صوفی اور عارف باللہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کہنہ مشق ادیب اور شاعر با کمال بھی تھے۔ آپ کی غزل کی حیثیت ''غزل میر'' سے کم نہیں ہے۔ بلکہ آپ کا وہ نرالا انداز تغزل ہے کہ آپ کی شاعری فلک پر ناز کرتی ہے

حضرت آسی کو صغر سنی ہی سے شاعری کی جانب طبعی شوق و ذوق تھا اور شاعری کی طرف طبیعت زیادہ مائل تھی۔ مضامین خوب ڈوب کر نکالتے تھے۔ جب آپ نے اپنا کلام بغرض اصلاح شاہ غلام اعظم افضل الہ آبادی (شاگرد ناسخ لکھنوی) کو دکھائی تو ''اسی روز شاہ صاحب مولانا عبدالحلیم صاحب فرنگی محلی سے ملنے کو آئے تو حضرت مولانا کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ

انہوں نے دو غزلوں کی اصلاح میں پچاس غزلوں کی اصلاح کا وقت لے لیا۔ اس کے بعد پھر کوئی غزل شاہ صاحب کو دکھانے کی نوبت نہ آئی‘۔ [سمات الاخیار: ۱۸۵]

یہ تھی حضرت آسی کی بلند پروازی اور اعلیٰ تخیل کہ ایک بار اصلاح کے بعد پھر کبھی اصلاح کی ضرورت ہی نہیں پڑی اور میدان غزل کے ایک ایسے زبردست شہسوار ہوئے کہ جناب ناسخ و میر کے ہم مثل ہوگئے اور نامی اساتذہ امیر، داغ، جلال وغیرہ کے طبقے میں آپ کا شمار کیا جانے لگا۔ بلکہ قواعد کی پابندی، فن کی واقفیت اور شاگردوں کی کثرت کے لحاظ سے آپ کو ناسخ وقت کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ نے مجاز کے پردے میں حقیقت کو ثابت کیا ہے۔

جناب مجنوں گورکھپوری، حضرت آسی کے کام پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

”آسی کے کلام کے مطالعہ کے بعد مان لینا پڑتا ہے کہ کامیاب ادب میں لفظ اور معنی کے درمیان کوئی دوئی نہیں رہتی۔ لفظ ہی معنی اور معنی ہی لفظ ہوتا ہے۔ شاعر کا کام نہ صرف یہ ہے کہ معنی کے لیے لفظ تلاش کرے بلکہ اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ لفظ کی معنوی کیفیت بڑھا دے۔ مسیح کا معجزہ کچھ اس سے زیادہ نہ تھا۔ الفاظ وہی تھے جو لغت میں صدیوں سے موجود تھے۔ صرف ان کی معنوی کیفیت اور معنوی شدت اتنی بڑھ گئی تھی کہ مردوں میں بھی جان پڑ جاتی تھی۔ آسی نے اپنے بہترین اشعار میں یہی کیا ہے۔ وہ فرسودہ سے فرسودہ الفاظ کو ایسے وقت اور ایسی ترکیب کے ساتھ لاتے ہیں اور اس کے اندر ایسی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ لفظ ہمارے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ [عین المعارف: ۲۲]

یہ حضرت آسی کا فضل و کمال ہے کہ لفظ اور معنی کے درمیان دوئی نہیں رہنے دیتے اور ایسی صفائی کے ساتھ اشعار پیش کرتے ہیں کہ لفظ اور معنی دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ حضرت آسی کی شاعری اور اس کی خوبی کو جناب مجنوں گورکھپوری نے یوں اجاگر کیا ہے۔

”حضرت آسی نے زبان، تشبیہات و استعارات اور دیگر رعایات وہی استعمال کیے ہیں جو روز اول سے ہمارے قدیم شعرا استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ لیکن انہوں نے ان روایات قدیمہ میں جو نئی جان ڈالی ہے، اس کی دوسری مثال مشکل سے ملے گی۔ جو تاثیر آسی اپنے کلام میں ان رسوم و تکلفات سے پیدا کی ہیں وہ انتہائی خلوص و سادگی کے باوجود بھی کسی دوسرے کو

مشکل ہی سے میسر ہو سکتی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں مطلق تامل نہیں ہے کہ آسی دبستان ناسخ کے میر ہیں۔ خود ان کو بھی اس کا احساس ہے مگر آخر اس تاثیر کا راز کیا ہے؟ آسی کی باتیں اس قدر درد سے لبریز کیوں ہوتی ہیں اور وہ ہم پر چھا کیوں جاتی ہیں"۔[عین المعارف:۱۲]

مذکورہ گفتگو سے انداز واضح ہوگیا کہ سخن کی جان، الہامی کلام، محبوب یزداں، قطب العارفین، غوث العالمین حضرت آسی کس قدر اعلیٰ منازل پر فائز تھے اور وہ عام شاعروں کی طرح صرف شعر گو شاعر ہی نہیں تھے بلکہ قدرت نے انہیں بے پناہ فضائل و کمالات سے بھی نوازا تھا۔

حضرت آسی کی صوفیانہ شاعری اور الہامی غزل پر تبصرہ کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب ہو جائے گی پھر باتیں ادھوری رہ جائیں گی۔

تصانیف

خانقاہ رشیدیہ جون پور کے مشائخ کرام و بزرگان دین کا دستور اور عادات کریمہ یہی رہی ہیں کہ ان پاکیزہ ہستیوں نے اپنی بزرگی اور ولایت کو ظاہر نہ کیا۔ بلکہ "اخفا" سے کام لیا۔ اسی وجہ سے اس خانقاہ کے سجادگان کی اکثر کتب و رسائل، مکتوبات و منظومات اور سوانح عمری زیور کتابت و طباعت سے مرصع نہ ہو سکیں۔ اس لیے حضرت آسی کی "تصانیف" بھی غیر مطبوعہ رہ گئیں اور منظر عام پر نہ آسکیں اور اپنے پیر و مرشد کی ہدایت پر عمل پیرا ہو کر "اخفا" ہی سے کام انجام دیا۔ سمات الاخیار میں ہے:

"آپ جب تک درس دیتے رہے اس وقت تک معمول تھا کہ جس کو پڑھاتے تھے اس کو لکھ کر پڑھاتے تھے۔ آخر تک پہنچتے پہنچتے خاصہ ایک رسالہ ہو جاتا تھا اور اس کا نام اسی پڑھنے والے کے نام پر رکھ دیا کرتے تھے۔ چناں چہ شاہ سراج الدین صاحب کو جب "صرف" پڑھاتے تھے تو اس رسالہ کا نام "سراج الصرف" رکھا گیا۔ اور جب قاضی محمد صدیق کے نام سے "فوائد صدیقیہ" رکھ دیا اور جب مولوی علی گوہر ساکن پھلواری شریف کو منطق پڑھتے تھے تو اس کا "فوائد جوہریہ" تجویز کیا۔ جس کی عبارت بعینہٖ "تہذیب" کی سی ہے۔ اسی طرح اکثر حواشی و شروح آپ نے لکھے۔ مگر اشاعت نہ ہونے کی وجہ سے کسی کو معلوم نہیں۔ چوں کہ آپ کو شہرت سے نفرت تھی اور گمنامی زیادہ پسند تھی۔ اسی وجہ سے نہ آپ کی "تصانیف" چھپ سکیں نہ آپ کا کلام آپ کی حیات میں شائع ہو سکا۔ یہاں تک کہ غزلوں کی نقل بجز خاص لوگوں کے عام لوگوں

کو دینا گوارا نہ تھا"۔[سمات الاخیار:۱۸۵]

سجادہ نشینی

حضرت قطب الہند نے شاہ سراج الدین اپنے اعزہ و مریدین پر سجادہ نشینی کے لیے انتخابی نظر ڈالی تو ان افراد میں آپ ہی کو فرد کامل پایا۔ مگر آپ اپنے عجز و انکسار اور احتیاط کے سبب سے اس بار گراں کے اٹھانے سے معذرت ہی کرتے رہے مگر بقول حافظ:

آسماں بار امانت نتو انست کشید قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

روز ازل میں تو جانشینی کا قرعہ آپ کے نام پڑ چکا تھا۔ دوسرا کوئی کیوں کر اس کا مستحق ہوتا۔ خدا کی مشیت کچھ اور تھی اس لیے شاہ سراج الدین کی جانشینی سات ہی برس میں ختم ہوگئی اور ضرورت نے یہ سہرا آپ کے سر باندھا۔ سجادہ نشینی کے بعد جون پور میں مستقل قیام فرمایا۔ خانقاہ کے مشاغل اور اہل طلب کی کثرت کی وجہ سے رفتہ رفتہ طبابت چھوٹ گئی۔ [سمات الاخیار، ص:۱۷۷]

کمال احتیاط

یوں تو آدمی عموماً دوسروں کی ادنیٰ چیز کو استعمال کرنے میں کچھ بھی پرواہ نہیں کرتا۔ بلکہ بلا جھجک استعمال کر لیتا ہے اور بعض تو وہ ہیں جو بلا اجازت ہی گھونٹ جاتے ہیں۔ مگر واہ رے عارف باللہ کی شان احتیاط کہ خانقاہ کا ایک پیسہ بھی استعمال کرنے کو تیار نہیں۔ جو نذور و تحائف ملتے اسی پر قناعت کر لیتے تھے۔

دست شفا

حضرت آسی کو قدرت نے ایسا "دست شفا" عطا فرمایا تھا کہ اپنے دست مبارک سے جو بھی نسخہ تحریر فرماتے تو زود اثر ہوتا اور نتیجہ بہتر دکھائی دیتا تھا، جیسا کہ "عین المعارف" میں ہے:

"بابو محمد اسماعیل علی خاں رئیس علی گنج سیوان ایک سنگین مقدمہ میں ماخوذ تھے جب مقدمہ ثبوت کو پہنچ گیا اور روداد مقدمہ سے مایوسی ہوئی تو فیصلہ کی تاریخ سے ایک دن قبل حضرت کو اطلاع دی گئی۔ حضرت عین تاریخ کے دن سیوان پہنچے اور بابو صاحب مرحوم کی پیشانی پر کچھ لکھ کر کچہری روانہ کیا اور حکم دیا کہ کچہری سے لوٹ کے میرے پاس ہو کے تب مکان جانا۔ میں انتظار میں بیٹھا ہوا ہوں۔ جب بابو صاحب بری ہو کے کچہری سے لوٹ نہیں گئے حضرت صاحب کرسی پر بیٹھے

رہے۔ایس ڈی او صاحب نے بعد کو بابو صاحب سے مل کر فرمایا کہ ''میں نے چھ سات مرتبہ آپ کی سزا کی تجویز لکھی مگر جب تجویز لکھتا تھا تو آپ کی بریت ہی قلم سے نکلتی تھی، ہر مرتبہ میں اپنی دانست میں سزا کرتا تھا مگر قلم سے آپ کی رہائی ہی نکلتی تھی۔'' [عین المعارف، ص:۱۶۴]

ایسے ہی شاہ شاہد علی سبز پوش گورکھپوری جب درد جگر کے عارضے میں مبتلا ہوئے اور سخت پریشانی سے دوچار ہوئے تو آپ نے اپنے انگشت شہادت سے درد کی جگہ کو دبایا تو سارا درد فوراً کافور ہو گیا اور ایسا محسوس ہوا کہ اس جگہ نہ کبھی ورم تھا اور نہ کبھی درد۔

ایسے ہی پاک باز ہستیوں کے لیے کیا خوب کہا گیا ہے

این سعادت بزور باز ونیست تانہ بخشد خدائے بخشندہ

میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ خانقاہ رشیدیہ جون پور، ایک نرالی شان کی خانقاہ ہے۔ جہاں کے بزرگان دین اور پیران کرام نے انتہائی ''اخفا'' سے کام لیا ہے۔اس خانقاہ کے اولیاے کرام نے اپنی کرامتوں کو ظاہر نہیں کیا ہے بلکہ لوگوں کی حاجتیں پردہ ڈال کر پوری فرما دیتے تھے۔صاحب سمات الاخیار فرماتے ہیں کہ:

''آپ کتمان اسرار اور اخفائے واردات میں پیر کے قدم بقدم تھے، کبھی کبھی آپ فرمایا بھی کرتے تھے کہ ''حضرت قیام الحق کی ہدایت ہے کہ درویشی کو ایسا چھپاؤ جیسا کہ مستورات کرسف کو''۔طبیعت میں قدرت اور ضبط کا اتنا مادہ تھا کہ مجال نہ تھی جو کسی حالت میں کوئی راز کھل جائے۔'' آپ کے ضبط واحتیاط کا یہ حال تھا تو بھلا کیوں کر ممکن ہے کہ آپ کی کوئی کرامت ظاہر ہو سکے۔لوگوں کی حاجتیں آپ پوری کر دیتے تھے مگر کوئی پردہ ڈال کے، مکاشفہ کی بھی یہی قطع تھی۔لوگ خدمت میں حاضر ہیں جس کے دل میں جو خطرہ گزرا یا جو غرض لے کے آیا، اس کا جواب دوسروں سے مخاطب ہو کر یا کسی کا قصہ کہہ کے فرما دیتے تھے۔کام جو کسی کا کرتے تھے تو فرماتے تھے کہ ''جاؤ! حضرت دیوان جی سے عرض کرو ہو جائے گا''۔کبھی فرماتے تھے کہ ''حجرہ کی خاک پاک لے جاؤ!''۔کبھی حافظ نبی بخش کو حکم دیتے تھے کہ ''فلاں تعویذ لکھ دو۔''۔کبھی ارشاد ہوتا تھا کہ ''فلاں دوا کھالو''، غرض یہ کہ اسی قسم کے پردے بہت ڈالتے تھے''۔

[سمات الاخیار، ص:۷۸]

آپ کے وصال کے بعد بھی آپ کے روحانی تصرفات معتقدین ومتوسلین پر عام ہیں اور سب کی حاجتیں اور ضروریات پوری ہوتی ہیں۔

''غازی پور میں ایک فقیر تھے۔قربان شاہ نامی وہ نہایت خوش آواز تھے۔سدا میں منقبت پڑھا کرتے تھے۔حضرت کے پاس بھی کبھی کبھی پہنچتے تھے۔جب وہ آتے تو حضرت ہمیشہ معمولاً ایک روپیہ عنایت فرماتے۔چناں چہ حضرت کے وصال کے بعد بھی قربان شاہ سدا لگاتے ہوئے مزار شریف پر حاضر ہوئے اور جب وہ حظیرہ سے باہر ہوتے تو ان کو ایک روپے مل جایا کرتا۔کچھ دنوں تک یہ معمول رہا۔ایک بار حسب دستور قدیم وہ مزار پر حاضر ہوئے اور واپسی کے بعد ایک روپیہ پایا۔اتنے میں مجاور نے آکر چاہا کہ دروازہ بند کردے۔قربان شاہ نے اس کو روکا کہ ابھی بند نہ کرو۔اس کے اندر کوئی صاحب ہیں۔مجاور نے کہا۔اندر کوئی نہیں ہے۔قربان شاہ نے کہا کہ ابھی مجھے ایک روپیہ دے کر اندر گئے ہیں۔قربان شاہ کا بیان ہے کہ اس تاریخ سے روپیہ کا ملنا بند ہوگیا''۔[سمات الاخیار،ص:۱۸۴]

یہ حضرت سرکار آسی کے فضائل وکمالات اور علوم ومعارف کا ایک اجمالی خاکہ تھا جس کو میں نے پیش کیا۔اس امید کے ساتھ کہ اگر اس کو بارگاہ سرکار آسی میں شرف قبولیت حاصل ہوگئی تو یہی ذریعہ سعادت ہے۔

☆☆☆

حضرت آسی، فضائل وکمالات کے آئینے میں

مفتی ریاض القادری امجدی ☆

اللہ تبارک وتعالیٰ نے نوع بنی آدم کے رشد وہدایت کی خاطر کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاے کرام ورسولانِ عظام کو اس خاک دان گیتی پر منصۂ شہود میں لایا اور سب سے اخیر میں اپنے محبوب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا جن کی آمد پُر بہار نے پوری دنیا کو کفر وشرک، ضلالت وگمرہی، ظلم وبربریت، قتل وغارت گیری، بغض وعناد، حسد وکینہ، جور وجفا، دغابازی وبدعہدی، دشنام تراشی وبداخلاقی کے گھنگھور گھٹا بادلوں سے نکال کر نور ایمان کی لازوال نعمت سے ہمکنار کیا اور انسان کو انسانیت ومروت، اخوت وبھائی چارگی، تواضع وانکساری اور غم خواری وصلہ رحمی کا سبق سکھایا۔ اصنام پرستی سے دور کر کے اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت وریاضت سے انسان کے قلوب واذہان کے تمام تر توجہات کی رسیوں کو جوڑ دیا۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وصال پر ملال کے بعد دعوتِ تبلیغ دین کی نشر واشاعت کی ذمے داری صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے سر آئی، جنھوں نے اس ذمے داری کو اس حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیا کہ دنیا ان کی مثال لانے سے قاصر ہے۔ ان کے بعد یہ بیڑا آئمۂ مجتہدین، تابعین، تبع تابعین نے اٹھایا اور بڑی محنت وجانفشانی کے ساتھ انجام دیا۔ لوگوں تک

☆ دار العلوم طیبہ معینیہ، درگاہ شریف، منڈواڈیہہ، بنارس، یوپی

دین کی باتیں پہنچائی اور حق و باطل کے مابین امتیاز کی سوجھ بوجھ عطا فرمائی۔

برصغیر ہندو پاک میں یہ ذمے داری سلاسل اربعہ قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ، سہروردیہ سے منسلک خانقاہوں کے مشائخ عظام و پیران کرام نے سنبھالی اور حسن اسلوب کے ساتھ انجام کار دین و اسلام دیا۔ یہ خانقاہیں ہی ہیں جو دینی، ملی، اخلاقی، روحانی، سماجی، عائلی اور معاشرتی خدمات انجام دینے میں شب و روز سرگرم ہیں۔ یہاں رشد و ہدایت اور شریعت و طریقت کی تعلیمات اور صوفیۂ عظام کے پیغامات وارشادات کو عام کیے جاتے ہیں۔ انسان کو تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب کا درس دیا جاتا ہے اور سسکتی اور دم توڑتی انسانیت کو حیات جاویدانی اور تازگی وتابندگی دستیاب ہوتی ہے۔ ان ہی مقدس و باعظمت خانقاہوں میں ہندوستان کی ایک قدیم اور باتصرف خانقاہ، خانقاہ رشیدیہ جون پور کا نام بھی تاریخ کے تابناک اوراق میں نمایاں نظر آتا ہے جو قطب الاقطاب حضرت شیخ محمد رشید مصطفیٰ عثمانی جون پوری (عرف حضرت دیوان جی) اور ان کے مرشد برحق قطب العارفین حضرت مخدوم شاہ طیب بنارسی قدس سرہما العزیز کے روحانی فیوض و برکات کا سرچشمہ ہے۔ اسی خانقاہ رشیدیہ کے مقدس و بااثر شخصیتوں میں ایک نام غواص بحر معرفت، وارث علوم مالک جنت، منبع علم و حکمت، داعی حق و صداقت، صاحب کشف و کرامت، قدوۃ الاکابر و الاماثل، شمس المشارق والمغارب، بحر الاسرار، قاسم الانوار، قطب العرفا، زبدۃ الاولیا حضرت مولانا الشیخ محمد عبدالعلیم معینی رشیدی متخلص بہ آسی سکندرپوری کا بھی ہے۔

حضرت آسی علم و ہنر، جود و سخا اور زہد و ورع کے پیکر اور مرد حق آگاہ تھے جن کی بارگاہ غریبوں، فقیروں اور ضرورت مندروں کی آماجگاہ تھی۔ جہاں ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن کو بھی سنوارا جاتا تھا۔ جہاں ہر آنے والے کی مقصد برآری کا سامان مہیا ہوتا تھا۔ جن کی سیرت رہتی دنیا تک کے لیے ایسا نمونۂ عمل ہے جس پر عمل پیرا ہو کر انسان، انسان کامل بن سکتا ہے۔ دنیا و آخرت کی سعادت مندی و فیروز بختی اور اللہ عزوجل اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رضامندی وخوشنودی حاصل کرسکتا ہے۔ حضرت آسی گوناگوں صفات کریمہ اور خصائل حمیدہ کے جامع تھے۔

ذہانت وفطانت

یوں تو اللہ تبارک وتعالیٰ ہر انسان کو عقل وخرد اور شعور و آ گہی کی صفتوں سے متصف فرماتا ہے۔ یہ عقل ہی ہے جس کی بنیاد پر انسان دوسرے حیوانات سے ممتاز و منفرد نظر آتا ہے۔ عقل وخرد جملہ اوصاف جمیلہ کا سرچشمہ ہے اور سارے دائروں کے لیے مرکزی نقطہ کی حیثیت کا حامل ہے۔ اسی سے علم وعرفان کے منابع پھوٹتے ہیں، اسی سے روشن خیالی، ذہن کی تیزی، رائے کی درستگی اور گمان کی صداقت حاصل ہوتی ہے۔ اسی کے باعث مستقبل پر نظر رکھنے، اصلاح نفس کے طریقے، شہوات سے مجاہدہ، حسن سیاست، حسن تدبیر، فضائل وکمالات کی تحصیل اور رذائل و سیأت سے اجتناب کی خوبیاں متفرع ہوتی ہیں۔ حضرت آسی عقل وخرد، شعور و آ گہی اور ذہانت وفطانت کے ایسے اعلیٰ درجے پر فائز تھے کہ جہاں عام بشر کی رسائی ناممکن ہے۔ یہ صرف ان خاصان خدا کا حصہ ہے جنہیں اللہ عز وجل تمام تر خوبیوں سے مزین ومرصع کر کے اپنا مقرب و محبوب بناتا ہے۔

حضرت آسی غازی پوری کے زمانۂ طالب علمی کا اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ آپ ذہانت وفطانت اور علم وہنر کے کس اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ:

’’جب میں ’’شرح سلم‘‘ پڑھتا تھا تو مطالعہ میں ’’ملا بحر العلوم‘‘ کا حاشیہ نہیں دیکھتا تھا، مطالعہ کے بعد جب حاشیہ دیکھتا تو اکثر یہی ہوتا تھا کہ ’’ملا بحر العلوم‘‘ سے زیادہ اعتراضات و جوابات دیتا اگر کبھی ایسا ہوتا تو جب تک ان کے جواب کو رد نہ کر لیتا کھانا نہ کھاتا‘‘۔

[عین المعارف، ص:۴۲]

حضرت آسی کی مذکورہ گفتگو کے بعد یہ کہنا کسی طرح بھی بے جا نہ ہوگا کہ حضرت اپنے وقت کے امام رازی اور اپنے عہد کے بوعلی سینا تھے۔ اگر آپ ان کا زمانہ پاتے تو وہ فرط مسرت سے آپ کی پیشانی چوم لیتے۔ اسی طرح ایک واقعہ ہے کہ:

’’جب مدرسہ حنفیہ جون پور سے حضرت کے مشفق استاذ علامہ عبدالحلیم فرنگی محلی لکھنوی چلے گئے اور ان کی جگہ مفتی محمد یوسف فرنگی محلی لکھنوی مسند تدریس پر جلوہ افروز ہوئے تو حضرت

آسی ''ہدایہ شریف'' پڑھنے کے لیے حضرت مفتی موصوف کے پاس تشریف لے گئے تو مفتی موصوف نے فرمایا کہ فقیر کا معمول شمس بازغہ کے بعد ''ہدایہ'' پڑھانے کا ہے''۔ حضرت نے جواباً ارشاد فرمایا کہ میں ''شمس بازغہ'' پڑھ چکا ہوں، مفتی صاحب نے مثل عامی شاگردوں کے پڑھانا چاہا، حضرت نے فرمایا کہ میں تین سطروں کا مطالعہ کر کے آیا ہوں۔ میں نے جو باتیں ان تین سطروں میں پیدا کی ہیں ان کو سن لیجیے۔ حضرت تین گھنٹے تک ان تین سطروں پر تقریر کی''۔

اللہ ہی جانے اس تقریر کی کیفیت کیا رہی ہوگی، کس طرح آپ نے مسائل شرعیہ کی موشگافیوں کو منکشف کیا ہوگا اور کس قدر اسرار و رموز کا دریا بہایا ہوگا اور کس حسن اسلوب سے لاینحل مسائل کو واشگاف کیا ہوگا کہ مفتی صاحب ورطۂ حیرت میں پڑ جاتے ہیں اور دم بخود ہو کر حضرت کی سیر حاصل گفتگو کو سماعت فرما رہے ہیں اور ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''صاحبزادے میں آپ کی ذہانت و فطانت کی تعریف حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب لکھنوی سے سن چکا ہوں۔ جب مجھے ایسے شاگرد کی تلاش و جستجو تھی تو ملا نہیں، اب ضعیف ہو چکا ہوں آپ کے پڑھانے کے لائق نہیں رہا اور آپ کو اس کی حاجت بھی نہیں ہے۔ خود کتاب دیکھ لیجئے اور دوسروں کو پڑھایئے۔'' [ملخص از عین المعارف]

حضرت کی قوت حافظہ بھی بلا کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی کتاب ایک مرتبہ پڑھ لیتے تو حفظ ہو جاتی اور ایک مدت دراز تک حرف بہ حرف یاد رہتی۔ آپ نے کوئی کتاب نصف صفحہ یا ایک صفحہ سے زیادہ استاذ سے نہیں پڑھی، نصف سطر یا ایک سطر کا مطالعہ فرمایا کرتے تھے۔ اسی میں رات کی رات گذر جاتی تھی۔ مطالعے کے درمیان اپنی پوری توجہ کتاب کی طرف اس طرح مبذول فرماتے کہ لوگوں کے شور و غوغا اور آمد و رفت کا آپ کو احساس تک نہ ہوتا۔

نصف سطر یا ایک سطر کے سبق میں چھ سات گھنٹے صرف ہوتے تھے، استاذ شاگرد دونوں پسینہ پسینہ ہو جاتے تھے۔ نصف صفحہ ایک صفحہ کے بعد آپ کے استاذ مولانا عبدالحلیم صاحب لکھنوی کتاب بند کر دیتے اور فرماتے کہ ''اب کتاب ختم ہوگئی دوسروں کو پڑھاؤ'' مگر حضرت خود کتاب کا مطالعہ کر کے ختم کر لیتے اور اپنی خداداد صلاحیت سے کتاب کے تمام گوشوں کو اجاگر فرماتے۔

مہارت تدریس

ہر زمانے میں میدان علم کی جولان گاہ میں علم کے شہسوار اپنے علمی جواہر دکھاتے رہے اور تشنگان علوم نبویہ کی پیاس جام شریعت سے بجھاتے رہے۔ حضرت آسی بھی میدان علم کے ایسے شہسوار تھے جنہوں نے اپنی خداداد صلاحیت سے علم کے ایسے جواہر بکھیرے کہ آپ کے معاصرین میں دور دور تک کوئی آپ کا مماثل نظر نہیں آتا تھا۔ آپ کی درسگاہ وہ تھی جہاں دلوں سے جہالت کی ظلمت وتاریکی دور کی جاتی تھی اور شب دیجور کی ظلمتوں کے ستائے ہوئے کو علم کی روشنی ملتی تھی۔ جہاں احقاق حق اور ابطال باطل کا سبق سکھایا جاتا تھا، جہاں تزکیۂ نفس، تہذیب اخلاق اور تربیت دماغ کے سوتے پھوٹتے تھے۔ جہاں اللہ عزوجل اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشادات و پیغامات کو دنیا میں عام کرنے کے لیے ماہرین کی ٹیم تیار کی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی بارگاہ کا حاضر باش آپ کے چشمۂ علم وحکمت کا جرعہ نوش جس طرف رخ کرتا تھا۔ فتح ونصرت ان کی بارگاہ کی کنیز بن جاتی تھی جس میدان میں قدم رکھتا تھا، ممتاز ومنفرد نظر آتا تھا۔

آپ کا طرز تعلیم وتدریس بھی عام اساتذہ کے طرز تعلیم سے جداگانہ تھا۔ آپ نہ یہ کہ صرف طلبہ کو اسباق پڑھا دیتے تھے بلکہ روزانہ اسباق تحریر کرا دیتے اور آخر تک پہنچتے پہنچتے ایک ضخیم رسالہ بن جاتا تھا اور اس کا نام اسی طالب علم کے نام پر رکھ دیا کرتے تھے جس کو آپ جو فن پڑھایا کرتے تھے۔ چناں چہ شاہ سراج الدین رشیدی جون پوری کو جب علم صرف کی تعلیم عطا فرمائی تو رسالہ کا نام ''سراج الصرف'' رکھ دیا، جب قاضی محمد صدیق سیوانی کو علم نحو پڑھایا تو اس رسالے کا نام ''فوائد صدیقیہ'' رکھ دیا اور جب مولوی علی گوہر پھلواروی کو علم منطق پڑھایا تو اس کا نام ''فوائد جوہریہ'' تجویز فرمایا۔ آج بھی یہ قیمتی رسائل کتب خانہ رشیدیہ جون پور میں موجود ہیں اور طباعت کی منتظر ہیں۔

تقویٰ شعار زندگی

تقویٰ کا معنی حقیقی خشیت وخوف ہے۔

تفسیر کبیر میں امام فخر الدین رازی تحریر فرماتے ہیں: ''التقوی ھی الخشیۃ''

تقوی کا مقام بڑا ارفع واعلیٰ ہے۔ تقویٰ قرب خداوندی کا ذریعہ ہے، جیسا کہ رب تعالیٰ کا خود ارشاد ہے: "ان اکرمکم عند الله اتقاکم" بلاشبہ سب سے زیادہ مکرم وباعظمت اللہ کے نزدیک تم میں وہ ہے جو سب سے زیادہ تقوی والا ہے۔

ایک دوسری جگہ فرمایا: "ان الله مع المتقین" (بلاشبہ اللہ تقوی والوں کے ساتھ ہے)

حدیث میں فرمایا گیا ہے:

"من احب ان یکون اکرم الناس فلیتق الله"

جو شخص بارگاہ خداوندی میں سب سے زیادہ مکرم ہونا چاہے تو چاہیے کہ وہ تقوی اختیار کرے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے منقول ہے:

"التقوی ترک الاصرار علی المعصیة وترک الاغترار بالطاعة"

تقوی گناہ پر اصرار نہ کرنے اور طاعت وبندگی سے دھوکہ نہ کھانے کا نام ہے۔

عارف باللہ شیخ کامل حضرت ابراہیم ابن ادہم فرماتے ہیں:

"التقوی ان لایجدالخلق فی لسانک عیبا ولا للملئکة فی افعالک عیبا و ملک العرش فی سرک عیباً"

تقوی اس بات کا نام ہے کہ مخلوق خدا تمہاری زبان میں کوئی عیب نہ پائے (یعنی تو اپنی زبان کو جھوٹ، گالی گلوج، غیبت وچغلی سے محفوظ رکھے) فرشتے تمہارے افعال وکردار میں عیب نہ پائیں اور مالک عرش تمہارے باطن میں عیب نہ پائے۔

حاشیہ جلالین میں ہے:

"التقوی علی ثلثة اقسام تقوی العوام وهی اتقاء الکفر بالایمان و ثانیها تقوی الخواص و هی امتثال الاوامر و اجتناب النواهی و ثالثها تقوی اخص الخواص وهی اتقاء مایشغل عن الله"

تقوی تین طرح کا ہے ایک عوام کا تقوی، وہ یہ ہے کہ بواسطۂ ایمان کفر سے بچا جائے، دوسرا خواص کا تقوی اور وہ اوامر خداوندی کی بجا آوری کرنا اور منہیات سے پہلوتہی اختیار کرنا۔ تیسرا اخص الخواص کا تقوی اور وہ یہ ہے کہ بندہ ہر اس کام سے اجتناب کرے جو اللہ کی بارگاہ

سے غافل کر دے۔

حضرت آسی تمام مراتب تقوی کے جامع اور مقرب الی اللہ تھے۔ جس نے بھی حضرت کی کتاب زندگی کا مطالعہ کیا ہے وہ بخوبی جانتا ہے کہ حضرت نے اپنی پوری زندگی دنیا اور دنیاوی شان و شوکت، جاہ و حشم، دولت و ثروت، عیش و عشرت اور خود نمائی و خود ستائی سے اپنے آپ کو بھی الگ تھلگ رکھا اور اپنے تکلم کی گہر افشانی سے اپنے ماننے والوں کو بھی ان امور سے دور و نفور رہنے کی تاکید فرمائی اور فرمایا کہ ظاہری دنیا اور اس کی رعنایاں سب دھوکے ہیں۔ دنیا محبت کے لائق نہیں، محبت کرنی ہے تو اس ذات وحدہ لاشریک لہ سے کرو جس کی محبت دنیا و آخرت کی سعادت مندی و فیروز بختی اور کامیابی و کامرانی کا ضامن ہے۔ حضرت آسی ایک شعر میں فرماتے ہیں:

فریب عالم صورت سے بچنا
نہیں کوئی جز خدا دوست

یہی وجہ ہے کہ روز افزوں دنیا سے آپ کی بے رغبتی بڑھتی چلی گئی اور کیوں نہ ہو کہ آقائے کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اعقل الناس اترکھم للدنیا"

لوگوں میں سب سے زیادہ عقلمند وہی ہے جو سب سے زیادہ دنیا کو ترک کرنے والا ہے۔

اور نیز فرمایا ہے:

"ماتزین الابرار بمثل الزھد فی الدنیا"

نیک لوگ دنیا سے بے رغبتی کے علاوہ اور چیز سے خوبصورت نہیں لگتے۔

چناں چہ حضرت آسی جب سجادگی کے اہم منصب پر فائز ہوئے اور آپ کے سر پر خانقاہ کی ذمے داریاں آ گئیں، اہل طلب حضرات کی کثرت کی بنیاد پر طبابت چھٹ گئی، گذر اوقات کے لیے کوئی مستقل ذریعہ نہ رہا، تب بھی آپ نے خانقاہ کی کوئی رقم اپنے ذاتی مصرف میں صرف نہیں فرماتے تھے۔ اپنے ذاتی اخراجات میں نذر و فتوح سے ہی کام لیتے تھے۔ خانقاہ سے صرف روٹی کھاتے تھے باوجود یہ کہ آپ کے ذاتی مصارف کے لیے وقف نامہ میں ایک سو روپے سالانہ درج تھا؛ لیکن اس میں سے ایک روپیہ بھی نہ لیتے تھے۔ آپ کے توکل و استغنا کا عالم یہ

تھا کہ ایک مرتبہ آپ کا پاپوش مبارک ٹوٹ گیا تھا اور نذر کی مد سے آپ کے پاس ایک پیسہ بھی موجود نہ تھا کہ جوتا خریدا جائے اور آپ جوتا ہمیشہ سلیم شاہی کامدار یا سادہ پہنا کرتے تھے، آپ نے چمار (موچی) کو بلوا کر اس سے جوتا بنوایا اور وقف کی مد سے لے کر بارہ آنہ پر خرید کر کے استعمال فرمایا۔ اسی زمانہ میں حضرت سید السادات منبع البرکات سید شاہد علی سبز پوش قدس سرہ جو حضرت کے اجلۂ خلفا میں سے تھے، کا گذر آستانہ پر ہوا، بر سبیل تذکرہ بیان فرمایا کہ اس دیسی جوتا بنوانے سے میرا مقصد یہ ہے کہ پاؤں بھی محفوظ رہے اور خانقاہ کی رقم زیادہ صرف بھی نہ ہو غرض تو حاصل ہو ہی گئی۔ اب اگر خدا اس سے اچھا دے گا تو اسے پہنوں گا یہ کسی کو دے دوں گا چناں چہ چار پانچ روز ہی کے بعد میاں محبوب ساکن سیوان خانقاہ میں آئے اور ایک کامدار جوتا بطور نذرانہ پیش کیا۔ فرمایا دیکھا خدا نے بھجوا دیا۔ یہ حال تھا آپ کے توکل و استغنا اور کمال احتیاط کا اس میں ایک ذرہ بھر بھی شک وشبہ نہیں کہ تولیت کا حق جیسا کہ چاہیے اس سے کہیں بڑھ کر آپ نے ادا کیا۔ [ملخص از سمات الاخیار]

ہمدردی و خدمت خلق

اس فرش گیتی پر جسے دیکھیے وہی مفاد پرستی و خود غرضی کا جال بچھا کر ایک دوسرے کو پھانسنے میں تگ و دو کرتا نظر آ رہا ہے، آج ہر ایک کا جینا مرنا اپنے لیے ہوتا ہے مگر کچھ ایسے بھی بندگان خدا ہیں جن کا اٹھنا بیٹھنا جینا مرنا سب کچھ خلق خدا کے لیے ہوتا ہے جن کے فیض پاشیوں میں ہر عام و خاص کو نہانے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو قول رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم "خیر الناس من ینفع الناس" کی عملی تفسیر بن کر ظاہری و باطنی ہر اعتبار سے خلق خدا کو نفع پہنچانے کی پیہم کوشش کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے حضرت سرکار آسی کے لیل و نہار کا مشاہدہ کیا ہے یا جن کو ان کے ساتھ رہنے کا شرف حاصل ہوا ہے، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ حضرت نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ خلق خدا کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا تھا، آپ دینی اعتبار سے لوگوں کو نفع تو پہنچاتے ہی تھے دنیاوی اعتبار سے بھی رہنمائی و مدد فرماتے۔ آپ کی مجلس میں جب کوئی عقیدت کیش حاضر ہوتا تو براہ شفقت آپ اس کی بھی حالت دریافت فرماتے اور تمام اہل خانہ کے حالات نام بنام پوچھتے کوئی کیسا ہی مصیبت زدہ اور درد و الم کا مارا یا مغموم ہوتا، آپ کی صورت مبارکہ دیکھتے ہی کل رنج و غم اور درد و الم کا

فور ہو جاتا کوئی اپنی غرض لے کر حاضر خدمت ہوتا تو حضرت کبھی کوئی دعا یا اسم باری تعالیٰ یا کسی بزرگ کے مزار پر حاضری کو فرماتے یا کوئی تعویذ وغیرہ دلوا دیتے۔

کشف و کرامت

حضرت سرکار آسی کے کشف کے واقعات بہت ہیں۔ بغرض استشہاد ایک واقعہ نظر قارئین کر رہا ہوں۔

ایک بار حضرت راس العلما قدوۃ الکملا مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب رامپوری کے یہاں محفل میلاد شریف منعقد تھی حضرت بغرض شرکت وہاں تشریف لے گئے اور میں بھی ساتھ ساتھ تھا، حضرت مولانا سے موصوف مل کر اہتمام محفل میں جب مصروف ہوئے تو یہاں بالکلیہ تخلیہ ہو گیا۔ اس وقت میرے دل میں تین سوالات پیدا ہو سکا۔ آپ نے ان کے جواب سے اسی وقت مشرف فرمایا۔ [سمات الاخیار، ص: ۱۸۱]

بعض دفعہ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ کسی نے اپنی حاجت پیش کی اور حضرت انتہائی عدم توجہی ظاہر کی اور ادھر اس کا کام ہو گیا۔ حضرت پر دلوں کے خطرات مکشوف ہو جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جس کے دل میں بھی کوئی خطرہ پیدا ہوتا حضرت دوسروں سے گفتگو کے درمیان اس کا جواب عنایت فرما دیتے جسے صاحب خطرہ کے سوا کوئی دوسرا سمجھ نہ پاتا۔ آپ کی مجلس کا کوئی بھی ایسا حاضر باش نہ تھا جس کے ساتھ سینکڑوں کرامتوں کا ظہور نہ ہوا ہو؛ لیکن اخفا کا عالم یہ تھا کہ جس کے ساتھ جو واقعہ پیش آتا دوسرے کو اس کی خبر بھی نہ ہوتی تھی۔

چناں چہ حضرت کے ایک جلیل القدر خلیفہ حضرت سید السادات سید شاہ علی سبز پوش قدس سرہ فرماتے ہیں کہ ”مجھے کئی بار فرمایا تھا کہ میرے پیر نے مجھ کو وصیت کی تھی کی درویش کو اس طرح چھپانا چاہیے جیسے عورت کرسف کو چھپاتی ہے۔ حضرت کی کرامت کا اگر کوئی اظہار کرتا تھا تو اس کو نقصان ہوتا تھا“ [عین المعارف، ص: ۵۹]

حضرت آسی کی شفقت و محبت ہر ایک کے ساتھ غایت درجہ کی تھی۔ آپ کی بارگاہ میں جو پہنچتا تھا آپ کا ہو کے رہ جاتا تھا۔ کسی کو کبھی بھی آپ کی بارگاہ سے نامرادی ہاتھ نہیں آئی ہے۔ ہر ایک کے دامن مراد کو آپ نے خداداد اختیارات و تصرفات سے بھر دیا ہے جب جیسی ضرورت

محسوس ہوئی آپ نے لوگوں کی مدد فرمائی ہے۔

حضرت کی شفقت و محبت کا یہ حال تھا ایک بار آپ کا ایک عزیز شاہ حسین احمد صاحب مرض ہیضہ میں مبتلا ہوا۔ حالت ایسی سنگین ہوئی کہ غازی پور کے تمام حکیم اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا، گھر میں رونا دھ۔نا شروع ہو گیا ٹھیک اسی وقت حضرت آسی جون پور شریف سے تشریف لائے اور گھر کا نقشہ ملاحظہ فرما کر ساری باتیں سمجھ گئے اور مریض کے پاس جا کر نبض دیکھنے لگے۔ حضرت کو اچانک دیکھ کر کچھ دیر کے لیے آہ وزاری بند ہوگئی، اور سب کی نظروں میں امید کی کرنیں مسکرانے لگیں جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا ہو۔ حضرت آسی نے فوراً کہیں سے دو بھٹے لانے کا حکم صادر فرمایا۔ اس وقت ہرے بھٹے کہاں ملتے یہ بھی ایک پریشان کن بات تھی؛ لیکن تلاش کے بعد کہیں سے مل گئے، انہیں حضرت کے حکم کے مطابق بھنوا کران کے سامنے پیش کیےگئے۔ لیمو کٹوا کر اس پر گھسوایا اور اپنے ہاتھ سے دو دو دانے نکال کر مریض کو کھلانے لگے۔ بیہوشی کے عالم میں بھی مریض کا منھ کھلنے لگا اور دونوں بھوٹے کھا گیا۔ آخر میں دیکھا گیا کہ مریض کی بند آنکھیں کھلنے لگیں اور دھیرے دھیرے وہ صحت یاب ہو گیا۔ یہ تھی حضرت کی شفقت و محبت کہ سرہانے بیٹھ کر اپنے ہاتھ سے مریض کے منہ میں بھٹوں کے دانے دے رہے ہیں اور مریض کی صحت یابی کی دوا کر رہے ہیں۔

☆☆☆

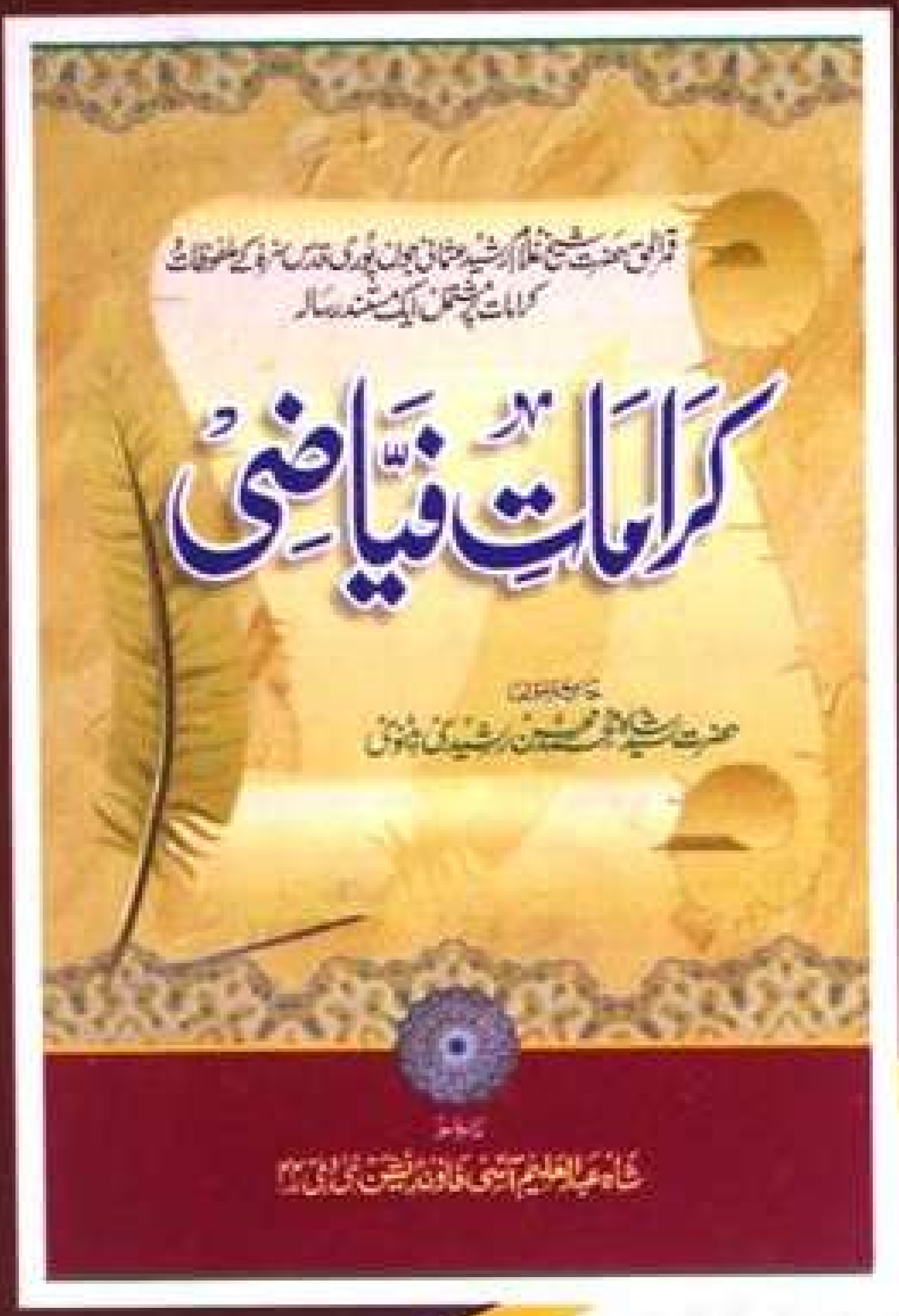

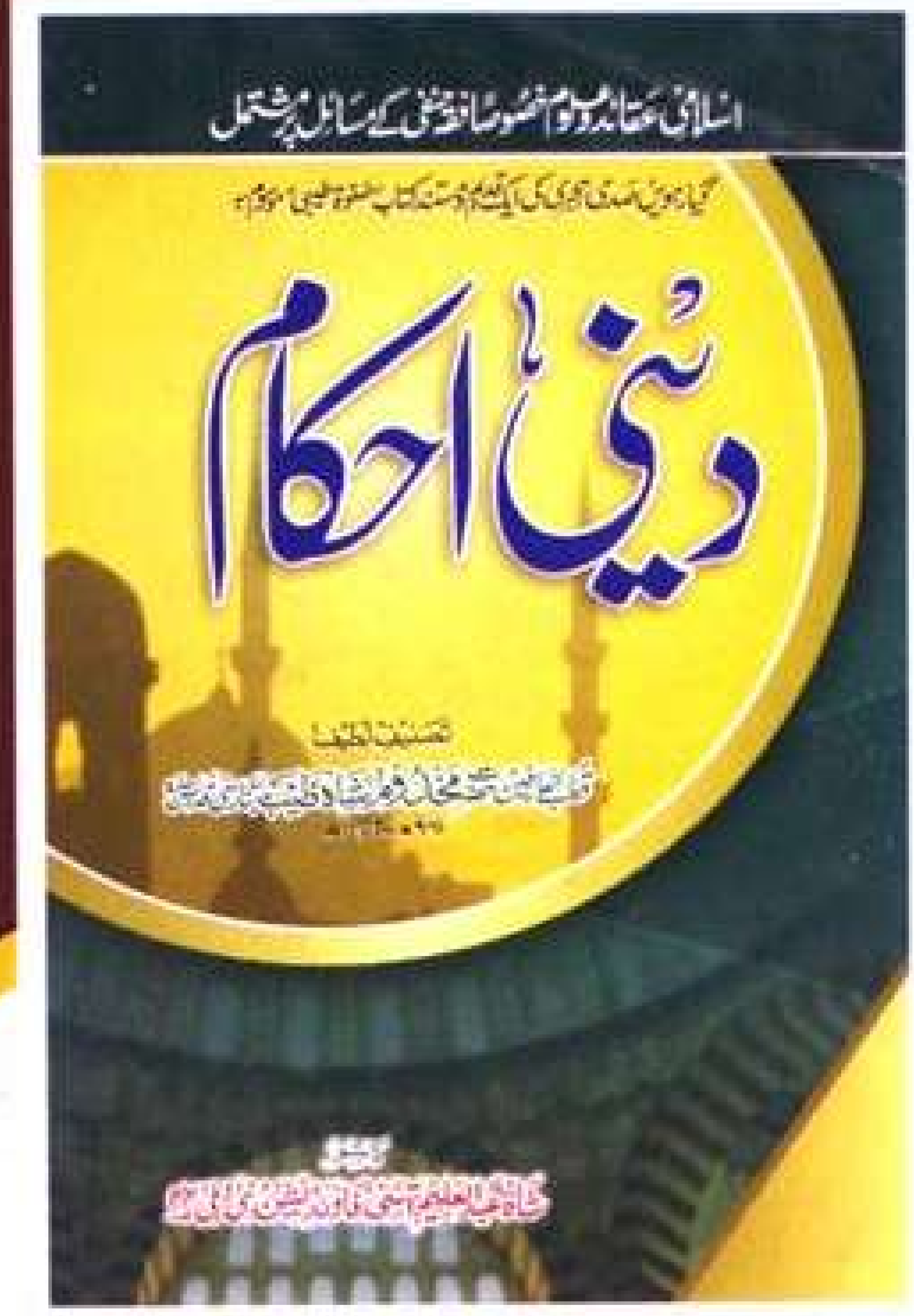

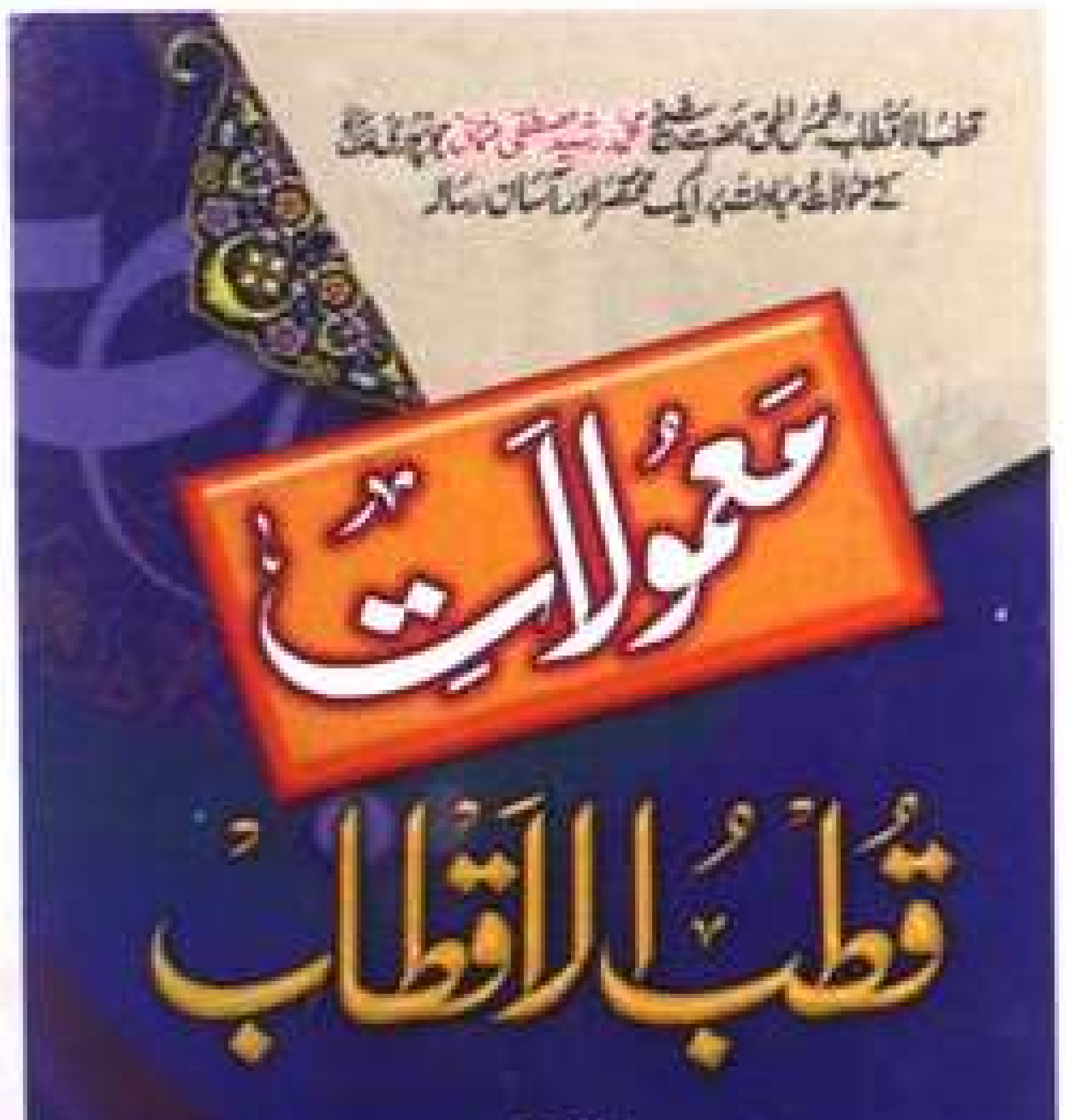

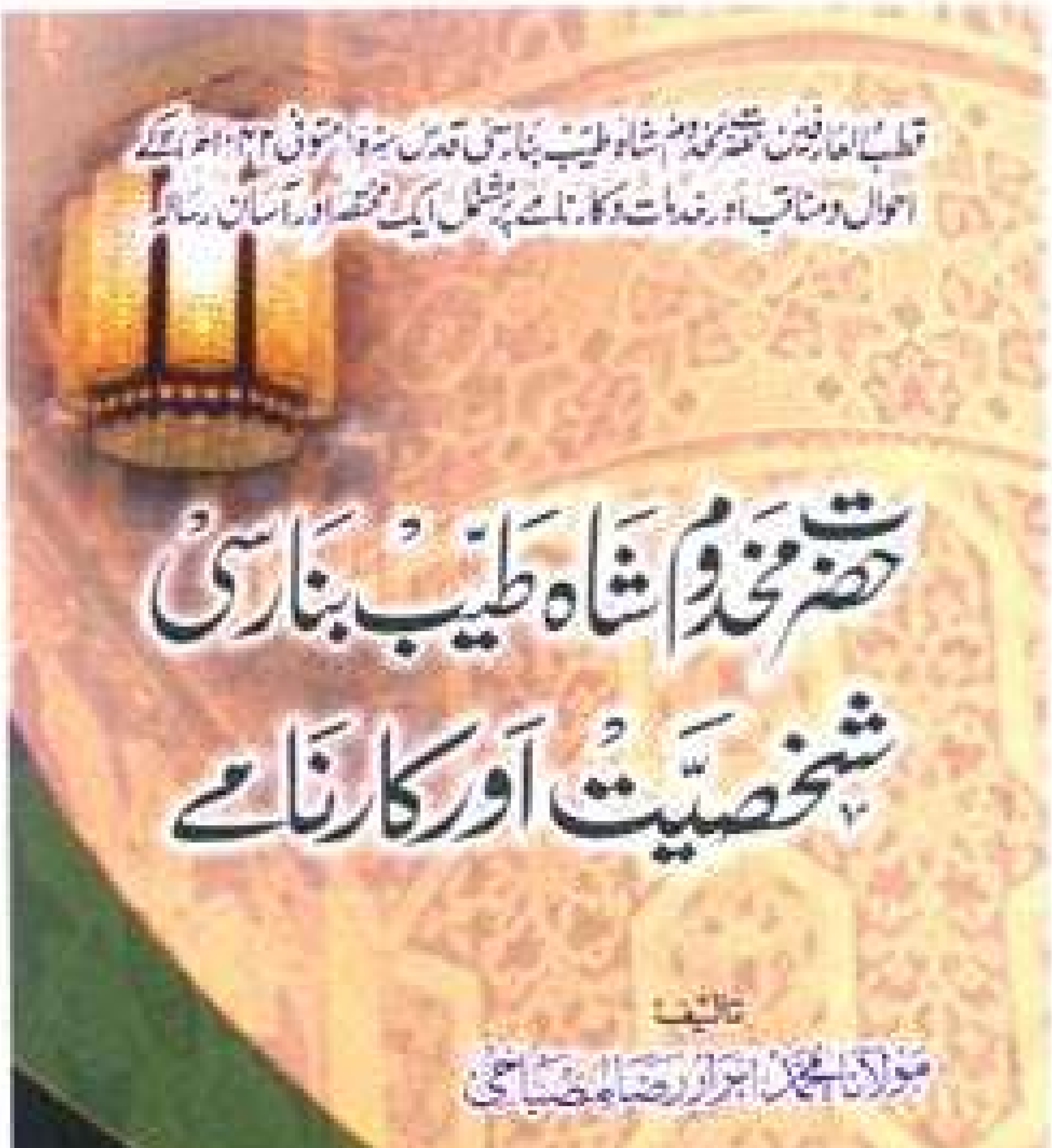

Rs. 150/-

SHAH ABDUL ALEEM A'ASI FOUNDATION

U-13, Pul Pehladpur, Near Badi Masjid, (M.B. Road)
New Delhi-110044, Ph.: 011-26363978
E-mail: aasifoundation@gmail.com, www.aasifoundation.com